پبلیکیشنز ڈویژن

آئینۂ غالب

پبلیکیشنز ڈویژن

ستمبر ۱۹۶۴

پوس سمبت ۱۸۸۶

"Ayina-i-Ghalib"—(Urdu)

پبلشر :—ڈائریکٹر پبلیکیشنز ڈویژن۔اولڈ سکریٹریٹ، دہلی-۶

پرنٹر :—گورنمنٹ آف انڈیا پریس، فریدآباد

غلط نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۶	۲۲	حسن علی خاں	حسین علی خاں
۸	۱۹	کر کرکے	کرکے
۱۱	۱	چند و بیگم	جندو بیگم
۱۸	۲۲	وحیدرو	عہدو
۱۸	۲۲	دردراں.	دوراں
۱۹	۲۵	ضیاالدین احمد	ذوالنور علی احمد
۲۱	۱۴	دیم	ویم
۲۳	۱۶	پڑھے	پڑے
۲۴	۱۷	بادیہ	بادیہ
۳۲	۱۱	بگذرم	گزرم
۳۲	۳	کہ	×
۳۳	۲۰	تعین	تعیین
۵۳	۲۰	ہراز	ازہر
۵۳	۲۵	اپنے	اپنی
۵۴	۷-۸	بلند تقاضا	بلند کا تقاضا
۵۸	۶	نامہ	نامہ
۵۸	۱۴	لے گئی	لے گئیں
۵۹	۷	اشرف آزردہ	اشرف و آزردہ
۶۰	۸	قیصر کیخسرو	قیصر و کیخسرو
۶۰	۹	موکیش	موکبش
۶۰	۱۱	ترشکم	رشکم
۶۴	۱۹	جداگناہ	جداگانہ
۷۰	۱۳	جان جمال	جہانِ جمال
۷۱	۱۵	ایک	اک
۷۲	۸	مرہوں	مرہون
۸۱	۵	مابعد الطبیعت	مابعد الطبیعات
۸۴	۲۴	شاعری	شاعری
۹۳	۵	ذی العقول	ذوی العقول
۹۳	۷	مخنف	مخفف
۹۵	۴	ذی الجہ	ذی الحجہ
۹۵	۱۳	کرز د	کرزو
۹۷	۱۷	بہ سال	بہ سان
۱۰۷	۱۲	مزیں	مزین
۱۰۸	۲۴	مخاطب	تخاطب
۱۰۹	۳	نشات	منشیات
۱۱۱	۹	رحش	رخش
۱۱۱	۹	دودماں	دودمان
۱۱۱	۱۱	پیرواں	پیروان
۱۱۱	۱۳	جادواں	جادوان
۱۱۱	۱۵	رباں	زبان
۱۱۱	۱۷	دے رہے	دے رہے ہیں
۱۱۶	۱۱	اس کو طرح	اس طرح
۱۱۶	۲۳	جیفہ	جیغہ
۱۱۸	۲۱	واقعہ	واقعات
۱۲۰	۲۰	فرہنگ	فرنگ
۱۲۱	۱	دوکاکین	دکاکین
۱۲۵	۱۳	بربسر	بسر
۱۲۵	۱۴	جمرہ	حجرہ
۱۲۵	۱۹	سیفقور	سیفور
۱۲۵	۲۲	علی	حلی
۱۲۵	۲۳	وگر	دگر
۱۲۸	۲	تفضل خاں	تفضل حسین خاں
۱۲۸	۲۵	گز،اشتہ	گزشتہ
۱۲۹	۱۸	کی	کے
۱۳۱	۲	رفتت	رفتست
۱۳۱	۷	کے	کی
۱۳۷	۱۰	در	اور
۱۴۷	۱۷	کے	کا
۱۴۸	۲۳	وہ نوجوان	نوجوانوں
۱۴۹	۱	ندیم	ندیمم
۱۵۷	۲	چاہئے	چاہیے
۱۵۸	۲	میرے	مرے
۱۵۹	۹	میری	میرے
۱۶۰	۱۰	اسے	اس سے
۱۶۲	۱۰	سیداللہ خاں	سعداللہ خاں
۱۶۲	۲۲	تارک	وارث
۱۶۲	۲۴	فوخ آباد	فرخ آباد
۱۶۲	۲۵	کی	کے
۱۶۳	۲۰	کوٹ	کورٹ
۱۶۴	۲۳	۱۸۳۱	۱۸۴۱
۱۶۵	۳	ماثر	مآثر
۱۶۶	۸	بہلی	یہی
۱۷۳	۱۲	تھی	×
۱۷۶	۲۳	اس	ان
۱۷۸	۱۴	گرچہ	اگرچہ
۱۷۹	۱۵	ان کی	یہ ان کے
۱۸۴	۲۱	ناتمانی	ناتمامی
۱۸۴	۲۳	یتری	تری

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۸	۶	باغباں	باغبان
۱۸	۸	وفردوش	وہ فردوس
۱۸	۸	کاش کہ	کاش کے
۱۹	۱۱	دستبنو	وسایتر
۱۹	۹	تخلیق	تحقیق
۱۹۱	۱۰	1958	1858
۱۹۱	۱۶	لکھتے	لکھے
۱۹	۳	لذت	لغت
۱۹	۱۵۔۲۴	(۶۱)	(۵)
۲۰	۲۰	ہے	×
۲۰۱	۱۳	مانداں	مانندآں
۲۰۱	۷۔۸	داد	و او
۲۰۱	۱۸	راہک	رویک
۲۰۱	۷	میاینز	میانین
۲۰۱	۱۴	بیلاق	ییلاق
۲۰۰	۶	چھچۂ	پچھۂ
۲۰۰	۹	آنجہ	آنچہ
۲۰۰	۱۲	بیائی	بیائی
۲۰۰	۱۸	فشر	فشردن۔ مصدر کے
۲۰	۲۴	افارستیہ العربۃ	الفارسیہ العربیہ
۲۱۱	۳	تفریق	×
۲۱۰	۱۶	کیے	کیا
۲۱	۱۸	اور	اوراق
۲۲۱	۷	شکوۂ کفر	شکوہ کفرو
۲۲۲	۱۵	تیری	تری
۲۲۲	۹	آمادہ	آیادہ
۲۳	۱۸	گماں	گمان
۲۳	۱۹	جادواں	جادوان
۲۳	۲۰	زباں	زبان
۲۳	۲۱	آں	آن
۲۳۲	۱۶	ہمیں	ہموں
۲۳۵	۲۲	جوب	جواب
۲۳۰	۱۶	فرد	فرو
۲۳۰	۷	برو	برد
۲۴۲	۱۳	قضاً	قصداً
۲۴۷	۱۶	مزموم	مذموم
۲۵۱	۲	پہلے	پہلی
۲۵۱	۳	دوسرے	دوسری
۲۵۲	۸۔۱۱	اعیاں	اعیان
۲۵۴	۲۵	آفتاب	آفتاب پر
۲۵۸	۱۸	نسخۂ	نسخہ
۲۶۰	۶	مگرہیٔ	گمرہیٔ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۶۰	۱۵	مست	مست
۲۶۰	۱۸	تعلیم	اقلیم
۲۶۱	۹	جزبات	جذبات
۲۶۱	۱۲	اپنے	اپنی
۲۶۲	۴	او	وہ
۲۶۲	۴	ے	ہی
۲۶۲	۲۲	کرم	گرم
۲۶۲	۲۴	نزروست	تدروست
۲۶۴	۱۷	موسا	موسی
۲۶۴	۲۱	کنند	کند
۲۶۵	۲۱	ایم	ام
۲۶۵	۲۳	درویشی	درویشے
۲۶۶	۱۵	نابش	تابش
۲۶۷	۹	خیر	خیز
۲۶۸	۲۴	نبانے	زبانے
۲۶۹	۹	جنبے	زنبے
۲۷۰	۱۱	عین	عیش
۲۷۰	۱۵	ہمگناں	ہمگناں
۲۷۰	۲۳	فقط	سقط
۲۷۰	۲۷	فی	می
۲۷۲	۳	باتش	گویا آتش
۲۷۲	۳	مدار آتش	دریا آتش
۲۷۲	۱۳	ان کی	اپنی
۲۷۲	۲۱	بیدردے	بیدردی
۲۷۳	۴	مینا	مستاں
۲۷۳	۸	کم	کہ
۲۷۳	۹	برزلہ	بذلہ
۲۷۳	۹	ہتی	ہنی
۲۷۳	۱۳	فزو	مزد
۲۷۴	۸	ہیئت	ہیئت
۲۷۴	۱۴	زرطلب تا بنیذ	زرطب تا نبیذ
۲۷۵	۵	بے	بے
۲۷۵	۱۳	رہ	زہ
۲۷۶	۹	تو	نو
۲۷۶	۱۰	بست	لبت
۲۷۶	۱۱	تو	تہ
۲۷۶	۱۲	داری	دادی
۲۷۶	۱۲	پسدم	پسندم
۲۷۶	۱۳	اندر راہ	اندر نیمہ راہ
۲۷۶	۱۴	دردم	در دم
۲۷۶	۱۶	پنہاں	پنہان
۲۷۷	۷	خواجہ	خواجو

عرض مرتب

غالب کو یہ شکایت تھی کہ اسکی زندگی میں اسکی قدر اس کے جوہر کے مطابق نہیں ہوئی ۔ لیکن غالب کو یہ احساس تھا کہ اسکی موت کے بعد دنیائے ادب اسکی عظمت کو پہچانے گی ۔ غالباً اس خیال کے زیر اثر اس نے کہا تھا ع

شہرت شعرم بگیتی بعد من خواھد شدن

یہ ایک واقعہ ہے کہ غالب پر جتنا کچھ لکھا گیا ہے شاید ہی کسی اور اردو شاعر پر لکھا گیا ہو ۔ غالب کے افکار اور اسکے شعور کا تجزیہ بڑی تفصیل سے ہوتا رہا ہے ۔

آجکل اردو کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ اسکے شماروں میں غالبیات پر بہت اچھے مضامین شائع ہوئے ہیں ۔ 'آئینئہ غالب' انہیں مضامین کا ایک انتخاب ہے ۔ مضمون نگاروں میں آپ کو قریب قریب وہ سب نام ملیں گے جنہیں غالبیات کے موضوع سے خاص دلچسپی ہے ۔

مرتب

فہرست مضامین

صفحہ نمبر

حمید احمد خاں

غالب کی خانگی زندگی کی ایک جھلک

چاندنی چوک سے مڑ کر بلی ماروں کے اندر کچھ دور تک چلے جائیے تو شمسی دواخانے کی عمارت اور حکیم محمد شریف خاں کی مسجد کے درمیان ایک کشادہ گلی نظر آتی ہے۔ کچھ نئی ، کچھ پرانی عمارتیں ، کچھ سنورتے ، کچھ بگڑتے ہوئے مکان ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں ۔ گلی مین ذرا فاصلے پر داہنے ہاتھ کو کوڑے کا ایک ڈھیر ایک خاک انداز کے پاس پڑا ہے۔ اور ہمیشہ پڑا رہتا ہے۔ گلی کے دونوں طرف کی عمارتیں زیادہ تر چھوٹی اینٹ کی پرانی عمارتیں ہین ۔ لیکن جس خاص بات کو آپ ایک سرسری نظر مین محسوس کئے بغیر نہیں رہتے وہ ان نیم منہدم عمارتوں مین اونچی محرابوں کی کثرت ہے۔ ان بلند محرابوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس گلی کے گزشتہ مکینوں کی زندگی عظمت و شان سے خالی نہ تھی ۔ یہ گلی قاسم جان کی گلی کہلاتی ہے ۔ اوراٹھارویں صدی کے دوسرے نصف سے لے کر آج کے دن تک اسی نام سے مشہور ہے۔ گلی کے نام کے پیچھے ایک کہانی ہے۔ جو شاہ عالم بادشاہ کے عہد سے شروع ہوتی ہے۔ اس زمانے کے قریب تین شریف زادے جو آپس مین بھائی بھائی تھے قسمت آزمائی کے لئے بخارا سے روانہ ہوئے اور منزل بہ منزل اٹک اور پنجاب سے ہوتے ہوئے مٹی ہوئی مغلیہ سلطنت کی راجدھانی مین پہنچے ۔ شہر مین پہنچ کر بالاخر وہ اس گلی مین آباد ہوئے جس گلی کے نکڑ پر میں آپ کھڑے ہوئے اس وقت باتیں کررہے ہین ۔ شہرت اور دولت ان تین بھائیوں میں سے کم از کم دو کے حصے مین ضرور آئی ۔ پہلے قاسم جان کے اقبال کا ستارا چمکا ۔ خود گلی کا نام اس کا شاہد ہے کہ جاہ وثروت کے لحاظ سے قاسم جان اپنے بھائیون کے سرتاج تھے ۔ لیکن انیسویں صدی کے شروع مین تقدیر ایک بار پھر مسکرائی اور اس مرتبہ عارف جان کا

بیٹا لوھارو اور فیروز پور جھرکہ کی ریاست پر متمکن نظر آیا ۔ قاسم جان کی اولاد اب بھی اس گلی کی حویلیوں اور محل سراؤں مین موجود ھے ۔ لیکن ھمارے یہاں کھڑے ھونے اور اس رہگذر پر عقیدت کا فرش بچھانے کی وجہ یہ نہین کہ پرانے شرفا کی اولاد یہاں آباد ھے یا بجائے خود اس گلی کی پرانی داستان سے ھمین غیر معمولی دلچسپی ھے ۔ ایک اور کشش ھے جو لوگون کو دور دور سے کھینچ کر یہاں لاتی رھے گی ۔ اس کشش کو چار حرفوں کا لفظ بیان کر دیتا ھے اور وہ لفظ ھے : ''غالب'' ۔

گلی قاسم جان کے چپے چپے کے ساتھ غالب کی زندگی کو کسی نہ کسی پہلو سے کسی نہ کسی منزل مین تعلق رھا ھے ۔ غالب کا اصل وطن آگرہ تھا ۔ لیکن ابتدائے شباب ھی میں آگرہ کو چھوڑ کر ھمیشہ کے لئے دلی مین آ رھے ۔ اس تبدیلئی وطن کے بعد وہ پچاس پچپن برس تک دلی میں رھے ۔ لیکن ذاتی مکان کبھی نصیب نہ ھوا ۔ ھمیشہ کرائے کے مکانوں مین اور کبھی کسی مفت ملے ھوئے مکان مین رھے ۔ اس تمام مدت کا بیشتر حصہ انھوں نے گلی قاسم جان کے ھی کسی نہ کسی مکان مین گزارا ۔ اور کبھی تھوڑے عرصے کےلئے باھر نکلنا بھی پڑا تو اسی محور کے گرد چکر کھاتے رھے ۔ لیکن غالب کی ذات سے قطع نظر اس تعلق کا سلسلہ خود غالب کے خاندان تک پہنچتا ھے ۔ اس گلی مین شاید غالب کی پیدائش سے بھی پہلے غالب کے چچا کا عقد عارف جان کی بیٹی سے ھوا تھا ۔ دس پندرہ برس بعد جب غالب خود بالک دولھا بنے ھوئے عارف جان کی پوتی امراؤ بیگم کو بیاھنے آئے تو اپنی برات بہین قاسم جان کی گلی مین لائے تھے اور پھر تقریباً ساٹھ سال بعد جب بوڑھے شاعر کا جنازہ اٹھا تو اسی گلی کی ایک ڈیوڑھی سے دوست اور شاگرد اور عزیز میت کو کندھا دیتے ھوئے جامع مسجد اور دلی دروازے کی راہ سے درگاہ حضرت نظام الدین کو روانہ ھوئے ۔ اس دن گلی کے ایک مکان مین ستر برس کی ایک بڑھیا ماتم مین جھکے ھوئے سر پر ایک سفید دوپٹہ اوڑھے اپنی اس بیوگی کے غم مین آنسو بہا رھی تھی جس کی میعاد کو سال بھر بعد مرحوم شوھر کی پہلی برسی کے دن موت کے ھاتھوں ختم ھونا تھا ۔

سامنے کے سرے پر جہان گلی ختم ہونے سے پہلے بائین ہاتھ کو گھومتی ہے ایک بڑی محراب نظر آ رہی ہے۔ اگر اس محراب سے گزر کر اندر چلے جائین تو چند پرانی عمارتین ملتی ہین جن مین سے ایک عارف جان کے بیٹے نواب احمد بخش خان والئی لوھارو کی حویلی ہے - روایت کہتی ہے کہ یہی حویلی غالب کے خسر مرزا الٰہی بخش خان معروف کا بھی مسکن تھی - اگر اس روایت کو درست مان لیا جائے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ غالب اٹھارہ بیس برس کی عمر مین جب ہمیشہ کے لئے دلی چلے آئے تو پہلے پہل چند سال تک اسی مکان مین رہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ غالب کی زندگی کے آخری چند سال ایک ایسے مکان مین بسر ہوئے جو گلی کے اس دوسرے سرے پر ہے جدھر ہم مسجد اور دوا خانے کے درمیان کھڑے ہین - دلی مین ان کے پہلے مکان اور آخری مکان کی یہ باھمی نسبت معنی خیز ہے گلی کے پرلے سرے سے چل کر اس سرے تک آیئے تو گویا آپ نے غالب کے شباب سے لے کر وفات تک کی تمام منزلیں طے کر لیں - دلی مین ان کی زندگی لوھارو والون کی عظیم الشان حویلی سے شروع ہوئی اور اس کھنڈر مین ختم ہوئی جس کی زیارت کے لئے ہم آپ اس گلی کے سرے پر کھڑے ہین -

گلی مین چند قدم چلئے تو مسجد کے پیچھے (اور اس سے ملی ہوئی) ایک دواخانے کی نئی عمارت کو چھوڑ کر ہمین ایک ڈیوڑھی نظر آتی ہے - اندر جا کر دیکھئے تو مختصر سا صحن گرتی ہوئی عمارت کے ملبے سے بھر بھر کر کچھ اور مختصر ہو گیا ہے۔ صحن کے مشرق کی طرف دو بوسیدہ سے کمرے جو غالباً پشت مسجد کا سہارا لئے ہوئے ہین ابھی تک اپنی سخت جانی کے اظہار کے لئے کھڑے ہین - یہ ڈیوڑھی، یہ صحن اور یہی دو کمرے غالب کی آخری فرود گاہ کی یادگارین ھیں - وہ بالاخانہ جو بقول ان کے " بیٹھنے اٹھنے سونے جاگنے جینے مرنے کا محل تھا " اب باقی نہین رہا - بلکہ حیرت ہوتی ہے۔ کہ یہ اینٹون کا ڈھیر اب تک کھڑا کس طرح رہا - گلی کی دوسری طرف غالب کے دیوان خانے کے تقریباً سامنے ہندوستانی دواخانے سے متصل غالب کا زنانخانہ تھا - یہان اب ہندوستانی دواخانے کا کارخانہ دوا سازی ہے۔ لیکن اس کا حلیہ اتنا بدل چکا ہے کہ اگر بیگم غالب پھر کسی طرح یہان پہونچ سکین تو انھیں اپنے گھر کو پہچاننے مین خاصی دقت محسوس ہو -

غالب دن کا پیشتر حصہ دیوانخانے مین گزارتے تھے - جب تک بڑھاپے کے ضعف اور امراض نے غلبہ نہ پالیا ان کا معمول یہ تھا کہ صبح ناشتہ کے بعد اپنے بالاخانے کے دالان مین دوستون کو خط لکھنے بیٹھ جاتے - خط لکھ کر اوپر لفافہ رکھ دیتے اور داروغہ کلو بند کر کے ٹکٹ لگا دیتے - دوپہر کو قصہ کہانی کی کوئی کتاب لیتے یا چوسر یا شطرنج سے جی بہلاتے - کبھین عارف جان یا قاسم جان والون مین سے کوئی لڑکا گلی مین سے آتا ہوا دیکھائی دیتا تو اسے آواز دے کر اوپر بلا لیتے - تھوڑی دیر اس سے ہنسی مذاق کی باتین کرکے کچھ اپنا مگر زیادہ اس کا جی خوش کرتے - گرمیون مین دوپہر کو بالعموم سو جاتے تھے - سہ پہر کو اٹھتے تو ملاقاتون کا سلسلہ شروع ہوتا - یہ ملاقاتین زیادہ تر اس ڈیوڑھی مین ہوتین جس کا ذکر ہم نے ابھی کیا ہے - اس ڈیوڑھی میں مونڈھے پڑے رہتے تھے - غالب بالاخانے سے نیچے اترتے ، دوست اور شاگرد اپنے اپنے وقت اور سہولت کے لحاظ سے جمع ہوتے اور یہین بیٹھتے - غالب ایک بڑے چوڑے مونڈھے پر جو لال کھاروے سے منڈھا ہوا تھا ٹانگین سمیٹے ہوئے بیٹھا کرتے - چپلیں آگے پڑی رہتیں - ذرا دائین ہاتھ کی طرف حقہ ہوتا - غالب اس عمر مین اونچا سننے لگے تھے - جب کوئی شخص بات کرتا تو سننے کے لئے کان اس طرف جھکا دیا کرتے تھے - ملنے والے اگر کہین قریب سے آتے تو پیدل چلے آتے تھے - فاصلے سے آنے والون مین پابند وضع بزرگ پالکی مین تشریف لاتے تھے - پالکی دروازے کے سامنے رکی، وہ بزرگ نیچے اترے ، غالب نے ذرا دیکھا اور پھر اپنے خاص لہجے مین (الفاظون کو خوب پھیلاتے ہوئے) کہتے ،، آئیے آئیے آپ کا مزاج اچھا ہے -،،

یہ دیوان خانے کی زندگی کی تصویر ہے - لیکن سوال یہ کہ حرم سرا مین زندگی کا نقشہ کیا تھا جہان غالب کی نصف صدی سے زائد کی رفیقہ حیات کے دن گزرتے تھے - غالب کا ہر روز کا معمول تھا کہ ایک موٹی سی لکڑی ٹیکتے ٹیکتے کم از کم ایک مرتبہ زنان خانے کو ضرور جاتے تھے - یہاں وقت کس طرح گزرتا تھا ، کیا باتیں ہوتیں ، کیا قصے قضیے

طے ہوتے تھے ان تفصیلات پر بظاہر پردہ پڑا ہوا ہے لیکن کچھ ہی عرصہ پہلے اس گلی قاسم جان کے اندر لوھارو والون کی اس حویلی مین جس کا ذکر ابھی ہو چکا ہے ایک سن رسیدہ بی بی موجود تھین جنھون نے غالب کی زندگی کے آخری دور کا یہ پہلو اپنی آنکھون سے دیکھا تھا - یہ بی بی عارف جان کی پڑپوتی ، غالب کے دوست نواب ضیاؑ الدین نیر رخشان کی بیٹی اور مرزا زین العابدین خان عارف کی بہو نواب معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم تھین - مجھے جولائی ۱۹۳۸ء مین اپنے کرم فرما اور محترم دوست حکیم محمد کامل خان صاحب دھلوی کی معرفت بگا بیگم صاحبہ کی خدمت مین حاضر ہونے کا موقعہ ملا تھا - بگا بیگم صاحبہ اپنی حویلی کے ایک دالان مین پردے کے پیچھے تشریف لے آئین - پردے کے دوسری طرف ایک تخت پر مین اور حکیم صاحب بیٹھ گئے - مین نے مرزا غالب اور ان کی بیگم صاحبہ کے متعلق کئی سوالات کئے جن کا جواب بگا بیگم صاحبہ مجھے تفصیل سے دیتی رھیں - ان کی عمر اس وقت لگ بھگ نوے برس کی تھی - مگر آواز میں بڑھاپے کی کمزوری کا کوئی خفیف سا اثر بھی میں نے محسوس نہیں کیا - برجستہ اور بے تکان بات کرتی تھیں - گفتگو کی ھر منزل پر مجھے انکے ذھن کی بیداری اور احساس ظرافت کی موجودگی کے ثبوت ملے ھیں - ان کے ھر جواب کی یادداشتیں قلم بند کرنے کی کوشش کرتا رھا - لیکن بار بار میں نے محسوس کیا کہ میرا قلم انکی شستہ تقریر کی روانی کا ساتھ نہین دے سکتا -

جو کچھ میں نے ان سے سنا اس کی کیفیت یہاں لکھنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ھے کہ غالب کی خانگی زندگی سے متعلق بگا بیگم صاحبہ کو کیا خصوصیت حاصل تھی جسکی بنا پر انکی دی ہوئی معلومات ھمارے لئے قابل قدر ھیں - یہ تو سب جانتے ھیں کہ غالب کی اولاد میں سے کسی بچے نے بھی برس سوا برس سے زیادہ کی عمر نہ پائی - ان کی بیگم صاحبہ نے اولاد سے مایوس ہو کر آخر اپنے بھانجے (قاسم جان کے بڑے پوتے) زین العابدین خان عارف کو منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا - مرزا غالب بھی عارف سے حقیقی اولاد کی سی

محبت کرتے تھے جس کا اظہار مرزا غالب کے اردو اور فارسی کلام
دونوں میں موجود ہے ۔ جب عارف کا انتقال (۱) ہو گیا تو غالب ان کے دونوں
بیٹوں باقر علی خاں اور حسین علی خاں کو اپنے پاس لے آئے اور انھیں اسی
لاڈ پیار سے رکھا جیسے اپنی اولاد کو رکھتے (۲) بڑے لڑکے باقر علی خاں
کی شادی غالب نے خود اپنی زندگی میں کی ۔ اس طریقے سے جو بہو غالب کے
گھر میں آئی وہ یہی بگا بیگم صاحبہ تھیں۔ ان تمام رشتوں کی کیفیت ذیل
کے شجرے سے بخوبی ذہن نشین ہو جائے گی ۔
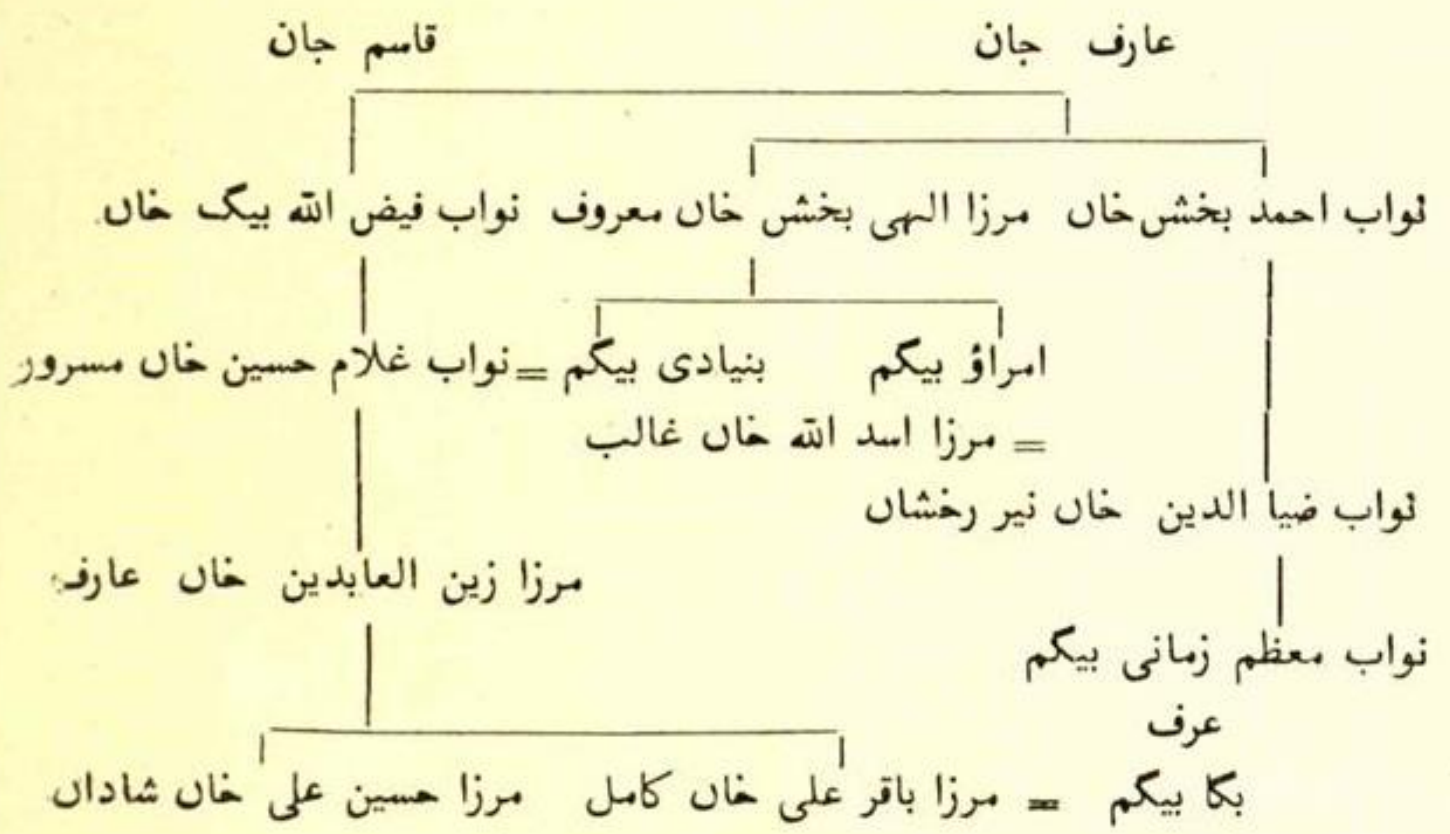
(۱)—۱۸۵۲ء میں— (۲)— غالب کے اردو خطوط میں جا بجا اس کی
طرف اشارے ملتے ہیں ۔ اپریل ۱۸۵۹ء کے ایک خط (بنام میر مہدی
مجروح) میں لکھتے ہیں ”لو بھئی اب تم چاہو بیٹھے رہو۔ چاہے اپنے گھر
جاؤ میں تو روٹی کھانے جاتا ہوں ۔ اندر باہر سب روزہ دار ہیں ۔
یہاں تک کہ بڑا لڑکا باقر علی خاں بھی ، صرف ایک میں اور میرا پیارا
بیٹا حسن علی خاں یہ ہم روزہ خوار ہیں ۔ وہی حسن علی خاں جس کا
روز مرہ ہے ”کھلونے منگا دو میں بجار جاؤں گا“۔

(بقیہ آگے صفحہ پر)

اس میں شک نہیں کہ بگا بیگم صاحبہ نے غالب کا صرف آخری زمانہ دیکھا - لیکن چونکہ وہ رات دن گھر میں رہتی تھیں اس لئے ان کے بیان کو ایک خاص اہمیت حاصل ھے - جہاں کہیں کہیں انھوں نے قیافے سے بات کی ان کا بیان درست نہیں۔ (مثلاً غالب کی عمر کے متعلق) مگر جو باتیں ان کی دیکھی ہوئی تھیں ان کی صحت میں شبہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی - مثلاً جب میں نے پوچھا کہ مرزا صاحب کے چلنے کا انداز کیا تھا - تو فوراً بولیں ''سہج سہج چلتے تھے بڈھے تھے - اسی برس کی عمر تھی -،، ظاھر ھے کہ اس قول کا صرف پہلا حصہ بالکل درست. اور دوسرا تخمیناً درست ھے - لیکن ھم کتنے ھی صحت پسند ہوں

(پچھلے صفحہ سے آگے)

بگا بیگم صاحبہ کے پھوپھی زاد بھائی خضر مرزا مرحوم مجھسے بیان فرماتے تھے ''میں نے اپنی آنکھوں دیکھا ھے کہ حسین علی خاں مرزا غالب سے شوخیاں کرتے اور کبھی ان کی چھاتی پر چڑھ بیٹھتے تھے پڑھائی کے معاملے میں بھی ان کی بہت نازبرداری ہوئی - مرزا صاحب نے کہا ''ارے حسین علی آکر پڑھ لے،، انھوں نے جواب دیا ''دادا جان آتا ہوں،، اور دوسری طرف نکل گئے - کھیل تماشے کا تو انھیں لپکا تھا۔ کٹھ پتلیوں کے تماشے پر ایک دفعہ بیس روپیے خرچ کر دیئے - اور پھر مرزا صاحب کے پاس منہ بسورتے ہوئے آئے کہ دادا جان بیس روپیے دلوائیے۔ مرزا صاحب نے کلو کو بلا کر کہا ''بھئی انھوں نے ایک پتھر اور مارا دیدے بیس روپئے،،

خضر مرحوم نے اپنے بچپن کے دنوں کا ایک اور واقعہ مجھے اس طرح سنایا ''ایک دن میں چلا جاتا تھا بھائی حسین علی خاں بھی گلی میں سے جا رھے تھے - مرزا صاحب نے ھمیں دیکھا اور آواز دی ''ابے لمڈو یہاں آؤ،، ھم پہنچے تو مرزا صاحب نے ھمارے لئے مٹھی بھر بادام طشتری میں ڈال دیئے - میں نے ھاتھ بڑھایا تو مرزا صاحب نے میرا ھاتھ پکڑ لیا اور کہا '' ابے یہ کیا - منہ سے کہا - میرے مرغی کے بچے یوں ھی چگا کرتے ھیں۔،،

ہمارا یہ تقاضا ضرورت سے زیادہ سخت ہوگا کہ بگا بیگم صاحبہ کے کسی تخمینے میں بھی کوئی فرق نہ نکلے ۔

اتنا تو سب جانتے ہیں کہ جس قدر مرزا غالب طبیعت کے لحاظ سے آزاد رو تھے اسی قدر ان کی بیگم صاحبہ اپنے باپ مرزا الہی بخش خاں کی طرح پرہیز گار اور نماز روزے کی پابند تھیں ۔ اس وجہ سے اکثر میاں بیوی کے درمیان نوک جھونک ہوتی تھی(۱) ۔ چنانچہ غالب بیوی کو ''حضوت موسی کی بہن،، کہتے تھے ۔ اور اگر زیادہ بگڑتے تو یہاں تک کہہ دیتے کہ ''میرا تو ناک میں دم کر دیا ہے۔،، مگر یہ جھگڑا محض رند و زہد کے اختلاف تک محدود نہ تھا ۔ جو کچھہ میں نے سنا اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اختلاف مزاج کو بھی گھر کی چپقلش میں خاصا دخل تھا ۔ چنانچہ خود بگا بیگم صاحبہ کی موجودگی میں میاں بیوی کی لڑائی ہوتی تھی ۔ امراؤ بیگم خفا ہوتی تھیں مگر خاموش ہو جاتی تھیں ۔ ان سے کہتی تھیں ''بیٹی تو تو بچہ ہے ۔ بڈھے کی باتوں کا خیال نہ کیا کر ۔ بڈھا تو دیوانہ ہو گیا ہے،، ۔

اس قسم کا ایک واقعہ بگا بیگم صاحبہ نے مجھے یوں سنایا کہ (مرزا صاحب) پچھلے پہر ہوا خوری کو جایا کرتے تھے۔ ایک روز عصر کے بعد واپس آئے ۔ میں اور میری ساس عصر کی نماز پڑھ رہی تھیں ۔ وہ بھی اس تخت کے نکڑ پر ہو بیٹھے ۔ جب ہم نے سلام پھیرا تو کہنے لگے واہ واہ خوب بہو کو بھی اپنا سا کر لیا ۔ کمہاری بونٹ کا کیڑا اپنے گھر لے جاتی ہے ۔ تو چالیس دن میں اسے بھی اپنا سا کر کرکے نکال دیتی ہے۔

ایک اور لطیفہ بگا بیگم صاحبہ نے مجھے سنایا کہ برسات کے دن تھے ۔ مینہ بہت برسنے لگا ۔ دونوں (باقر علی خاں اور حسین علی خاں) نے کھانا کھایا اور چلے گئے نیاز علی (ملازم) بھی چلا گیا ۔ (مرزا صاحب) بیٹھے بیوی سے باتیں کرتے تھے۔ میں یوں بیٹھی تھی گاؤ تکئے کے کونے سے

---

(۱) اس ضمن میں ''یاد گار غالب،، کی متعلقہ عبارت بھی پڑھنے کے قابل ہے ۔

لگی ہوئی - کہنے لگے ''ایک بیوی دو میں تیسرا آنکھوں میں ٹھیکرا بھو، میں اور میری بیوی بیٹھے ہیں تم کیوں بیٹھی ہو۔،، اس پر میری ساس بولیں ''ارے توبہ توبہ بڈھا دیوانہ ہے۔ اسے تو ٹھٹھے کے لئے کوئی چاہئے - اب بھو ہی مل گئی -،، میں اتنے میں اٹھکر کونے میں جا چھپی۔ اب انہیں یہ فکر کہ برسات کا موسم اور کیڑے پتنگے کا عالم مجھے ڈھونڈتے پھریں اور کہتے جائیں ''مجھے کیا خبر تھی بھو اس بات کو اتنا برا مانے گی،، -

میں نے نوکروں اور بچوں کے متعلق پوچھا کہ غالب ان سے کس طرح پیش آتے تھے - حسین علی خاں کے متعلق بتایا کہ ''چھوٹے پوتے کو دھمکایا کرتے تھے۔،، نوکروں میں کلو کا خاص طور پر ذکر کیا اور کہا ''کلو داروغہ کو مرے ہوئے پندرہ برس ہو گئے لوگ ان کی زیارت کو بہت آتے تھے - یہ چودہ برس کی عمر میں مرزا صاحب کے پاس آ کر رہے۔ کلو داروغہ کا یہ حال تھا کہ پاؤں کی آہٹ سے پہچان لیتے تھے کہ لڑکیاں ہیں، بھوئیں ہیں یا بوڑھیاں - ایک اور نوکر مدار خان تھا - ان دونوں کا بیان انہوں نے خود کیا - یہ مجھ سے پہلے کا ذکر ہے۔ میں نے سنا ہے مدار خان کے لڑکے کا نام نیاز علی تھا - یہ مرزا صاحب نے لے لیا - مدار خان کی بیٹی آبادی کو کلو نے اپنی بیٹی بنا لیا تھا -،،

کھانا ایک، وقت کھاتے تھے - دوسرے وقت کباب تلے ہوئے، دال، مربہ، پسے ہوئے بادام اور حلوہ سوہن(۱)۔ جب کھانا خراب ہوتا تو پکانے والے کو گالیاں دیا کرتے تھے - پکانے والا کون تھا - ددا تھیں - مرزا صاحب پان نہیں کھاتے تھے - میں نے انھیں کبھی کھاتے نہیں دیکھا - چنے کی دال، بیسن کی پھلکیاں اور کڑھی بہت کھاتے تھے۔ چنے کی دال ہر سالن میں ایک ایک چمچہ ضرور پڑتی تھی۔ میرے بیاہ کے بعد کی بات ہے کہ

---

(۱) بگا بیگم صاحبہ نے قدرتاً غالب کی شام کی شراب کا ذکر نہیں کیا - لیکن عجب نہیں یہ حلوہ سوہن بھی شراب کا قائم مقام ہو۔

چنے کی دال سالن میں پڑی ہوئی میرے سامنے بھی آئی - مجھے پسند نہیں
تھی - مغلانی نے میری ساس سے شکایت کی کہ بھو نہیں کھاتی چنے
کی دال- مرزا صاحب یہ بات سن رہے تھے کہنے لگے ''اوھو خدا سے بھی
بڑھ گئی بھو - توبہ توبہ-،، پھر میری ساس سے کہنے لگے '' بیوی سنو،، -
وہ بولیں '' میں نہیں سنتی ،، - اس پر مجھ سے کہا ''بیٹی برا نہ
مانیو - ایک بات سناتا ھوں - خدا کے آگے چنا گیا اور فریاد کی کہ
باری تعالے یہ کیا بات ھے کہ مجھکو لوگ طرح طرح سے تنگ کرتے
ھیں، بھونتے ھیں، تلتے ھیں، ابالتے ھیں، پیستے ھیں، آخر میرا کیا گناہ ھے، خدا
نے چنے کی طرف دیکھا اور کہا ''دور ھو نہیں میں تجھے کھا جاؤں گا -،،
یہ بات سناتے ھوئے خود بھی ھنستے رھے-

میں نے پوچھا مرزا صاحب کی یاد کی کوئی چیز آپ کے پاس ھے ؟
کہنے لگیں ''مجھے کیا خبر تھی کہ لوگ ان کی چیزوں کو اس طرح
ڈھونڈیں گے -،، میرے پاس تو کوئی چیز نہیں، ھاں معظم میاں (نواب
معظم علی خاں) کے پاس ان کا پیالہ اب تک ھے- وہ اس کو اپنے ساتھ بھوپال
لے گئے تھے -،، جب میں نے غالب کے مذھب کے متعلق سوال کیا تو بولیں
''ان کے مذھب کا کیا ٹھکانا جھاں بیٹھے اسی مذھب میں ھو گئے،، میں نے
یہ پوچھا کہ مرزا صاحب کس عمر میں اونچا سننے لگے تھے - جواب دیا
''میں نے تو انھیں بھرا ھی دیکھا جب میرا بیاہ ھوا تو بھرے ھی تھے-،،
غالب کے بھائی مرزا یوسف کی وفات کے متعلق دریافت کیا تو کہا سرس کی
گلی (۱) میں مارے گئے تھے - مسجد تہور خاں میں دفن ھوئے-،، میں نے
غالب کے متعلق بھی پوچھا کہ کس جگہ انتقال کیا تو جواب دیا ''دیوان
خانے میں جھاں مجید خاں نے اصطبل بنوایا ھے - اس وقت حکیم محمود
خاں، حکیم غلام مرتضی اور حکیم احسن اللہ خاں وغیرہ سب موجود
تھے-،،

اس سوال کے جواب میں کہ مرزا نے کس مرض میں انتقال کیا
بکا بیگم صاحبہ نے کہا ''وہ کچھ بیمار تو ھوئے نہیں - بس مرھی گئے-

(۱) فتح دھلی کے بعد ۱۸۵۷ء میں

ہوا یہ کہ کھانا کھانے آئے۔ چندو (۱) بیگم کو بہت چاہتے تھے۔ پوچھا ''جیون بیگ کہاں ہیں بلاؤ ۔ احمد بیگ ان کے خادم تھے۔ انہیں بھیجا ۔ مرزا صاحب کہنے لگے '' اچھا جب وہ آیش گی تو کھانا کھاؤں گا۔،، یہ کہہ کر لیٹ گئے۔ کروٹ لے کر لیٹے ہی تھے کہ بے ہوش ہو گئے۔ اسی حالت میں ان کا دم نکلا۔

امراؤ بیگم کے متعلق بگا بیگم صاحبہ نے مجھ سے کہا ''جب میں بیاہی گئی تو وہ امچور کی پھانک تھیں ۔ جا نماز پر بیٹھ کر کہا کرتیں ''اے اللہ تو کب بلائے گا ۔،، ایک روز میں نے پوچھا '' پھوپھی جان آپ کو قبر سے ڈر نہیں لگتا ۔،، کہنے لگیں،، تھکا بیل سرا کو دیکھتا ہے۔،،

یہ ہے ان معلومات کا بڑا حصہ جو مجھے بگا بیگم صاحبہ سے حاصل ہوئیں ۔ یہیں اس تحریر کو ختم ہونا چاہئے تھا لیکن آخر میں مجھے ذاتی حیثیت کی ایک چھوٹی سی بات کا بھی ذکر کرنا ہے۔ جس دن مجھے بگا بیگم صاحبہ سے باتیں سننے کا موقع ملا اسی شام میں نے اپنی والدہ مرحومہ کو (جو اس وقت زندہ تھیں) معمول کے مطابق ایک خط لکھا یہ خط محفوظ ہے اور اس وقت میرے سامنے ہے۔ اس میں مجھے یہ عبارت نظر آتی ہے۔

آج صبح ہوٹل سے نکل کر میں پھر حکیم صاحب کے پاس پہنچا۔ وہ مجھے بگا بیگم صاحبہ (معظم زمانی بیگم) دختر نواب ضیأ الدین نیررخشاں کے پاس لے گئے ۔ یہ عارف کی بہو ہیں ۔ نوے برس کی عمر ہے ۔ گھر کی باتیں بتاتی رہیں ۔ بہت مہربانی سے پیش آئیں۔ بار بار اصرار سے پان دینا چاہتی تھیں۔ مگر حکیم صاحب (جنھیں علم تھا کہ میں پان نہیں کھاتا)

---

(۱) بگا بیگم صاحبہ کی بڑی صاحبزادی کا عرف ہے جو اس وقت اپنی عمر کے چوتھے سال میں تھیں ۔ مرزا غالب انہیں محبت سے ''جیون بیگ ،، کہتے تھے ۔ ان کی شادی نواب شجاع الدین سے ہوئی۔

روک دیتے تھے۔ انھیں بار بار یہی خیال ہوتا تھا کہ اتنی دور سے آئے ہیں ان کی تواضع ضرور ہونی چاہئے ـــــــــــــــ،،

میں اب بھی پان نہیں کھاتا ہوں۔ لیکن جب اس عبارت کو پڑھتا ہوں تو یہ افسوس ضرور ہوتا ہے کہ میں اس دن ایک تبرک سے محروم رہا۔

آغا حیدر حسن

غالب

اٹھارویں صدی کا آخیر دھا ہے ۔ ہندوستان کے تخت پر دلی میں بے بصر شہنشاہ شاہ عالم تبر کا جلوہ فرما ہے۔ انتظام سلطنت دکھنیون کے ہاتھ میں ہے — آگرہ جاٹون اور دکھنیوں کے ہاتھوں لٹ کٹ گیا ہے — دونون شہرون کے سرخ سنگ بستہ قلعے جمنا مائی کے کنارے جوں کے توں کھڑے ہین — لال حویلی مین جہان پناہ براجمان ہیں — اور آگرہ کے قلعے مین مغلئی قلعدار ہے ۔ آگرے کی پرانی حویلیاں مغل امیرون کی امارت پر گواھی دینے کو ابھی تک موجود ہیں جنکے عالیشان سنگین پھاٹکوں کے اوپر بالا خانے اور بنگلیاں ابھی تک آباد ہیں — سڑکوں پر لال پتھر کی سلیں بچھی ہیں — جنہر رتھوں کے نقاشی پہیوں کی گھڑ گھڑاھٹ سے جو ایکیں ہڑ گئی ہیں شہر کی چہل پہل کا پتہ دیتی ہیں — رتھوں کے کار چوبی اور پٹاپٹی کے پردے جن پر سنہری کلس، کلسوں پر شیشون کے سورج مکھی، سرخ سبز ریشم اور گنگا جمنی بادلے کے پھندنے چو طرف لٹکتے، ناگوری بیل جتے، سر سے پیر تک سجے، گلے میں گھنگرو، پیرون میں جھانجھیں چھما چھم کرتے چلے جا رہے تھے — ہاتھیوں کی گھنٹی کی ٹن ٹن دھت دھت بری بری کی آوازیں پالکیون، تام جھامون، سکھہ پالون اور ہوا دارون کے ساتھہ کہاروں کی ہنکاروں، چوبداروں کی ہٹو بچو بڑھو کی صداؤں سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی — آیند و روند کی رنگ برنگی پو شاکیں، چہچہاتی دستاریں ۔ چیرے۔پاگ۔پگڑیاں عجیب بہاریں دکھاتی تھیں — اس گھما گھمی کے زمانے میں جبکہ اٹھارویں صدی کے اختتام میں تین برس باقی تھے کہ خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کی حویلی میں کشمیرن کے کٹڑے کے پاس مرزا اسداللہ خاں غالب عرف مرزا نوشہ پیدا ہوئے — ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں عرف مرزا دولہا اپنے خسر خواجہ

غلام حسین خاں ھی کے پاس اپنی بیوی عزت النسا بیگم کے ساتھ گھر داماد بنے رہتے تھے۔ معلوم نہیں اس نو نہال کی ننھال میں کیا کچھ اللہ آمی پیر سلامی اور کیا کچھ نہ مانمنت ہوئی ہو گی۔ کون کون سے ہیجڑے بھانڈ اور کون کون سی چونے والیاں آئی ہونگی اور کون کون سی زچہ گیریاں گائی گئی ہونگی۔ اور جو زائچہ کھینچا گیا ہوگا معلوم نہیں اسمیں مرزا کی دنیائے شاعری کی شہرت کے باب میں کیا پیشین گوئی کی گئی ہو گی۔ مرزا سات برس کے ہوئے ہیں اور اپنی چچی بیگم نصراللہ بیگ خاں کے ساتھ جو عارف جان کی بیٹی اور نواب فخرالدولہ احمد بخش کی بہن تھیں دلی آئے ہیں۔ شاہ عالم از دلی تا پالم ابھی تک زندہ ہیں۔ اپنی جزورسی اور دکھنیوں کی خدمات شائستہ سے خزانے کی حالت سدھار لی ہے۔ایک تخت طاؤس بھی بنوا لیا ہے۔ دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کئے دیکھی کو ان دیکھی اور سنی کو ان سنی کئے صبر شکر سے بیٹھے ہیں۔ جناب عالیا کا اندر دور دورہ ہے۔ باھر نائب پیشوا کی باندھی بندھتی اور کھولی جاتی ہے۔ خلق خدا کی ملک بادشاہ کا اور حکم بائیوں کا ہے۔ ان دنوں کی دلی لندن، پیرس برلن سے بڑی اور آباد ہے۔ باور نہ ہو تو اس زمانے کے فرنگیوں کے سفر نامے اٹھا کر دیکھ لئے جائیں اور یہ وہ زمانہ ہے کہ تخت اڑ گئے بلندی رہ گئی ہے مگر ہاتھی لٹا لٹایا بھی سوا لاکھ کا۔ شاھجہان کی دلی پھر بھی دلی ہے۔ سڑکوں پر سنگ خارا کی ٹوڈیوں کا فرش ہے۔ دونوں طرف کی سیڑھیوں پر لال پتھر کے چوکے بچھے، آسمان سے باتیں کرتے ہوئے حویلیوں کے پھاٹک جنکے کواڑوں پر برنجی کنولی زمانی میخیں ٹھکیں رتھہ، بھلیاں، تانگے، منجھولیاں، ھوادار، تام جھام، پالکیاں، تخت رواں، سکھپال چنڈول، مہاڈول، نالکیاں، ھاتھی گھوڑوں کی آرجار، امیر امرا ھتھیار لگائے زیور پہنے، بناؤ سنگار کئے، مرقع بنے، حشم خدم ساتھہ، نقیبوں کی آواز کڑکیوں کے کڑکے چوبدار، ملار، آسے بردار (عصا بردار) مرد ہے شاھی سواریوں کے ساتھہ بھیڑ کو چھانٹتے، آدمی پر آدمی ٹوٹا پڑتا، کھوے سے کھوا چھلتا، تھالی پھینکو تو سر پر چلتی۔ رات کو سواری نکلتی ہے تو مشالچی مشالیں (مشعلچی مشعلیں) ہنچی والیاں ہنچیاں لئے، ایک ھاتھہ میں مشعل

دوسرے ہاتھ میں تیل کی برنجی کپی تیل ٹپکاتے چلے جاتے ہیں۔ مشعلوں کا دھواں اٹھتا اور اپنی خوشبو سے فضا کو معطر کر دیتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ رات رات تھی اور دن دن ۔ اس وقت مرزا نوشہ سات برس کا سن گلبدن کی تمان (تنبان)، چندیری کا ننھا منا سا جامہ، گوٹے کی ٹوپی، چمپا، ننھی جان، گوکھرو، کرن، توئی ٹکی اوڑھے، زر دوزی کی کفش پہنے پیاری پیاری صورت، اس دلی میں آئے ہونگے جسکی کی داستانیں اپنی چچی سے اور اپنے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں سے سنی ہونگی۔ اور جسے دیکھنے کا انہیں اتنا ارمان ہوگا جیسے آجکل کے اوقات بھروں کو لندن اور پیرس کا۔ مرزا بیچارے جب دلی میں آئے ہوں گے تو اپنی چچی کے میکے قاسم جان کی گلی میں اترے ہوں گے۔ ان کے ہم عمر بچوں نے جب مرزا کو اکبر آبادی لب و لہجے میں باتیں کرتے سنا ہوگا تو کیسے ہنستے ہوں گے، کیسا بنایا ہوگا۔ آنکھ مچولی، چنی منی پہاڑوا، سرنگ، لال گھوڑی، کاٹھ کٹول، بانسلی، کوڑی جکن مکن، اندھا بھینسا، کوڑا جمال شاہی پیچھے دیکھے مار کھائی، چیل جھپٹا، چدر چھپوں کھیلی ہو گی۔ کچھ دن دلی میں رہ کر اور دلی پیاری کی تہذیب وشائستگی کا رعب اپنے ننھے سے دل میں لے کر ننھال واپس آ گئے ہوں گے۔ اس زمانے کی دلی وہ دلی تھی کہ ہر شخص اپنے کو رستم افراسیاب جمشید اور کیقباد سمجھتا تھا ۔ ناک چوٹی گرفتار دلی والیاں باہر والیوں پر ناک بھوں چڑھاتیں ۔ ایک ایک کے خاندان کے مرے مردے اکھاڑے جاتے۔ نسلوں مین فی نکلتی ۔ سات پشتیں پنی جاتیں۔ دلی کے پوتڑوں کے امیرون میں نو دولتیا گالی کے مترادف تھا ۔ کسی کو سمرقند کا زرگر، کسی کو بخارے کا سقہ، کوئی کوٹے بوندی والے کی چھری کوئی تجارے کی گائین کا بچہ، کسی کو لونڈی بچہ کبھی نہ سچا ، کسی کو قارو رہ دیکھنے والا اور کسی کو کلرن کا جنا کہتے۔ اپنی ٹکر کا کسی کو نہ سمجھتے۔ نواب فخرالدولہ کے گھرانے نے خوب عروج حاصل کیا۔ اس لئے دلی والوں کی زبان پر سب سے زیادہ تھا ۔ اس گھرانے کی بیویاں پر کٹی پریاں ۔ زبان میں وہ شیرینی کہ طوطیاں ہاتھ پساریں، دین لین بھی اچھا لیکن شہری بر ذرا کم ملے۔ یا تو انھوں نے اپنوں کو ڈھکا یا غیروں میں بیاہ بیوہار

ہوا تو وہ تازہ ولایت یا باہر والے ۔ دلی ابھی تک مدینتہ اللمرا بنی ہوئی تھی۔ ایک ایک محلے سے چھپن چھپن پالکیاں امیروں کی اور انکی چیلوں کی نکلتی تھیں ۔

مرزا اسداللہ خاں نے عبدالصمد سے پڑھنا شروع کیا۔ شفیق اور محب استاد نے دو تین برس میں جو سکھایا جا سکتا تھا سکھا دیا۔ اور فارسی زبان کے گر بتا دئے ۔ اب مرزا کا سن تیرہ چودہ برس کا ہے۔ مرزا کی چچی نے اپنی بھتیجی امراؤ بیگم سے جو نواب الہی بخش خاں معروف کی بیٹی تھیں مرزا کی شادی کر دی۔ یہ جوڑا گھس پس کے ھی اترا۔ مرزا کی جس زمانے میں شادی ہوئی ہے وہ زمانہ حضرت اکبر شاہ ثانی کا تھا۔ شہر میں دورہ انگریزوں کا تھا۔ قلعہ میں دربار بادشاہ کا اور شہر میں دربار، صاحب کلاں کی کوٹھی پر لگتا تھا۔ جوڑ توڑ کا زور تھا۔ اب خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا حکم کمپنی بہادر کا تھا۔ شادی کرکے مرزا آگرے چلے گئے۔ عین جوانی کا زمانہ، سستے سمئے۔معیشت سے فارغ البال، منشی بنسی دھر کے ساتھہ چوسر شطرنج اڑتی، گنجفہ کھیلا جاتا، راجہ بلوان داس سے پتنگ لڑتے، اپنے عیش سے گذرتی۔ مثل مشہور ہے کہ دلی کی لڑکی اور گوکل کی گائے باہر جائے تو بھاگوں کو گائے۔ دلی اور آگرے کی گھریلو زندگی میں بہت فرق تھا۔ مرزا کی بیوی کا دل آگرے میں نہ لگا۔ اور ادھر ہوئی کچھہ پیسے کی کشش۔نانا نانی کی طرح بھلا ماموں اور ممانیاں کیوں چاھنے لگے۔ آنکھہ بدلنے سے کوچہ بدلنا ٹھیک۔ دلی چلے آئے اور یہیں کے ہو رہے ۔ ستائیس، اٹھائیس برس کے اس وقت ہونگے ۔ میاں نصیر الدین عرف کالے صاحب کے مرید الہی بخش خاں معروف بھی تھے۔ ان کی صحبت مرزا کو میسر آئی۔ مرزا فارسی میں غالب اور اردو میں اسد تخلص کرتے تھے۔ پھر غالب ھی اردو اور فارسی میں اسد پر غالب رہا۔ میاں کالے صاحب کی صحبت سے غالب نے وہ فیض اٹھایا جسکی بدولت انکے کلام میں حافظ شیرازی کا عرفان اور حلاوت آگئی۔ مرزا اس پائے کے شاعر تھے کہ سینکڑوں برس جب زمین سورج کے صدقے ہو لیتی ہے اور آسمان کو حیرت سے تک لیا کرتی ہے تو عالم ارواح سے اترا کرتے ھیں۔

مرزا کی بدقسمتی تھی کہ وہ ایسے ملک میں پیدا ہوئے کہ جہاں کسی صنعت میں کمال عوام کو اس بات کا متمنی بنا دیتا ہے کہ صاحب کمال زندگی کے اور اخلاق کے ہر شعبے میں فرد ہو۔ اور طبیعت میں وہ بچپنا ہوتا ہے کہ اگن کے چہچوں کو ہی نہ سنیں۔ بلکہ اسکے پر نوچیں اس کا پیٹ چیریں اور اندر کی چھپی آلائشوں کو نکال کر بے معنی طور پر دیکھیں کہ یہ چہچہا کہاں سے نکل رہا ہے۔ اس طرح ہم اگر کسی ہرے بھرے پھلے پھولے باغ میں سیر کو جا نکلتے ہیں تو نہ پھل دیکھتے ہیں نہ پھول بلکہ اسی تاک میں رہتے ہیں کہ کسی کونے کھدرے اور جھاڑ جھنکار کی اوٹ میں کوئی گندی گھناؤنی چیز پڑی نظر آ جائے اور وہاں سے منہ بناتے نکل بھاگیں اور باغ کی ساری بہار پر خاک ڈال کر غلاظت کو خوب اچھالیں۔ یہی ذہنیت ہے کہ اپنے مشاہیر کی خانگی زندگی اور انکی اخلاقی کمزوریوں کی ہنڈی چندی کی جاتی ہے۔ اس مزاج کے لوگوں نے کبھی تو غالب کے سنی شیعہ ہونے کو چمکایا، کبھی انگریزوں کے خوشامدی ہونے کو دلکا۔ کبھی فرائض مذہبی کو بجا نہ لانے کو اگنا۔ یہ نہ جانا کہ بس اتنا ہی کافی ہے کہ مرزا نوشہ اسد ہیں اور غالب۔ جنکی بدولت ہماری زبان کو چارچاند لگ گئے۔ بجائے اسکے کہ ہم ہزاروں شاعروں کے کلام کو جو زمانے کی ناقدری کے ہاتھوں گوشہ خمول میں پڑے ہیں شائع کرائیں اور جو اس قابل ہیں انکو غالب کی صف میں بٹھائیں۔ یہ تو کرتے نہیں بلکہ جو صف قائم ہو گئی ہے اسکو درہم برہم کرنے کے درپے ہیں۔ غالب کے اوپر اتنا لکھا جا چکا ہے کہ اگر وہ سب جمع کیا جائے تو ایک چھوٹی موٹی الماری بھر جائے۔ ان کے لطیفے، انکے خطوط، انکے سوانح، انکے کلام کی مختلف شرحیں ہمارے ہاتھوں تک پہنچ چکی ہیں۔ اور انکے متعلق اتنا لکھا جا چکا ہے کہ اب تک کس ہندستانی شاعر کے لئے نہیں لکھا گیا۔ غالباً اسکا انکو سان و گمان بھی نہ ہوگا کہ اتنی ان کی قدر ہوگی اور وہ بھی انگریزی پڑھے لکھوں کے ہاتھوں۔ حیدر آباد میں بھی دو شرحیں لکھی گئی ہیں۔ ایک مولانا عبدالعلی والہ مرحوم کی ہے۔ اور دوسری شرح ان کے فرزند مولوی عبدالواحد صاحب نے لکھی ہے۔ غالب نے جو خط ذکاؔ مرحوم کو

لکھے ہیں اور جو خط ذکاؔ نے غالب کو لکھے ہیں وہ ذکاؔ نے ایک کتاب کی صورت میں ترتیب دئے ہیں ۔ یہ سب فارسی میں ہیں۔ان کا قلمی نسخہ جو ذکاؔ ہی کا مکتوبہ ہے میرے کتاب خانے میں موجود ہے۔ غالب نے جو فارسی قصیدہ نواب مختار الملک سر سالار جنگ کی شان میں لکھا تھا میری نظر سے گزرا ہے ۔ بھلا ان خشک اور روکھی سوکھی باتوں سے اس مضمونؔ کو کیا غرض ۔ جب غالب دلی آئے ہیں تو صورت دیکھنے دکھانے کے لائق تھی ۔ کتابی چہرہ، سبزہ رنگ، خوبصورت بتیسی، دانتوں پر مسی ملی، دھرا بدن کشیدہ قامت ، اچھی ھاڑ، چوڑے دھے کی کلاہ پاپاخ، مشروع کا تنگ موری کا پاجامہ، جامیوارکی چپکن اور اسپر نیمہ آستین۔ نوک دار کفشی۔ یہ وضع شہر آبادی تک رہی ۔ البتہ بڑھاپے میں کمرگ کا سفید بر کا پاجامہ، ململ کا سفید الفی گریبان کا کرتا اور گھر میں ململ کی گول ٹوپی جو قدرے سر پر منڈھی رہتی اوڑھتے۔ مرزا کی تقریب میاں کالے صاحب نے احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں سے کرا دی تھی۔ اور انھوں نے مرزا کا تعلق قلعہ سے کرایا۔ جہاں وہ تاریخ لکھنے پر مامور ہوگئے۔ مرزا کا دل اب دلی میں لگ گیا تھا ۔ مولوی امام بخش صہبائی ، مفتی صدر الدین آزردہ ، نواب مصطفی خاں شیفتہ اور جواد الدولہ سر سید احمد خاں سے دوستی ہو گئی تھی ۔ مفتی صدر الدین کی حویلی میں نہر کے کنارے ایک سنگ مرمر کی چوکی پڑی ہے جس پر غالب اکثر بیٹھتے ۔ سب دوست جمع ہوتے ۔ علم و ادب کے چرچے رہتے ۔ دلی کو غالب نے اپنا وطن ہی بنا لیا تھا ۔ ضرورت سے کلکتے گئے اور رستے میں لکھنئو ٹھہرے پھر دلی واپس آگئے ۔ حکیم احسن اللہ خان کی محل سرائے تو غدر کے بعد میرے دادا حضرت ہز ھائینس عالیجاہ پرنس آغا حسن جان صاحب خورشید وحید روتمغہ دردران شجاع الملک نے خرید کر اپنے سمدھی بخشی انعام اللہ خاں مرحوم کے حوالے کر دی تھی ۔ اسی محلسرائے میں میں نے ہوش سنبھالا ۔ اسکے پھاٹک پر غالب کا قطعہ فارسی میں ہے اور اس کے حمام میں بھی غالب کے قطعے تاریخ اور تعریف کے سنگ موسی کے حرفوں میں سنگ مرمر کی تختیوں پر کندہ کئے ہوئے لگے ہیں ۔ غالب کی دلی میں اپنے برے بھلے گزری چلی جاتی تھی ۔ استاد ذوق کے بعد حضرت بہادر شاہ ظفر بادشاہ غازی اپنا کلام بھی غالب کو دکھانے لگے ۔ اس رنگ کو

کچھ عرصہ نہ گزرا تھا کہ کمپنی کی فوج نے سر اٹھایا اور بے سری فوج نے جو چاھا کیا۔ پاداش اسکی دلی والوں کو بھگتنی پڑی۔ ادھر کی دنیا ادھر ہو گئی۔ غالب کا یہ حال کہ ھڈی سے چمڑا لگا کانوں سے بہرے۔ بڈھے پھونس۔ ھلنے جلنے کی طاقت نہیں۔ اسپر بھی دوستوں کے خط آتے ھیں۔ جواب لکھواتے ھیں۔ شہر کھد کھدا برابر ھوا۔ جو گھر اور حویلیاں محلسرائیں باقی ھیں اینٹیں دانت نکوسے چھلیں پھولیں، شہر پناہ جگہ جگہ سے ٹوٹی۔ جہاں دنیا امڈی پڑتی تھی اور چلنے کا راستہ نہ ملتا تھا وھاں ھو کا میدان ھے۔ کدال پھاوڑے بج رھے ھیں۔ اور گدالے برس رھے ھیں۔ چو طرف عجیب ویرانی، حیرانی اور پریشانی۔ غالب اس بربادی کے بارہ برس مزے چکھنے کے بعد دو کم پون سو برس کی عمر میں اپنے مولا سے جا ملے۔ اپنی سالی بنیادی بیگم کے لڑکے نواب زین العابدین خاں عارف کے دو بیٹوں باقر علی خاں اور حسین علی خاں کی شادیاں کر دی تھیں۔ یہ نواب بیگم، نواب شمس الدین خاں والئی فیروزپور جھرکہ کی بہن کے بطن سے تھے۔ بڑی بگا بیگم صاحب مرحومہ جو نواب باقر علی خاں کی بیوی تھیں ان کے پاس میں چھٹپن سے جاتا تھا۔ اور میری دادی حضرت کی منہ بولی بہن بنی ھوئی تھیں۔ اس لئے میں ان کو دادی اماں کہا کرتا تھا۔ ان کی تین صاحبزادیاں تھیں۔ بڑی صاحبزادی جنکو غالب پیار سے جیون بیگ کہا کرتے تھے نواب شجاع الدین احمد خاں تاباں ابن نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب سے بیاھی گئیں۔ یہ دونوں میاں بیوی سگے ماموں زاد پھوپھی زاد بہن بھائی تھے۔ یہ لاولد رھیں اور اب کوٹھی نواب شجاع الدین احمد خاں گلی قاسم جان میں رھتی ھیں۔ منجھلی صاحبزادی نواب بشیرالدیں احمد خاں ابن نواب علاؤالدین احمد خاں سے بیاھی گئیں۔ ان کے ھاں دو صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں ھوئیں۔ ان کی صاحبزادی عالیہ بیگم لیڈی عبدالصمد خاں اور نواب خسرو مرزا بقید حیات ھیں۔ دادی بگا بیگم کی تیسری صاحبزادی کرنل ضیاالدین احمد مرحوم سے بیاھی گئیں اور ماشاالله صاحب اولاد ھیں۔ غالب کی وفات کے ایک ھی سال کے اندر اندر انکی بیگم صاحبہ نے بھی انتقال کیا۔ غالب اپنی سسرالی ھڑواڑ میں چونسٹھ کھمبے کے پاس سلطان جی میں آسودہ ھیں۔ جہاں انکی قبر آج تک کسں مپرسی کی حالت میں پڑی ھے۔ اور ھماری قدر دانیوں پر عبرت کا سبق دیتی ھے۔

غالب کی کہانی خود اُن کی زبانی

گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام چہ رفت
می تواں گفت کہ این بندہ خداوند نہ داشت

قاعدہ یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں ـ لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ کو روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا ـ

تاریخ ولادت من از عالم قدس ــ ہم ''شورش شوق،، آمدوہم لفظ '' غریب،،

تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا ـ ایک بیڑی پاؤں میں اور شہر دھلی کو زندان مقرر کیا۔ فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا ـ برسوں کے بعد جیل خانہ سے بھاگا ـ تین برس بلاد شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایان کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے ـ جب یہ دیکھا کہ قیدی گریز پا ہے دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں ـ پاؤں بیڑیوں سے فگار، ہاتھ کڑیوں سے زخمدار، مشقت مقرری اور مشکل ہوگئی ـ طاقت یک قلم زائل ہو گئی ـ بے حیا ہوں بیڑیوں کو زاویہ زندان میں چھوڑ مع دونوں ہتکڑیوں کے پھر بھاگا ـ میرٹھ، مرادآباد ہوتا ہوا رامپور پہنچا ـ کچھ کم دو مہینہ وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا گیا ـ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں گا کیا بھاگنے کی طاقت ہی نہ رہی ـ حکم رہائی دیکھئے کب صادر ہو۔ بہر تقدیر بعد رہائی کے آدمی سوا اپنے گھر کے او، کہیں نہیں جاتا ـ میں بھی بعد نجات سیدھا عالم ارواح کو چلا جاؤں گا ـ

فرخ آں روز کہ از خانہٗ زندان بروم
سوئے شہر خود ازایں وادئی ویران بروم

نام اسد اللہ خاں ، غالب تخلص عرف مرزا نوشہ ۔ قوم کا ترک سلجوقی ہوں سلطان برکیارق کی اولاد میں سے

سلجو قیم بہ گوھر و خاقانیم بہ فن
توقیع من بہ سنجر و خاقان برابراست

دادا میرا توقان بیگ ماوراء النہر سے شاہ عالم کے عہد میں سمرقند سے دھلی آیا۔ پچاس گھوڑے نقارہ و نشان سے شاہ عالم کا نوکر ھوا ۔

باپ میرا عبداللہ بیگ خاں بہادر لکھنؤ جا کر آصف الدولہ کا نوکر ھوا بعد چند روز حیدرآباد جا کر نواب نظام علی خاں کا نوکر ھوا۔ کئی برس وھاں رھا ۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رھی ۔ والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا ۔ راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ھوا۔ اور وھاں ایک لڑائی میں بڑی بہادری سے لڑتا ھوا مارا گیا ۔

نصر اللہ بیگ میرا چچا حقیقی مرھٹوں کی طرف سے اکبرآباد کا صوبیدار تھا اس نے مجھے پالا ۔

نوید وصل دیم می دھد ستارہ شناس
نکرد ژرف نگاھی مگر دراختر من

یہ شعر افتتاح کلام ھے ۔ پہلے کچھ باتیں جو بادی النظر میں خارج مبحث معلوم ھوں گی لکھی جاتی ھیں ۔

پانچ برس کا تھا میرا باپ مرا۔ نو برس کا تھا کہ میرا چچا مرا۔ اس کی جاگیر کے عوض میرے اور میرے شرکائے حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں مرحوم دس ھزار روپیہ سال مقرر ھوئے ۔ جو انہوں نے نہ دئے مگر تین ھزار روپیہ سال ۔ اس میں سے خاص میری ذات کا حصہ ساڑھے سات سو روپیہ سال ۔ میں نے سرکار انگریزی میں یہ غبن ظاھر کیا ۔ کولبرک صاحب بہادر ریزیڈنٹ دھلی اور اسٹرلنگ صاحب بہادر سیکریٹری گورنمنٹ کلکتہ متفق ھوئے میرا حق دلانے پر ۔ ریذیڈنٹ معزول ھوئے ، سیکریٹری

صاحب بمرگ ناگاہ مر گئے ۔ بعد ایک زمانہ کے بادشاہ دھلی نے پچاس روپیہ مہینہ مقرر کیا ۔ اس کے ولیعہد نے چار سو سال ۔ولیعہد اس تقرر کے دو سال بعد مر گئے ۔ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے برصلئہ مدح گستری پانچ سو روپیہ سال مقرر ھوئے ۔ وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جئے ۔ یعنی اگرچہ جیتے رہے مگر سلطنت جاتی رھی اور تباھی سلطنت دو ھی برس میں ھوئی۔ دھلی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی ۔ سات برس مجکو روٹی دے کر بگڑی ۔ ایسے طالع مربی کش اور محسن سوز کہاں پیدا ھوئے ھیں ۔ ۱۸۳۰ء میں کلکتہ گیا

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ھمنشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ھائے ھائے
وہ سبزہ زار ھائے مطرا کہ ھے غضب
وہ نازنین بتان خود آرا کہ ھائے ھائے

نواب گورنر جنرل بہادر سے ملنے کی درخواست کی میری ریاست کا حال معلوم کیا گیا۔ سات پارچہ جیغہ، سرپیچ، مالائے مروارید بہ تین رقم کا خلعت ملا۔

میرا ایک قطعہ ھے کہ وہ میں نے کلکتہ میں کہا تھا ۔ مولوی کرم حسین میرےایک دوست تھے۔ انہوں نے ایک مجلس میں چکنی ڈلی بہت پاکیزہ اپنے کف دست پر رکھ کر کہا کہ اس کی کچھ تشبیہات نظم کیجئے۔ میں نے وھاں بیٹھے بیٹھے نو دس اشعار کا قطعہ لکھ کر ان کو دیا۔ اور صلہ میں وہ ڈلی ان سے لے لی ۔ بیس بائیس پھبتیاں ھیں ۔ اشعار کب یاد آتے ھیں ۔ آخر کی بیت ھے :

بندہ پرور کے کف دست کو دل کیجئے فرض
اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

ایک شعر بنگالی زبان کا میں ضیافت طبع احباب کے لئے ارمغان لایا۔

تم کہتے تھے رات میں آئیں گے سو آئے نہیں
قبلہ بندہ رات بھر اس غم سے کچھ کھائے نہیں

بادشاہ دھلی نے ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو مجھے نوکر رکھا اور خطاب دیا ۔ اور خدمت تاریخ نگاری سلاطین تیمور یہ مجھے تفویض کی تو میں نے ایک غزل طرز تازہ پر لکھی ۔ ؎

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

جب حضور میں حاضر ہوتا تو اکثر بادشاہ مجھ سے ریختہ طلب کرتے۔ سو وہ پڑھی ہوئی غزلیں کیا پڑھتا ۔ نئی غزل کہہ کر لے جاتا۔ ایک صاحب شاہزادگان تیموریہ میں سے لکھنؤ سے ایک زمین لائے حضور نےخود بھی غزل کہی اور مجھے بھی حکم دیا سو میں حکم بجا لایا اور یہ غزل کہی ۔

سب کہاں کچھ لالہؑ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

بھائی خدا کے واسطے داد دینا اگر ریختہ یہ ھے تو میرو میرزا کیا کہتے تھے۔ اور اگر وہ ریختہ تھا تو پھر یہ کیا ھے ۔

اکثر ایسا ھوتا ھے کہ لوگ اور کی غزل میرے نام پر پڑھ دیتے ھیں۔ چنانچہ ایک صاحب نے مجھے آگرہ سے لکھا ۔ کہ یہ غزل مجھے بھیج دیجیے "اسد اور لینے کےدینے پڑھے ھیں ،، میں نے کہا لاحول ولا قوۃ "اگر یہ میرا کلام ھے تو مجھ پر لعنت ھے ۔ اسی طرح ایک صاحب نے میرے سامنے یہ مطلع پڑھا :

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی
میرے شیر شاباش رحمت خدا کی

میں نے عرض کیا کہ صاحب۔ جس بزرگ کا یہ مطلع ھے اس پر بقول اس کے رحمت خدا کی اور اگر میرا ہو تو مجھ پر لعنت ۔ اسد اور شیر، بت اور خدا میری طرز گفتار نہیں ۔ بات یہ ھے کہ ایک شخص میر امانی اسد ھو گزرے ھیں اور یہ غزل ان کے کلام معجز نظام میں سے ھے۔ اور تزکروں میں مرقوم ھے ۔ میں نے تو کوئی دو چار برس اسد تخلص رکھا ورنہ غالب ھی لکھتا رہا ھوں ۔

بادشاہ نے قلعہ میں مشاعرہ مقرر کیا تھا ۔ ہر مہینہ میں دو بار مشاعرہ ہوتا تھا پندرھویں کو اور انتیسویں کو ۔ حضور فارسی کا ایک مصرع اور ریختہ کا مصرع طرح کرتے (ایک بار) ریختہ کا مصرعہ یہ تھا،، خمار عشق ھمیں کس قدر ھے کیا کہئے،، میں نے ایک غزل ریختہ موافق طرح اور دوسرا ریختہ اس طرح میں سے ایک صورت نکال کر لکھا ۔

کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہئے
تم ھی کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہئے

دریا میرے آگے ، صحرا میرے آگے ، بھی قلعہ مبارک کی غزل ھے۔

بازیچۂ اطفال ھے دنیا مرے آگے
ہوتا ھے شب و روز تماشا مرے آگے

داد دینا کہ ریختہ اگر پایہ سحریا اعجاز کو پہنچے تو اس کی صورت بھی ہو گی یا کچھ اور شکل ۔

اس فلک کج رفتار کا برا ہو ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ ملک و مال جاہ و جلال کچھ نہیں رکھتے تھے۔ ایک گوشہ وتوشہ تھا۔ چند مفلس و بے نوا ایک جگہ فراہم ہو کر ہنس بول لیا کرتے تھے :

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک
اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا

مئی ۱۸۵۷ء دوپہر دن چڑھے وہ فوج باغی میرٹھ سے دلی آئی تھی یا قہر الہی کا پے بہ پے نزول ہوا تھا ۔ بقدر خصوصیت دلی ممتاز تھا ورنہ سرتا سر قلمرو ہند میں فتنہ وبلا کا دروازہ باز تھا ۔

پانچ لشکروں کا حملہ پے بہ پے اس شہر میں ہوا ۔ پہلا باغیوں کا لشکر، اس میں شہر کا اعتبار لٹا۔ دوسرا لشکر خاکیوں کا اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکیں وآسمان و زمیں و آثار ہستی سراسر لٹ گئے ۔ تیسرا

لشکر کال کا اس میں ہزارہا آدمی بھوکے مر گئے - چوتھا لشکر ہیضے کا - اس میں بہت سے پٹ بھرے مرے - پانچواں لشکر تپ کا اس میں تاب و طاقت عموماً لٹ گئی - مرے آدمی کم - لیکن جس کو تپ آئی اس نے اعضاء میں طاقت نہ پائی۔

ہندوستان سایہ' گل پائے تخت تھا
جاہو جلال عہد وصال بتاں نہ پوچھ
ہر داغ تازہ یک دل صد داغ انتظار
عرض فضائے سینہ' درد امتحاں نہ پوچھ
کہتا تھا کل یہ محرم راز اپنے سے کہ آہ
درد جدائی اسداللہ خاں نہ پوچھ

میرا حال سوا میرے خدا کے اور کوئی نہیں جانتا - آدمی کثرت غم سے سودائی ہوجاتے ہیں - اگر اس ہجوم غم میں میری قوت متفکرہ میں بھی فرق آگیا ہے - بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے - پوچھو کہ غم کیا ہے غم مرگ ، غم فراق ، غم رزق ، غم عزت - یہ کوئی نہ سمجھے میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتاہوں - جو غم مجھ کو ہے اس کا بیاں تو معلوم مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں کہ انگریزوں کی قوم میں جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھوں قتل ہوئے ، ان میں میرا کوئی امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق ، کوئی میرا دوست تھا اور کوئی یار ، کوئی میرا شاگرد - ہندوستانیوں میں کچھ دوست کچھ عزیز ، کچھ شاگرد ، کچھ معشوق سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے- ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے - جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کی زیست کیوں کر نہ دشوار ہو - ہائے اتنے یار مرے کہ جو اب میں مرونگا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا - اناللہ و اناالیہ راجعون -

ایک جنم تھا کہ جس میں طرح طرح کے معاملات مہرو محبت درپیش آئے - شعر کے دیوان جمع کئے - ناگاہ وہ زمانہ نہ رہا نہ وہ اختلاط نہ وہ انبساط - بعد چند مدت کے دوسرا جنم ہم کو ملا - اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہ پہلے جنم کے ہے - میں جس شہر میں

رهتا هوں اس کا نام دهلی هے اور اس محله کا نام بلیماران کا محله هے ۔ لیکن ایک دوست بهی اس جنم کے دوستوں میں نهیں پایا جاتا ۔ وهی بالا خانه هے اور وهی میں هوں ۔ سیڑهیوں پر نگاه هے که وه میر مهدی آئے وه میر سرفراز حسین آئے وه یوسف مرزا آئے وه میرن آئے وه یوسف علی خان آئے ۔ مرے هوؤں کا نام نهیں لیتا ۔ بچهڑوں میں سے کچه گئے هیں ۔ الله الله هزاروں کا ماتم دار هوں، میں مرونگا تو مجهے کون روئے گا ۔

وه دهلی نهیں جس میں سات برس کے سن سے آتا جاتا تها ۔ وه دهلی نهیں جس میں اکیاون برس سے مقیم تها ۔ بڑے بڑے نامی بازار خاص بازار، اردو بازار اور خانم کا بازار که هر ایک بجائے خود ایکه قصبه تها اب پته بهی نهیں هے که کهاں تهے ۔ صاحبان امکنه و دوکانین نهیں بتا سکتے که همارا مکان کهاں تها اور هماری دوکان کهاں تهی ۔

غدر میں میرا گهر نهیں لٹا مگر میرا کلام کیا نظم کیا نثر کیا اردو کیا فارسی میرے پاس کب تها که نه لٹتا ۔ ضیاءالدین خان جاگیردار لوهارو میرے سلبی بهائی اور شاگرد رشید اور ناصر حسین مرزا صاحب هندی و فارسی نظم ونثر کے مسودات مجه سے لیکر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تهے سو ان دونوں کے گهر جهاڑو پهر گئی ۔ نه کتاب رهی نه اسباب رها ۔ نواب ضیاءالدین کا کتب خانه بیس هزار کی مالیت کا رها هوگا، لٹ گیا ایک ورق نه رها ۔ اس میں وه مجموعه هائے پریشان بهی غارت هوئے ۔ ایک دن ایک فقیر خوش الحان بهی تها اور زمزمه پرداز بهی ۔ ایک غزل میری کهیں سے لکهوا لایا ۔ یقین جانو مجهه کو رونا آیا ۔

بعد غدر بجرم مصاحبت بهادرشاه دربار و خلعت دونوں بند هو گئے ۔ (سکه کا وارتو) مجه پر ایسا چلا جیسے کرئی چهره یا گراب ۔ اکتوبر کی ساتویں یا آٹهویں تاریخ ۱۸۳۷ء میں بهادر شاه تخت پر بیٹهے ۔ ذوق نے اس مهینے میں یا دو ایک مهینه بعد دو سکے کهه کر گزارے ۔ بادشاه نے پسند کئے ۔ مولوی محمد باقر ذوق کے مقربین میں سے تهے ۔ انهوں

نے ''دھلی اردو اخبار،، میں دونوں سکے چھاپے۔ اس کے علاوہ وہ لوگ موجود تھے جنھوں نے اس زمانہ میں مرشدآباد اور کلکتہ میں یہ سکے سنے اور ان کو یاد کیا۔ یہ دونوں سکے سرکار کے نزدیک میرے کہے اور گزارے ثابت ہوئے۔ میں نے ہر چند قلمرو ھند میں ''دھلی اردو اخبار،، ڈھونڈا کہیں ھاتھ نہ آیا۔ یہ دھبہ مجھ پر رھا۔ پینشن بھی گیا اور ریاست کا نام و نشان خلعتو دربار بھی مٹا۔

میں نے سکہ نہیں کہا اگر کہا تو اپنی جان و حرمت بچانے کو کہا یہ کیا گناہ ھے اور اگر گناہ تھا تو کیا ایسا سنگین کہ ملکہ کا اشتہار (ی) معافی بھی اسے مٹا نہ سکا۔ سبحان اللہ گولہ انداز کا بارود بنانا، توپیں لگانا اور بینک گھر اور میگزین کو لوٹنا معاف ھو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ھوں۔ ھاں صاحب گولہ انداز کا بہنوئی مدد گار تھا اور شاعر کا سالا بھی جانبدار نہیں۔

تمام عمر میں ایک دن شراب نہ پی ھو تو کافر اور ایک دفعہ نماز پڑھی ھو تو گنہگار۔ نہیں جانتا کہ سرکار نے کسں طرع مجھے باغی مسلمانوں مں شمار کیا۔

میری بریت کی درخواست گزری۔ تحقیقات ھوتی رھی۔ تین برس بعد پنڈ چھوٹا۔ میرا پینشن کھلا۔ چڑھا ھوا روپیہ دام دام ملا۔ آئندہ کو بے کم و کاست جاری ھوا۔ مگر لاٹ صاحب کا دربار و خلعت جو مقرر تھا مسدود ھو گیا۔ یہاں تک کہ صاحب سکٹر بھی مجھ سے نہ ملے اور کہلا بھیجا کہ ''غذر کے دنوں میں تم باغیوں کی خوشامد کرتے تھے۔ اب ھم سے ملنا کیوں مانگتے ھو۔ گورنمنٹ کو تم سے ملاقات کبھی منظور نہیں،،۔ عالم نظروں میں تیر و تار ھو گیا۔ یہ جواب پیام نومیدی جاوید تھا۔ نہ دربار نہ خلعت نہ پنشن انا اللہ واناالیہ راجعون۔ کوئی خیرخواھی نہیں کی جو نئے انعام کا مستحق ھوتا۔ لیکن کوئی بے وفائی بھی سرزد نہیں ھوئی جو دستور قدیم کو برھم مارتا۔

فردوس مکاں نواب یوسف علی خاں والیٔ رام پور نے غم خواری و تفقد و درویش نوازی کو اس پایہ کو پہنچایا کہ شاھان عجم میں سلطان

سنجر نے اور شاہان ہند میں شاہجہان نے ملازموں کی اتنی پرورش و نوازش کی ہوگی - ۱۸۵۷ء میں نواب یوسف علی خاں میرے شاگرد ہوئے۔ ناظم ان کو تخلص دیا گیا - بیس پچیس غزلیں اردو کی بھیجنے میں اصلاح دے کر بھیج دیتا - گاہ گاہ کچھ روپیہ ادھر سے آتا تھا - قلعہ کی تنخواہ جاری انگریزی پنشن کھلا ہوا ان کے عطایا فتوحات گاہ گاہ گنے جاتے۔ فتنہ فساد کے دنوں میں قلعہ کی آمد مفقود ، انگریزی پنشن مسدود، یہ بزرگوار سو روپیہ مہینہ ماہ بماہ بسبیل ہنڈی بجھواتے تھے۔ اس ماہانہ کے علاوہ کبھی دو سو کبھی ڈھائی سو بھیجتے تھے۔ تب میری اور میرے متوسلین کی زیست ہوئی خدا سے بھی توقع نہ تھی مخلوق کا ذکر کیا۔ آپ اپنا تماشائی بن گیا تھا۔ رنج و غم سے خوش ہوتا تھا۔ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر متصور کیا۔ جب دکھ مجھے پہنچتا کہتا غالب کے اک اور جوتی لگی - بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تو قرض داروں کو جواب دے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ غالب کیا مرا بڑا ملحد مرا بڑا کافر مرا ہم نے از راہ تعظیم جیسا کہ بادشاہوں کو بعد ان کے ''جنت آرام گاہ،، اور '' فردوس نشین ،، خطاب دیتے ہیں۔ چونکہ اپنے کو بادشاہ قلمرو سخن جانتا تھا ''بسقرمقر ،، اور ''بادیہ زاویہ،، خطاب تجویز کر رکھا ہے۔

لے نجم الدولہ بہادر - ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ۔ ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے - میں پوچھ رہا ہوں - اجی حضرت نواب صاحب - آپ سلجوقی و افراسیابی ہیں - یہ کیا بیعزتی ہو رہی ہے کچھ تو اکسو کچھ تو بولو ،،۔ بولے کیا بے حیا بے غیرت - کوٹھی سے شراب - گندھی سے گلاب ، بزاز سے کپڑا میوہ فروش سے آم صراف سے دام قرض لئے جاتا ہے یہ بھی سوچا ہوتا کہاں سے دونگا۔

اب وہ زمانہ نہیں کہ ادھر متھرا داس سے قرض لیا۔ ادھر درباری مل کو جا مارا - ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی لوٹ ماری - ہر شخص کے پاس تمسک مہری موجود ، شہد لگاؤ اور چاٹو نہ مول لو نہ سود۔

اب میں اور باسٹھ روپیہ آٹھ آنے کلکٹری کے، سو روپیہ رامپور کے ۔ قرض دینے والا ایک میرا مختار ۔ وہ سود ماہ بماہ لینا چاہے ۔ مول میں قسط اس کو دینا پڑے ۔ انکم ٹیکس جدا بی بی جدا بچے جدا شاگرد پیشہ جدا آمد وہی ایکہ سو باسٹھ ۔

دو قسم کی انگریزی شراب ایک تو کاسٹلین اور دوسری اولڈ ٹام میں ہمیشہ پیا کرتا تھا ۔ اور یہ دونوں (غدر سے) پہلے بیس چوبیس روپیہ درجن آتی تھی لیکن اب پچاس ساٹھ روپیہ درجن ہو گئی ۔ یہ گڑچھال کی شراب میں پیتا نہیں تھا ۔ یہ مجھے نقصان کرتی تھی اور مجھے اس سے نفرت تھی۔ تنگ آگیا گزارہ مشکل ہو گیا ۔ روز مرہ کا کام بند رہنے لگا ۔ سوچا کیا کروں کہاں سے گنجائش نکالوں قہر درویش بجان درویش صبح کی تبرید متروک ، چاشت کا گوشت آدھا۔ شراب و گلاب موقوف اب بیس یا بائیس روپیہ مہینہ بچا۔ روز مرہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا ۔ تبرید و شراب کب تک نہ پیو گے ۔ کہا گیا "جب تک وہ نہ پلائیں گے"۔ پوچھا "نہ پیو گے تو کس طرح جیوگے"۔ جواب دیا کہ "جس طرح وہ جلائیں گے ۔"

بارے مہینہ پورا نہ گزرا تھا کہ رامپور سے علاوہ مقرری کے اور روپیہ آگیا ۔ قرض مقسط ادا ہو گیا ۔ متفرق رہا خیر رہو ۔ صبح کی تبرید رات کی شراب جاری ہوگئی۔ گوشت پورا آنے لگا ۔

اے بے خبر ز لذت شرب مدام ما۔ دیکھا ہم کو یوں پلاتے ہیں۔ میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں۔ شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں ۔ اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا بلکہ میں دوزخ کا ایندھن بنوں گا۔ اور دوزخ کی آنچ تیز کروں گا ۔ تاکہ مشرکین رسالت مصطفوی و امامت مرتضوی اس میں جلیں ۔

پہلی نومبر ۱۸۵۸ء کو اشتہار عام ہو گیا کہ اب قلمرو ہند میں عمل ملکہ معظمہ عالی مقام کا ہو گیا ہے۔ میں پہلے ہی سے مداحوں میں اپنا

نام لکھوا چکا تھا۔ اور ملکہؑ دارا دربان کے وزرا کے دو سرٹیفکٹ حاصل کر چکا تھا۔ پہلی نومبر کو حسب الحکم کوچہ و بازار میں روشنی ہوئی۔ فقیر نے بھی اس تہید ستی میں کہ اٹھارہ مہینے سے پنشن نہیں پایا تھا اپنے مکان پر روشنی کی ۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ٹھیکہ ٹوٹ جانا اور قلمرو ہند کا بادشاھی عمل میں آنا سنا گیا۔ نواب گورنر جنرل لارڈ کیننگ بہادر کو ملکہ معظمہ نے فرزند ارجمند کا خطاب دیا اور اپنی طرف سے نائب اور ہندوستان کا حاکم مقرر کیا ۔

کبھی کسی کے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما تھا ۔ کسی کے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپیؑ تھا اور دیدہ وراس کی ستائش کیا کرتے تھےاب جب کبھی وہ اپنا رنگ یاد آتا ھے تو چھاتی پر سانپ سا لوٹ جاتا ھے ۔ اب داڑھی مونچھہ میں سفید بال آگئے ۔ اس سے بڑھکر یہ ھوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ۔ ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی ۔ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی عام ھے ۔ ملا ، حافظ، بساطی ، نیچا بند ، دھوبی سقہ ، بھٹیارہ، جلاھا کنجڑا ۔ منہ پر داڑھی سر پر بال ۔ میں نے جس دن داڑھی رکھی سر منڈوا دیا ۔

میں اب انتہائے عمر ناپائیدار کو پہنچ کر آفتاب لب بام ہوں ۔ ھجوم امراض جسمانی و آلام روحانی سے زندہ درگور ھوں ۔ نظم و نثر کی قلمرو کا انتظام ایزد دانا و توانا کی عنایت و اعانت سے خوب ھو چکا ، اس نے چاھا تو قیامت تک میرا نام و نشان باقی رھے گا ۔

ابتدائےسن تمیز میں اردو زبان میں سخن سرائی کی ھے ۔ پھر اوسط عمر میں بادشاہ دھلی کا نوکر ھوکر اس روش پر خامہ فرسائی کی ھے ۔ نظم و نثر کا عاشق و مائل ھوں ۔ ھندوستان میں رھتا ھوں لیکن تیغ اصفہانی کا گھائل ھوں۔ جہاں تک زور چل سکا فارسی زبان میں بہت بکا اب نہ فارسی کی فکر نہ اردو کا ذکر ۔

ابتدائے فن سخن میں بیدل اور اسیر کے طرز پر ریختہ لکھا ۔ چنانچہ

ایک غزل کا مقطع ہے ۔

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا　　　اسداللہ خاں قیامت ہے

پندرہ برس کی عمر سے پچپن برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا ۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو رد کیا ۔ اوراق یک قلم چاک کر دئے ۔ دس بارہ شعر واسطے نمونہ کے دیوان حال میں رہنے دئے ۔

ایک اردو کا دیوان ہزار بارہ سو بیت کا ، تین رسالے نثر کے ، یہ پانچ نسخے مرتب ہو گئے۔ اب اور کیا ہوگا ۔ مجھے اپنے ایمان کی قسم میں نے اپنی نظم و نثر کی داد بہ اندازہ بائست نہیں پائی ۔ آپ ہی کہا اور آپ ہی سمجھا ۔ مدح کا صلہ نہ ملا غزل کی داد نہ پائی ۔ ہرزہ گوئی میں عمر گنوائی ۔ بقول طالب آملی علیہ رحمتہ

لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی　　　دھن بر چہرہ زخمے بود، بہ شد

سترا بہترا اردو میں ترجمہ پیر خرف ہے ۔ میری تہتر برس کی عمر ہے ۔ بس میں یہی اخراف ہوا ۔ حافظہ گویا کبھی تھا ہی نہیں ۔ سامع باطل بہت دن سے تھا ۔ رفتہ رفتہ وہ بھی حافظہ کی مانند معدوم ہو گیا ۔ اب یہ حال ہے کہ جو دوست آتے ہیں رسمی پرسش مزاج سے بڑھ کر جو بات ہوتی ہے وہ کاغذ پر لکھہ دیتے ہیں ۔ غذا مفقود ہے ۔ صبح کو قند اور شیرہ بادام مقشر دوپہر کو گوشت کا پانی سر شام تلے ہوئے چار کباب سوتے وقت پانچ روپیہ بھر شراب اور اسی قدر گلاب ۔ خرف ہوں پوچ ہوں فاسق ہوں روسیاہ ہوں۔ یہ شعر میر تقی میر کا میرے حسب حال ہے ۔

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم
القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

''اسدالاخبار،، اور ''اشرف الاخبار،، والے کہ یہیں کے رہنے والے ہیں

اور مجھ سے ملتے رہتے ہیں - سو ان کے اخبار میں اپنا مفصل حال چھپوا دیا - اس میں میں نے عذر چاہا خطوں کے جواب سے اور اشعار کی اصلاح سے - اس پر کسی نے عمل نہ کیا - اب تک خطوط کے جواب کا تقاضا اور اشعار واسطے اصلاحوں کے چلے آتے ہیں اور میں شرمندہ ہوتا ہوں -

پہلے مقدار غذا کی تولوں پر منحصر تھی - اب ماشوں پر ہے - ہر روز مرگ نو کا مزہ چکھتا ہوں حیران ہوں کہ کوئی صورت زیست کی نہیں پھر کیوں جیتا ہوں، روح اب میرے جسم میں اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر قفس میں- کوئی شغل، کوئی اختلاط، کوئی مجمع پسند نہیں آتا، کتاب سے نفرت، جسم سے نفرت، روح سے نفرت، جو کچھ لکھا ہے بلا مبالغہ بیان واقعہ ہے -

خرم آن روز کزیں منزل ویراں بگذرم

آگے میں لیٹے لیٹے کچھ لکھ لیتا تھا - اب وہ بھی نہیں ہو سکتا - ہاتھوں میں رعشہ ، آنکھوں میں ضعف بصر، ناتوانی زور پر ہے - بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے ضعف و سستی گرانی و گران جانی، رکاب میں پاؤں ہے نہ باگ پر ہاتھ ہے - اپنا مصرع چپکے چپکے دھراتا ہوں -

اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

اب مرگ ناگہاں کہاں رہی- اسباب و آثار جمع ہیں - ہائے الہی بخشش معروف کا کیا مصرع ہے -

آہ جی جاؤں نکل جائے اگر جان کہیں

مرزا غالب کی تصویریں

مرزا غالب کی جو تصویریں اب تک شائع ہوتی رہی ہیں ان میں معاصرانہ تصویریں بھی ہیں اور بعد کی بنائی ہوئی اور مصنوعی بھی۔ یہ بات حیرت کن معلوم ہوگی کہ لیکن یہ واقعہ ہے کہ چند تصویروں کے علاوہ بیشتر شائع شدہ تصویریں معاصرانہ نہیں ۔ اور نہ وہ مستند ہیں۔ اب تک راقم کو مرزا کی چار تصویروں کا پتہ چلا ہے جو معاصرانہ ہیں اور جن کی اصلیت مسلم ہے ۔

۱۔ تصویر مندرجہ کلیات غالب

مرزا کے فارسی کلام کا مجموعہ ان کی زندگی میں دوبار شائع ہوا ایک سعی انقلاب سن ستاون سے بارہ تیرہ سال(۱) پہلے دیوان فارسی کے نام سے نواب ضیاالدین احمد خاں کی تصحیح کے ساتھ مطبع دارالسلام دھلی میں چھپا تھا ۔ یہ اشاعت اس قدر نایاب ہے کہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب کے کتب خانے کے علاوہ اس کے وجود کا کہیں اور اب تک پتہ نہیں ۔ اس اشاعت کا ایک نسخہ خوش قسمتی سے راقم کے پاس بھی موجود ہے۔

اس اشاعت کے بعد مرزا نے اپنا کلیات مرتب کیا اور اس میں بعد کا کلام بھی داخل کر لیا ۔ نول کشور پریس میں جون ۱۸۶۳ء سے پہلے چھپ چکا تھا ۔ اس اشاعت میں مرزا کے زائچہ ولادت کے علاوہ ایک قلمی تصویر

---

(۱) سال طباعت ۱۸۴۵ء بروایت جناب غلام رسول مہر ''غالب،، ۴۰۹ اشاعت سوم ۔ مئی ۱۸۴۷ء بقول جناب امتیاز علی عرشی علی گڑھ میگزین 'غالب نمبر، ۱۱۶ راقم کا نسخہ دیوان فارسی ناقص ہے اس لئے اس وقت سال طباعت کی تعین سے قاصر ہوں ۔

بھی لیتھو پر چھاپی گئی ہے - جس میں وہ درباری لباس میں پیچ دار پگڑی باندھے کھڑے ہیں ہاتھ میں ایک تحریر ہے اور انداز مجموعی ایسا ہے جیسے وہ دربار میں اپنا قصیدہ سنا رہے ہوں - یہ کلیات مرزا کی زندگی میں شائع ہوا تھا اور وہ اس کی اشاعت کے ہر ہر مرحلے—کتابت، طباعت، تصحیح، جزو بندی سے ذاتی طور پر واقف رہے تھے- اس لئے اس تصویر کے مصنوعی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا - بہت ممکن ہے یہ تصویر خود انہوں نے فراہم کی ہو- یہ بھی ممکن ہے کہ نول کشور یا مطبع کے کسی ایسے آدمی کے پاس جس سے مرزا کے تعلقات ہوں خود انہوں نے بھیجی ہو-

ان کے موجودہ خطوط میں اس تصویر کا کہیں ذکر نہیں ملتا- اگر مرزا کے وہ سارے خطوط مل جائیں جو انہوں نے منشی نول کشور اور مطبع والوں کے نام لکھے تھے تو اس میں اس تصویر کا ذکر ضرور مل جائے گا - بہر کیف اس تصویر کے اصل ہونے میں کلام نہیں - مرزا کی صحت پسندی کا یہ حال تھا کہ بعض مرتبہ ایک لفظ کے غلط ہو جانے پر وہ واویلا اور ہنگامہ بپا کر دیتے تھے اور کتاب کے فرمے تک بدلوانے کو تیار ہو جاتے تھے - تصویر اگر ان کی نہ ہوتی یا ذرا بھی ان سے مختلف ہوتی تو وہ تصویر مطبوعہ کے سارے اوراق ضائع کرا دینے میں ذرا بھی پس و پیش نہ کرتے -

یہ تصویر مرزا کی وفات سے ۶ سال پہلے شائع ہوئی تھی- یہ معلوم نہیں کب بنوائی گئی تھی - لیکن اس کا زمانہ ۱۸۶۰ء کے لگ بھگ سمجھنا چاہئے -

یہ تصویر سب سے پہلی مرتبہ کلیات غالب (نول کشور ۱۸۶۳ء) میں ''مکاتیب غالب،، (مرتبہ عرشی صاحب) کی اشاعت اول ۱۹۳۷ ،علی گڑھ میگزین - ''مرزا غالب نمبر،، ۱۹۴۹ء اور اب وہیں سے ''آج کل،، میں شائع کی گئی ہے -

۲- تصویر قلعہ معلی -

مرزا نے اپنی ایک تصویر غالباً مرزا فخرو یا بہادر شاہ کو نذر کی تھی اور جو قلعہ معلی کی زینت تھی - اس کا ذکر ان کے خطوں میں ملتا

ہے۔ سیاح نے مرزا سے ان کی تصویر مانگی تھی اس کے جواب میں لکھتے ہیں۔ ''صاحب اس بڑھاپے میں تصویر کے پردے میں کھنچا کھنچا پھروں۔ دیکھو ایک جگہ میری تصویر بادشاہ کے دربار میں کھنچی ہوئی ہے۔ اگر ہاتھ آجائے گی تو وہ ورق بھیج دوں گا(۱) ۔ سیاح بہت دنوں تک تصویر کا مطالبہ کرتے رہے اور کم از کم ۲۵ اگست ۶۷ء تک انھوں نے سیاح کو تصویر نہیں بھیجی تھی ۔ گو قرائن موید ہیں کہ ۱۷ اگست ۶۸ء تک انہیں مرزا کی تصویر مل چکی ہوگی ۔ غالب نے میر ابراہیم علی خاں کو اپنی تصویر سیاح ہی کی معرفت بھیجی تھی ۔ اس کا امکان بہت کم ہے کہ انہیں تو نہ بھیجی ہو اور ان کی وساطت سے میر ابراہیم علی خاں کو بھیجی ہو ۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ انہیں کون سی تصویر بھیجی تھی ۔ قلعہ والی تصویر تو یہیں رہی ۔

بہادر شاہ رحمتہ اللہ علیہ کا دور ختم ہو جانے کے بعد جب قلعہ میں انگریزوں نے اپنی بساط سیاست بچھائی اور ان کے عہد میں قلعہ کے ایک حصے کو عجائب خانہ بنایا گیا جس میں بہادر شاہ کے ملبوسات ، اسلحہ، ذخیرۂ کتب اور دوسرے نوادر کے ساتھ ساتھ مرزا غالب کی وہ تصویر آج بھی عجائب خانہ کی زینت ہے اور بقول شیخ محمد اکرام ''مرزا کی کسی تصویر سے ان کی رئیسانہ تمکنت، عقابی تیز نگہی اور بشرے کی ذہانت اس طرح نمایاں نہیں ہوتی جس اس طرح تصویر سے (۲) ،،

یہ تصویر سب سے پہلی مرتبہ مہیش پرشاد مرحوم نے اشتیاق علی صاحب سپرنٹنڈنٹ عجائب خانہ کی اجازت سے رسالہ اردو بابت ۱۹۲۹ء میں شائع کی ۔ پھر شیخ محمد اکرام نے 'غالب نامہ، کی اشاعت ۳۶ء میں شائع کی۔ اب بھی 'آثار غالب، میں شریک اشاعت ہے ۔ انہیں کی توجہ سے وقار عظیم صاحب نے فروری ۴۹ء کے ''ماہ نو،، میں اس کا مکبر شائع کیا ۔ یہ تصویر ۱۸۶۶ء سے پہلے کی ہے۔

---

(۱) اردوئے ــــ اردوئے معلی مطبع شیخ مبارک علی لاہور- ۱۹۳۰-۱۷

(۲) آثار غالب ۸۱

۳- تصویر کتب خانہ حبیب گنج

یہ تصویر مرزا کے آخری زمانے کی ہے - جو کسی فنکار نے ۱۸۸۳ء میں مختلف رنگوں سے بنائی ہے- یہ تصویر نمبر ۲ سے بہت مشابہ ہے- خود مرزا کے بیٹھنے ، کا انداز حقے کی نے اور دوسری چیزوں کا انداز بہت ملتا جلتا ہے- تصویر کی پشت پر دو اندراجات ہیں ایک قدیم دوسرا جدید - قدیم عبارت یہ ہے ''شبیہ دل پذیر مرزا اسد اللہ خان غالب دہلوی عرف مرزا نوشہ،، جدید اندراج نواب صدر یار جنگ کا ہے- جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصویر دہلی میں پچاس روپے میں خریدی گئی تھی -

اسے پہلی مرتبہ مالک رام صاحب نے ''ذکر غالب،، اور ''سبد چین ،، (۱۹۳۸ء) میں اور رسا ھمدانی مرحوم نے ''نادر خطوط غالب،، لکھنو ۱۹۳۹ء میں شائع کیا - یہی تصویر مولوی عبید الرحمن خاں شروانی کی عنایت سے راقم نے علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر (۱۹۴۹ء) میں شائع کی اور اب '' آج کل،، میں شائع کی گئی ہے- ''نادر خطوط غالب،، پوری تصویر کا عکس ہے- جس میں پیشانی پر ان کا شعر ''غالب نام اورم الخ ،، بھی مندرج ہے- علی گڑھ میگزین میں حاشیے کے بیل بوٹے اور مندرجہ بالا شعر محذوف ہے- ''ذکر غالب،، اور ''سبد چین،، میں اور زیادہ اختصار اور کفایت شعاری کو راہ دی گئی ہے- صرف مرزا کی تصویر ہے- تصویر کی عقبی زمین اور آس پاس کا ماحول حذف کر دیا گیا ہے-

ان تینوں تصویروں کے مستند اور معاصرانہ ہونے کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ تینوں کے خدوخال ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے ہیں - خصوصاً آخری دو تصویروں میں تو بے حد مماثلت ہے- اصل تصویر میں بھی بہت حد تک اور ارد گرد کی فضا اور ماحول میں بھی -

۴- فوٹو

عکسی تصویر کا ذکر غالب کے یہاں ملتا ہے - سیاح کو ۵ ستمبر ۶۶ء کو لکھتے ہیں ''گوشہ نشین آدمی عکس کی تصویر اتارنے والے کو

کہاں ڈھونڈوں،،۔ لیکن معلوم ھوتا ھے کہ بعد میں انہوں نے نہیں تو ان کے احباب نے ایک عکس اتارنے والے کو ڈھونڈ نکالا ۔

''اکمل الاخبار،، ،، جس کے ایڈیٹر مرزا کے شاگرد بہاری لال مشتاق دھلوی اور مالک و سرپرست حکیم محمود خاں تھے، کی اشاعت ۲۸ ء مئی ٦۸ ھ میں مرزا کی ایک تصویر کا اشتہار ھے۔ جس سے مرزا کی اس عکسی تصویر پر بہت اچھی روشنی پڑتی ھے۔ اشتہار یہ ھے ۔

''شبیہ مبارک جناب معلی الالقاب نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں غالب بہادر نظام جنگ غالب مدظلہ العالی ،،

ناظرین والا تمکین اور نیز شاگردان ارادت آئین حضرت ممدوح الصدور کو مژدہ ھو کہ درین ولا حضرت ممدوح کی تصویریں فوٹو گراف کی ترکیب سے ایک شخص نے تیار کروا دی ھیں ۔ پس جس صاحب کو شبیہ مبارک لینی منظور ھو وہ دو روپیہ کے ٹکٹ بلف عنائت نامہ پیڈ لالہ بہاری لال کے نام اکمل المطابع دھلی میں بھیج دیں ۔ بہ صیغہ بیرنگ ان کی خدمت میں مرسل ھوگی ،،

یہ غالباً مرزا کی پہلی تصویر ھے جو مصور کے موقلم کی رھین منت نہیں بلکہ کیمرے کے ذریعے سے لی گئی ھے ۔ دوسری بات یہ ھے کہ اس اشتہار کی تاریخ ۲۸ مئی ٦۸ء ھے گویا مرزا کے انتقال سے ۸-۹ ماہ پہلے ۔ یہ زمانہ مرزا کی علالت اور انتہائی ضعف کا تھا ۔ ناممکن سا معلوم ھوتا ھے کہ بعد کو مرزا اس قابل رھے ھوں کہ اطمینان سے فوٹو کھنچوا سکیں ۔ اس لئے بہت ممکن ھے کہ یہ مرزا کی آخری تصویر ھو ۔

مرزا کی یہ تصویر عام ھے ۔ اور ان کی عام تصویروں میں یہی تصویر ھے جسے استناد کا درجہ حاصل ھے۔ مولانا ابوالکلام کا ارشاد (۱) ھے ۔ کہ میری نظر سے جو تین تصویریں غالب کی گزری ھیں ان میں غدر کے

---

(۱) ''غالب،، از جناب مہر ۔ اشاعت دوم

بعد کی ایک عکسی تصویر بھی ہے جس میں وہ کرسی پر بیٹھے ہیں ان کے بیان کے مطابق یہ فوٹو دو اور تصویروں کے ساتھ خواجہ حالی مرحوم نے منشی رحمتہ اللہ رعد کے پاس اس غرض سے بھیجا تھا کہ ان میں سے جو تصویر بہتر ہو اسکی نقل ''یادگار غالب،، کے لئے تیار کر لی جائے۔

مرزا کی یہی تصویر دیوان غالب نظامی ایڈیشن ''نکات غالب،، مرتبہ نظامی بدایونی، تاریخ ادب اردو مترجمہ مرزا عسکری (حصہ نظم) میں شائع ہوئی ہے۔

مرزا کا یہ اصل فوٹو کتب خانہ حبیب گنج میں موجود ہے۔ یہ فوٹو جدید نہیں ۔ اور اسکی قدامت دیکھہ کر یقین ہوتا ہے کہ ''اکمل الاخبار،، میں جس فوٹو کا اشتہار ہے یہ وہی ہے۔ اس تصویر اور مروجہ تصویروں میں یہ پتہ نہیں چلتا کہ مرزا کھڑے ہیں یا بیٹھے ہیں۔ یا نشست کا انداز کیا ہے۔ یہ تصویر جو پہلی مرتبہ پیش کی جارہی ہے اس میں صاف نمایاں ہے کہ وہ کرسی پر بیٹھے ہیں دونوں ھاتھ بھی نمایاں ہیں۔ انگرکھے کا دامن بھی صاف دکھائی دیتا ہے۔ گو تصویر کچھ ایسی دھندلی آئی ہے کہ دامن وغیرہ کچھ صاف نہیں ہے۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے لوگوں نے یہ حصہ اڑا دیا ۔

یہی فوٹو مرزا نے صاحبان مارھرہ میں کسی کو بھیجا ہے ۔ یہ عکسی تصویر اور جس کاغذ میں پیکٹ بنا کر انہوں نے بھیجا ہے وہ اٹاوہ میں محفوظ ہے ۔ اس کاغذ پر پتہ خود غالب کے قلم کا لکھا ھوا ہے ۔

۵۔ ایک اور فوٹو۔

مرزا کی ایک اور عکسی تصویر بہت رائج ہے ۔ اس تصویر کا زاویہ پہلے سے کچھ مختلف ہے۔ ٹوپی میں بھی کچھہ فرق ہے۔ عبا بہت قیمتی اور منقش ہے اسکے نقش و نگار بہت خوبصورت اور واضح ہیں ۔

مرزا کی ایک تصویر حسب روایت جناب خیر بھوروی سید عابد حسین صاحب ابر نے اپنے رسالہ ''معیار،، لکھنئو جنوری ۱۹۱۰ میں شائع کی

تھی جو انہیں نواب سید بہادر حسین انجم نیشا پوری سے ملی تھی۔
اور انہیں خواجہ قمر الدین خاں راقم نے جے پور سے بجھوا دی تھی۔
ان کا بیان ہے کہ یہ تصویر اس طرح کھینچی گئی تھی کہ بڑی مشکل سے
اٹھا کر بیٹھایا گیا تھا اور تصویر لی گئی تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد
تحریر فرماتے ھیں(۱) ''آخری فوٹو جو مرض موت میں لیا گیا تھا ایک آدمی نے
سہارا دے کر اٹھا دیا ہے اس حالت میں تصویر لی گئی ہے۔
یہ فوٹو اور تصویروں کے ساتھہ خواجہ حالی مرحوم نے منشی رحمتہ اللہ
رعد کے پاس اس غرض سے بھیج دئے تھے کہ ان میں سے جو تصویر بہتر ہو
اسکی نقل ''یادگار غالب،، کے لئے تیار کر لی جائے،،۔ منشی صاحب نے خود
مولانا ابوالکلام سے بیان کیا کہ میں نے بنیادی طور پر یہی آخری فوٹو
سامنے رکھا لیکن تخیل کا رخ اسطرف رہا کہ اس عالم سے چند برس پہلے
ناک نقشہ کیا رہا ہوگا۔ اس طرح ایک نیا چوکھٹا موقلم سے تیار
ہو گیا۔

خیال بلکہ یقین ہے کہ یہ دوسرے فوٹو کی بگڑی ہوئی (اچھی کی ہوئی)
شکل ہے۔ جس پر حالی کے زمانے سے لے کر اب تک کے مصوروں نے
اس قدر قلم کاری اور رنگ آمیزی کی ہے کہ تصویر اصلیت سے ہٹ گئی ہے۔
یہ تصویر معمولی ترمیموں کے ساتھ متعدد مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔
دیکھئے ''غالب،، از جناب مہر۔ اشاعت اول ۱۹۳۶ء۔ ''روح غالب،،
از سید محی الدین قادری زور صاحب ۱۹۳۹ء شرح کلام غالب از سرخوش
لاھوری اور علی گڑھ میگزین بابت ۴۸ء مرتبہ راقم(۲)۔

۶۔ جعلی تصوریں

ابھی جس تصویر کا ذکر ھوا اس کی یہ خصوصیت تھی کہ تصویر بنیادی
طور پر تو اصلی ہے لیکن بعد کے مصوروں کے قلم نے اسے اصلیت سے ہٹا
دیا ہے۔ اب ایسی دو تصویروں کا ذکر آئے گا جو سراسر فرضی ھیں۔

---

۱ غالب—ازجناب مہر ص۔ب

۲ غالب کی ایک قلمی تصویر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے پاس بھی ہے۔

۶—شرح کلام غالب مصنفہ عبدالباری آسی مرحوم اور نگار ''غالب نمبر،، میں مرزا کی جوانی کی جو تصویر شائع کی گئی ھے اسکی اصلیت نہیں اور قطعاً فرضی ھے ۔

۷—اس طرح وہ تصویر جس میں گاؤ تکیہ کے سہارے گھریلو لباس میں بیٹھے ہوئے کچھ لکھہ رھے ھیں کسی حال کے فنکار کے بحر تخیل کی ایک موج ھے اور بس۔

یہ تصویر تاریخ ادب اردو مترجمہ مرزا عسکری (حصہ نثر)(۱) آجکل بابت ۱۰ اگست ۱۹۴۹ء (۲) میں شائع ہوئی ھے۔ اور اس کی ایک نہایت بھونڈی نقل جس سے تصویر بالکل مسخ ھو گئی ھے 'ماہ نو، فروری ۵۰ء میں شائع کی گئی ھے۔

(۲)

خود مرزا نے کن کن لوگوں کو اپنی تصویریں بھیجی تھیں ذیل کی سطروں میں اس سوال کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ھے ۔

نواب کلب علی خاں

۲۷ مئی ۶۸ء کے عریضے میں لکھتے ھیں ''شوق قدم بوسی نے تنگ کیا جب دیکھا کسی طرح جا نہیں سکتا ناچار اپنا نقشہ اتروایا اور خدمت عالی میں روانہ کیا۔ جب تک کہ میں جیتا ھوں تب تک اس صورت میں حاضر رھوں گا (۳)،،۔

لیکن ۱۰ جون تک انہیں اس بات کا علم نہ ھو سکا کہ تصویر نواب صاحب کو ملی یا نہیں اسی تاریخ کو ایک خط میں لکھتے ھیں ''پیرو مرشد سابق کے عریضے کے ساتھہ میں نے اپنی تصویر حضور میں بھیجی ھے۔ اس کی رسید اس نوازش نامے میں مرقوم نہ تھی مجھکو یہ اندیشہ ھے کہ

---

۱ عمل حکیم

۲ عمل شیو—رسالہ آج کل کے آرٹسٹ

۳ مکاتیب غالب ۔ ۸۰ (اشاعت ششم ۱۹۴۹)

کہیں وہ لفافہ ڈاک میں تلف نہ ہو گیا ہو۔ اگر اسکی رسید سے شرف اطلاع پاؤں تو دل جمعی ہو جائے(۱) ۔

مرزا کے پہلے خط کے لفافے پر منشی سیل چند میر منشی کا حسب ذیل نوٹ ہے ''تصویر بعد ملاحظ سپرد سید مجاور علی صاحب شد۔ ۲ جون ۱۸٦۸ء ،،خود نواب صاحب نے مرزا کے دوسرے خط کا جواب ۷ جولائی کو دیا اور لکھا'' شبیہ آن مشفق وصول شادمانی‌آوردہ از فرط مجتا متصور شد(۲)،،۔

ظاہرا یہ تصویر ضائع ہو گئی ورنہ فاضل مرتب اسکے وجود کا ضرور ذکر کرتے اور پھر یہ کہ مکاتیب غالب کی پہلی اشاعت میں کلیات غالب کی تصویر کا چربہ نہ چھاپتے۔

شیو نرائین آرام

۱۰ جنوری ۱۸٦۲ء کو انہیں ایک خط میں لکھتے ھیں ''اس دیوان اور تصویر کا ذکر کیا ضرور ہے۔ رام پور سے وہ دیوان صرف تمہارے واسطے لکھوا کر لیا۔ دلی میں تصویر بہ ہزار جستجو بہم پہنچا کر مول لی اور دونوں چیزیں تم کو بھیج دیں۔ وہ تمہارا مال ہے ۔ چاہو اپنے پاس رکھو چاہو کسی کو دے ڈالو ۔ ۔ ۔ ۔تم نے دستنبو کی جدول اور جلد بنوا کے ہم کو بھی سوغات بھیجی۔ ہم نے اپنی تصویر اور اردو کا دیوان تم کو بھیجا(۳)۔،،

شہزادہ بشیر الدین۔

انہیں مرزا نے ۱٦ جون ٦۷ء سے پہلے اپنی ایک تصویر بھیجی تھی۔ جو ان تک نہ پہنچ سکی۔ مرزا بہت‌پریشان ہوئے۔ لکھتے ھیں ''خط پڑھ کر وہ حال طاری ہوا کہ اگر ننگا نہ ہوتا تو گریبان پھاڑ ڈالتا۔ اگر جان عزیز نہ ہوتی تو سر پھوڑتا اور کیونکر اس غم کی تاب لاتا کہ اپنے

---

(۱)—مکاتیب غالب ۸۱—(۲)—حواشی ۱۸۷۱—۳—اردوئے- ۲۸۵

کو کھنچوا کر بصورت تصویر آپکی خدمت میں بھیجا لفافہ انگریزی اقبال نشان شہاب الدین احمد خاں سے لکھوا کر بیرنگ ارسال کیا۔ اس فرمان میں اس لفافے کی رسید نہ پائی۔ ظاہر ڈاک پر ڈاکو گرے اور میرے پیکر بے روح کے ٹکڑے اڑا دئے۔ بے تاب ہو کر یہ عبارت حضرت کو بھیجی (۱)،،

کچھہ نہ معلوم ہو سکا کہ تصویر دیر ہی میں سہی آخر انہیں ملی یا نہیں۔

سید عالم علی خاں۔

سید عالم علی خان اور سید احمد حسن مودودی کو ایک مشترکہ خط میں ۱۷ جولائی ۶۸ء کو لکھتے ہیں ''بارے بہ صورت تصویر دونوں صاحبوں کی خدمت میں میرا سلام پہنچنا معلوم ہوا۔ اگرچہ اس صورت میں چلنا پھرنا خدمت بجا لانی نہیں ہو سکتی مگر خیر حضرت کے پیش نظر حاضر رہوں گا (۲)۔،،

سید احمد حسن مودودی

انہوں نے مرزا کو اپنی ایک تصویر بھیجی تھی۔ مرزا نے بھی اپنی ایک تصویر سیاح کی معرفت انہیں بھیج دی۔ ۱۷ اگست ۶۸ء کو ایک خط میں انہیں لکھتے ہیں۔ ''امسال فقیر نے جو اپنی خاکساری کا یعنی تصویر منشی میاں داد خاں سیاح کی معرفت نذر کی ہے، یقین ہے وہ پہنچی ہو گی (۳)،،۔

سید عالم علی خاں کے خط میں جس تصویر کا ذکر ہے وہ ظاہرا اس تصویر سے مختلف ہے جس کے متعلق غالب احمد حسن مودودی کو لکھ رہے ہیں۔ دونوں کو جداگانہ تصویریں بھیجی ہوں گی۔ مقدم الذکر کو تصویر ۱۷ جولائی سے پہلے مل چکی تھی جب کہ اس کے ایک

---

(۱) خطوط غالب۔ ۳۰۵

(۲) اردوئے : ۱۸۳۔ (۳)—اردوئے : ۱۷۷

ماہ بعد ۱۷ اگست تک غالب کو علم نہ تھا کہ جو تصویر انہوں نے مودودی کو بھیجی ھے وہ انہیں ملی یا نہیں۔

یکے از صاحبان مارہرہ۔

مارہرہ کے چودھری عبدالغفور سرور حضرت صاحب عالم اور مقبول عالم سے غالب کے کیا تعلقات تھے اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ چودھری صاحب اور حضرت صاحب عالم کے نام جو خطوط مرزا نے لکھے ھیں وہ تعداد میں اسقدر ھیں کہ اس پر عود ھندی کی پوری ایک فصل تیار ھو گئی ھے۔ صاحب عالم اور مرزا دونوں زندگی بھر ایک دوسرے سے ملاقات کی تمنا کرتے رھے لیکن کم از کم حضرت صاحب عالم نے مرزا کو نہیں تو انکی تصویر دیکھ کر اپنی حسرت پوری کر لی تھی۔

اٹاوہ کی لائبریری میں ابھی حال ھی میں اور کچھ کتابیں اور نوادر مارہرہ سے آئے ھیں۔ اس میں مرزا غالب کی ایک عکسی تصویر اور اسکا لفافہ بھی ھے جو انہوں نے صاحبان مارہرہ میں سے کسی (غالباً حضرت صاحب عالم) کو بھیجا تھا۔ لفافہ پر پتہ خود مرزا غالب کے قلم کا لکھا ھوا ھے۔

میاں داد خاں سیاح

سیاح غالب کے بڑے معتقدوں میں تھے اور انکے نام متعدد خطوط غالب نے سپرد قلم کئے ھیں ۔ میر غلام بابا خاں ، میر ابراھیم علی خاں، سید احمد حسن مودودی، سید عالم علی خاں سے غالب کے تعلقات کی استواری میں ان کا بڑا ھاتھ تھا۔ ان کے نام کے خطوط سے معلوم ھوتا ھے کہ وہ مسلسل کئی سال تک غالب سے تصویر مانگتے رھے ۔ مرزا بھی بھیجنے پر ھمیشہ مستعد نظر آئے لیکن کم از کم ۲۰ اگست ۱۸۶۷ء تک انہوں نے سیاح کو تصویر نہیں بھیجی تھی۔ لیکن سیاح کے اس اصرار کے باوجود انہوں نے تصویر نہ بھیجی ھو یہ مستبعد سا معلوم ھوتا ھے۔ خصوصاً ایسی شکل میں کہ انکی معرفت ایک تصویر احمد

حسن مودودی کو بھیجی ہو۔ مرزا ان کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں ''فقیر نے جو اپنی تصویر منشی داد خاں سیاح کی معرفت نذر کی ہے یقین ہے وہ پہنچی ہو گی(۱) ۔''

ان وجوہ سے جن لوگوں کو غالب نے اپنی تصویریں بھیجی تھیں اس فہرست میں میں سیاح کا نام درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ مرزا کے کسی خط میں اگرچہ تصویر بھیجنے کا ذکر نہیں ہے لیکن مرزا کے سارے خطوط موجود کہاں ہیں ۔

سیاح کو تصویر بھیجنے کی تاریخ ۱۷ اگست ۶۸ء کے لگ بھگ سمجھنی چاہئے ۔

(۳)

ذیل میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ مرزا نے اپنی تصویروں کے سلسلے میں اردو رقعات میں جو کچھ لکھا ہے اسے پیش کیا جائے ۔

بنام سیاح ۔۔۵ ستمبر ۶۶ء کو لکھتے ہیں ۔

''صاحب اس بڑھاپے میں تصویر کے پردے میں کھنچا کھنچا پھروں گوشہ نشیں آدمی عکس کی تصویر اتارنے والے کو کہاں ڈھونڈوں ۔ دیکھو ایک جگہ میری تصویر بادشاہ کے دربار میں کھینچی ہوئی ہے اگر ہاتھ آجاوے تو وہ ورق بھیج دوں گا(۲) ۔'' پھر ۱۴ نومبر کو لکھتے ہیں ۔ ''ایک میرے دوست مصور خاکسار کا خاکہ اتار کر دربار کا نقشا اتارنے اکبرآباد کو گئے ہیں وہ آجائیں تو شغل تصویر تمام ہو کر آپ پاس پہنچ جائے(۳) ۔

۱۱ جون کو لکھتے ہیں ۔ ''تصویر کا حال یہ ہے کہ ایک مصور صاحب میرے دوست میرے چہرے کی تصویر اتار کر لے گئے۔ اس کو تین مہینے ہوئے آج تک بدن کا نقشہ کھینچنے کو نہیں آئے۔ میں نے گوارا کیا آئینہ پر نقشا اتروانا بھی ۔ ایک دوست اس کام کو کرتے

(۱) اردوئے : ۱۷۷ ۔ (۲) اردوئے : ۱۷ ۔ (۳) اردوئے : ۸ ۔

ھیں - عید کے دن وہ آئے تھے میں نے ان سے کہا بھائی میری شبیہہ کھینچ دو - وعدہ کیا تھا کل تو نہیں پرسوں اسباب کھینچنے کا لے کر آؤں گا - یا پانچواں مہینہ ھے- آج تک نہیں آئے - ،، (۱)

۲۵ اگست ۶۷ء کے خط میں لکھتے ھیں - '' تصویر کھیچنے والا ایک انگریز ھے وہ کھینچتا ھے مجھ میں اتنا دم کہاں کہ کوٹھے پر سے اتروں پالکی میں بیٹھوں اور اس کے گھر جاؤں اور گھنٹہ دو گھنٹہ کرسی پر بیٹھوں اور تصویر کھنچوا کر جیتا جاگتا اپنے گھر پھر آؤں (۲)-

لیکن کئی سال گزر نے پر بھی یہ وعدہ پورا نہ ھو سکا - انہیں کو ۲۰ جنوری ۶۸ء کو لکھتے ھیں - ''مصور سے سخت عاجز ھوں - وعدہ ھی وعدہ ھے - وفا کا نام نہیں- (۳)،،

یہ مصور صاحب تو نہ آئے اور نہ مرزا میں اب اتنا دم تھا کہ انگریز مصور کی دوکان میں دو گھنٹے بیٹھ کر تصویر بنوائیں لیکن مئی ۶۸ء سے پہلے کسی فوٹو گرافر نے ان کی تصویر اتاری اور قیاس ھے کہ یہی تصویر انہوں نے اگست ۶۸ء سے پہلے پہلے سیاح کو روانہ کر دی -

بنام مجروح

۱۸ دسمبر ۶۰ء کے خط میں لکھتے ھیں : - میاں محمد افضل تصویر لے گئے اب وہ تصویر کھینچا کریں اور تم انتظار (۴)- کچھ انتظار دیکھنے کے بعد بھی جب مجروح کو تصویر نہیں ملی تو انہوں نے تقاضا کیا - ۹ جنوری ۶۱ء کو مرزا نے جواب دیا - '' میاں تمہاری تصویر کا یہ جواب ھے کہ وہ تصویر جو میں نے میاں محمد افضل کو دی تھی وہ انہوں نے واپس کر دی اور اس کی نقل کے باب میں کہا ھے کہ ابھی تیار نہیں ھے- جب

---

(۱) اردوئے- ۲۰ ـــ ۲۵ (۲) اردوئے ۱۵ (۳) اردوئے ۱۸ (۴) اردوئے ۱۱۸ - خطوط ۲۶۵-

تیار ہو جائے گی میں ان کو روپیہ دے کر لے لوں گا - خاطر جمع رکھو(۱) - ۸ مارچ ۶۱ء تک تصویر تیار نہ ہو سکی تھی (۲) -

مرزا انہیں لکھتے ہیں - میاں محمد افضل تصویر کھینچ رہے ہیں - جلدی نہ کرو دیر آید درست آید (۳) -

بنام شیو نرائین آرام

معلوم ہوتا ہے شیو نرائن نے مرزا سے ان کی تصویر مانگ بھیجی تھی - ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہوگا کہ آپ کو زحمت ہوگی یوسف علی خاں عزیز جن سے ان کے گہرے مراسم تھے اور جو ان دنوں دہلی میں مقیم تھے اس کام کو کر لیں گے - اس کے جواب میں مرزا ۳ جولائی ۶۰ء کو لکھتے ہیں ''تصویر میری لے کر کیا کروگے - بے چارہ عزیز کیوں کر کھنچوا سکے گا - اگر ایسی ہی ضرورت ہے تو مجھکو لکھو میں مصور سے کھنچوا کر بھیج دوں - نہ نذر درکار نہ نیاز (۴)-

(۴)

مرزا کو تصویروں سے خاصی دلچسپی تھی - اپنی تصویریں بھی دوسروں کو بھیجتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ دوسروں کی تصویریں بھی منگواتے تھے اور ان سے لطف اندوز ہوتے تھے -

مرزا نے غلام بابا خان رئیس سے سورت سے ان کی تصویر منگوائی ہے - تصویر ملنے کے بعد سیاح کو لکھتے ہیں -

''حال تصویر کا یہ کہ میں نے اپنے سر پر رکھا آنکھوں سے لگایا گویا چھوٹے صاحب (غلام بابا خان) کو دیکھا - لیکن اس کا سبب

---

(۱) اردوئے ۱۱۷ خطوط ۲۶۵ (۲) مہیش پرشاد مرحوم اس خط کو ۵۸ء کا لکھا ہوا سمجھتے تھے - یہ خط میرے خیال میں تین سال بعد کا ہے
(۳) اردوئے ۱۱۹ - خطوط ۲۳۶ (۴) خطوط ۳۰۵

نہ معلوم ھوا کہ نواب صاحب نے ھم سے بات نہ کی ۔ خیر دیدار تو میسر ھوا گفتار بھی اگر خدا نے چاھا تو سن لیں گے ۔ دیکھو منشی صاحب۔ حضرت کی تصویر میں کہنیوں تک ھاتھ کی تصویر ھے ۔ آگے پہنچے اور پنجے کا پتہ نہیں ۔ مکالمہ ایک طرف مصافحہ کی بھی حسرت رہ گئی ،، ۔(۱) احمد حسن مودودی کو لکھتے ھیں ''تصویر مہر منیر پھونچی ۔ اور میں نے رسید لکھ بھیجی ،، (۲) شیو نرائین کو لکھتے ھیں '' تصویر پہنچی (۳) اس طرح مرزا حاتم علی مہر کی تصویر لینے کے بعد جو خط انھوں نے لکھا ھے (۴) اس کا شمار ان کے بہترین خطوں میں ھو سکتا ھے۔،،

ان کے خطوں سے اس زمانہ کے مصوروں کے متعلق بھی کچھ معلومات مل جاتی ھیں ۔

شیو نرائن نے بہادر شاہ کی تصویر منگوا بھیجی ھے۔ انہیں لکھتے ھیں ۔بادشاہ کی تصویر کی صورت یہ ھے کہ اجڑا ھوا شہر نہ آدمی نہ آدم زاد۔ مگر ھاں ایک دو مصوروں کی آبادی کا حکم ھو گیا ھے ۔ وہ رھتے ھیں ۔ سو وہ بھی بعد اپنے گھروں کے لٹنے کے آباد ھوئے ھیں ۔ تصویریں بھی ان کے گھروں میں سے لٹ گئیں ۔ جو کچھ رھیں وہ صاحبان انگریز نے بڑی خواھش سے خرید کر لیں ۔ ایک مصور کے پاس ایک تصویر ھے ۔ وہ تیس روپیے سے کم کو نہیں دیتا ۔ کہتا ھے تین تین اشرفیوں کو میں نے صاحب لوگوں کے ھاتھ بیچی ھیں ۔ تم کو دو اشرفی کو دوں گا۔ ھاتھی دانت کی تختی پر وہ تصویر ھے ۔ میں نے چاھا کہ اس کی نقل کاغذ پر اتار دے ۔ اس کے بھی بیس روپے مانگتا ھے ۔ اور پھر خدا جانے اچھی ھو یا نہ ھو اتنا صرف بے جا کیا ضرور ھے ۔ میں نے دو ایک آدمیوں سے کہہ رکھا ھے اگر کہیں سے ھاتھ آجائے گی تو لے کر تم کو بھیج دوں گا ۔ مصور سے خرید کرنے کا نہ خود مجھ میں مقدور نہ تمہارا نقصان منظور (۵)،،

یہ اکتوبر ۵۸ء کی بات ھے ۔ سعی انقلاب کو ابھی کچھ ھی

---

(۱) اردوئے ۱۱ (۲) اردوئے ۱۷۷ (۳) اردوئے ۲۸۳ خطوط ۴۰۶
(۴) اردوئے ۱۸۹ خطوط ۳۱۲ (۵) اردوئے ۲۶۵ خطوط ۳۸۲

دن ہوئے تھے - مصوروں کا دھلی میں فقدان تھا - لیکن ۶۶ء تک اچھے خاصے مصور آباد ہو چکے تھے - اور بعضوں سے مرزا کی دوستی بھی تھی - ان کے رقعات میں کئی مصور دوستوں کا ذکر ملتا ھے۔ (۱) ھندوستانیوں کے علاوہ انگریز مصوروں کی دوکانیں دھلی میں ۱۸۶۷ء میں موجود تھیں (۲) - وھاں فوٹو گرافر بھی موجود تھے اور مصور بھی - مصور کاغذ پر بھی تصویریں بناتے تھے اور ھاتھی دانت پر بھی (۳) اور آئینہ (۴) پر بھی نقشا اتروانے کا رواج تھا -

ھمیں کم از کم دو مصوروں کا علم ھے جن سے غالب اپنا کام کرایا کرتے تھے - محمد فضل مصور اور محمد افضل - محمد افضل سے تصویریں بنواتے تھے- اور محمد فضل سے اپنی کتابوں کے سرورق کی تزئین اور قصیدوں کے بیل بوٹے بنانے کا کام لیا کرتے تھے - محمد افضل کا ذکر ان کے خطوط میں متعدد بار آیا ھے -''میاں محمد افضل تصویر لے گئے اب وہ تصویر کھینچیں اور تم انتظار،، ''وہ تصویر جو میں نے میاں محمد افضل کو دی تھی وہ انہوں نے واپس کر دی،،- ''میاں محمد افضل تصویر کھینچ رھے ھیں جلدی نہ کرو،،

محمد فضل کا ذکر ان کے رقعات میں صرف ایک جگہ ملا - یوسف مرزا کو لکھتے ھیں - ''دو مہینے رات دن خون جگر کھایا اور ایک قصیدہ ۶۴ بیت کا لکھا محمد فضل مصور کو دے دیا وہ پہلی دسمبر کو مجھ کو دے گا ،، (۵)- مجھے یاد آتا ھے کہ مرزا کی کتاب ''مہر نیم روز،، کا سرورق محمد فضل مصور کا بنایا ھوا ھے۔

محمد فضل مصور دھلی کے مشہور مصوروں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور خود اپنے زمانہ کے ممتاز مصور تھے - غالب کے عزیزوں میں خواجہ امان اور خواجہ قمر الدین خان انہیں کے تربیت یا فتگان میں سے تھے-

---

(۱) اردوئے ۱۵،۸ ، ۱۸ (۲) اردوئے ۱۵ (۳) اردوئے ۲۶۵ (۴) اردوئے ۲۵
(۵) خطوط : ۱۶۴

غالب کے بعض اشعار کے مطالب

خواهش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا هوں اس بت بیداد گر کو میں

ایک گروہ شارحین نے اس شعر کا یہ مطلب بیان کیا ہے -

''احمق لوگ خواهشوں کو پرستش قرار دیتے هیں بھلا خواهش اور پرستش ایک چیز کیسے هو سکتی ہے- اس غلط فہمی کی بنا پر اکثر لوگ سمجھتے هیں که میں اس بت بیداد گر کی پرستش کرتا هوں حالانکه امر واقعه اس کے برعکس ہے - مجھے تو محض اس کی خواهش اور آرزو ہے میں اس کا پجاری نہیں-''

دوسرے گروہ کا ارشاد ہے

''اس شعر میں باریک معنی یه هیں که شاعر حیران هو کر پوچھتا ہے که کیا میں اسے پوجتا هوں - اسے خبر نہیں که معشوق کے سامنے جا کر اظہار نیاز پرستش کی حد تک پہونچ جاتا ہے - یا خواهش کی حد تک رهتا ہے اور حیرت کے علاوہ دوسرا پہلو تشنج کا بھی ہے- ایک صاحب نے پرستش اور خواهش میں یه فرق نکالا ہے که جب پرستش کی جائے گی تو وہ خواهش دل هی سے هوگی خواہ اس میں کسی قدر استغراق کیوں نه هو اور جس امر میں خواهش دل شامل ہے وہ عبادت نہیں هو سکتی - تو ثابت هوا که عبادت حق کوئی بجا نہیں لا سکتا - صرف دنیا پابندان خواهش کو عابد کا خطاب دیتی ہے-''

میں ان شرح پر نکتہ چینی کئے بغیر شعر کا جو مطلب سمجھا ہوں بیان کئے دیتا ہوں ۔ شاعر کہتا ہے کہ جس کو احمق ظاہر پرست کہتے ہیں وہ دراصل میری خواہش پرستش ہے ۔ پرستش کا مفہوم میرے ذہن میں اور ہی کچھ ہے ۔ ابھی اس کی تکمیل نہیں ہوئی ۔ مگر اس کا پایہ اس قدر بلند ہے کہ خواہش پرستش پر لوگوں کو پرستش کا دھوکا ہونے لگا ہے۔

۲— آشفتگی نے نقش سویدا کیا درست
ثابت ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

قول شارحین۔ آشفتگی = پریشانی ۔ نقش سویدا = دل پر ایک سیاہ رنگ کا تل ہوتا ہے ۔ سویدا کیا درست = یعنی سیاھی کو دور کر دیا۔

سویدا کو داغ اور آشفتگی کو دود سے تشبیھہ دے کر کہتے ہیں کہ میری آشفتگی اور پریشانی نے داغ سویدا کو درست کر دیا یعنی صاف کر دیا ۔ اس داغ کی وجہ سے دل سے اکثر دھواں نکلا کرتا تھا ۔ اب دھواں نکل جانے کے بعد دل کا داغ دور ہو گیا ۔ اس سے ثابت ہوا کہ داغ کا سرمایہ یا حاصل محض دھواں تھا اور وہ دھواں نکل گیا اور دل صاف ہو گیا ۔ ایک صاحب فرماتے ہیں کہ دل کا داغ دنیا کی مکروھات میں دل لگانے سے پیدا ہوا تھا ۔ دوسرے صاحب کا خیال ہے کہ داغ پریشان حالی افشائے راز کے خوف سے آہیں ضبط کرنے کا نتیجہ ہے ۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ جس طرح دھوئیں سے داغ پیدا ہو جاتا ہے اس طرح آشفتہ خاطری اور پریشانی سے دل میں داغ سویدا کی صورت قائم ہوتی ہے۔

جملہ حضرات نے آشفتگی کے معنی آشفتہ خاطری اور پریشانی کے لئے ہیں ۔ حالانکہ آشفتگی سے غالب کی مراد عشق کی شوریدگی سے ہے ۔ سند میں یہ اشعار پیش کیے جاتے ہیں ۔

صائب - آشفتگی زعقل پزیرد دماغ ما
فانوس گرد باد شود بر دماغ ما

مفید بلخی— در چمن هر چند قامت سرو موزوں می کشد
از قدت آشفتگی چوں بید مجنوں می کشد

صائب کے شعر میں عقل سے بیزاری اور عشق کی طرف سیلان کا اظہار ہے - مفید بلخی کے شعر میں صاف صاف سرو کی آشفتگی کا سبب معشوق کے قد بالا پر فریفتگی کو قرار دیا ہے -

نقش سویدا یا داغ سویدا حضرات صوفیا میں دل کا وہ نقطہ ہے جس میں سے جمال الہی کا مشاہدہ ہوتا ہے -اور جسے ذوق نے اس طرح نظم کیا ہے -

دیکھ اگر دیکھتا ہے ذوق کہ وہ پردہ نشیں
دیدۂ روزن دل سے ہے دکھائی دیتا

بھی داغ سویدا یا نقش سویدا ہے - جسے ذوق نے دیدۂ روزن دل سے تعبیر کیا ہے - ورنہ دل میں روزن یا سوارخ کہاں !

''نقش (سویدا) کیا درست ،، لفظی ترجمہ ''نقش درست کردن،، کا ہے - جس کے معنی ہیں نقش کو نوک پلک سے درست کرنا نہ کہ مٹا دینا یا بالکل دور کر دینا -

غالب کہتے ہیں کہ سویدا کا نقش اجاگر نہیں تھا - عشق شوریدہ نے اس کی کثافت ، آلودگی کو دور کیا اور اس کا صحیح مصرف بتایا کہ دیدار محبوب یونہی میسر ہو سکتا ہے کہ اس کو دیدۂ دل سے دیکھو - اپنے اندر تلاش کرو - اپنے سے باہر نہ پاؤگے اور اس تلاش و حصول مقصد کا واحد ذریعہ عشق و وجدان ہے - عقل کو یہاں دخل نہیں - غالب نہیں کہتے کہ دھوئیں سے داغ پڑ گیا بلکہ یہ کہتے ہیں کہ وہی آشفتگی عشق (جسے داغ کی رعایت سے دھواں کہا گیا ہے بادنی ملابست - کیونکہ دھوئیں میں بھی پریشانی اور پیچیدگی کی صلاحیت ہوتی ہے) داغ کا سرمایہ یا

حاصل بن گئی - کیونکہ عشق نے داغ سویدا کو دوسرے داغوں سے ممیز کر دیا اور اس کا صحیح مصرف دریافت کیا -

(۳) گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

قول شارحین - ''اضطراب شوق اس قدر زیادہ ہے کہ دل میں بھی نہیں سما سکتا - حالانکہ دلمیں اس قدر وسعت ہے کہ اس میں دونوں جہان با آسانی سما سکتے ہیں - کہتے ہیں کہ اس قدر فراخی کے باوجود شوق کو تنگ دلی کی شکایت ہے - اور یہ شکایت بجا معلوم ہوتی ہے - کیونکہ اضطراب شوق کو ضرورت کے مطابق جگہ نہ ملنے سے اس کا جوش اضطراب ٹھنڈا پڑ گیا - گویا دریا کا اضطراب موتی میں سما گیا - اصل میں موتی کی آب کو دیکھ کر شاعر کا دماغ اس باریک خیال کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے جو گوہر کو دل اور اضطراب شوق کو اضطراب دریا سے تشبیہ دے کر یہ لطیف معنی پیدا کئے،،

میں عرض کرتا ہوں کہ غالب نے صرف لفظ شوق استعمال کیا- حضرات شارحین اس کو بلا تکلف اضطراب شوق کہتے ہیں- پھر فرماتے ہیں کہ جوش اضطراب ٹھنڈا پڑ گیا - یعنی شوق سے بالکل خالی الذہن ہو گئے - مزید برآن جوش اضطراب کے ٹھنڈا پڑنے سے دریا کے اضطراب کو موتی میں سمانا کہنے کی صورت جواز کیونکر پیدا ہوئی- اضطراب شوق کو اضطراب دریا کہنا ہے (اضطراب قدر مشترکہ) دلکو گوہر کہہ چکے ہیں لہذا شوق دریا ہوا - اضطراب شوق اضطراب دریا ہوا- اور دل گوہر ہوا - ایسی حالت میں اس فراخی و وسعت کا کیا حشر ہوا جو دل سے منسوب کی گئی تھی - جب دل گوہر ہے اور شوق دریا ہے تو دل دریائے شوق کا گوہر ہوا - تاہم یہی شوق یا دریا اپنے گوہر یعنی دل سے تنگی جا کا گلہ کرتا ہے - غرض کہ خلط مبحث ہے

میرا خیال ہے کہ غالب نے دل کی دو مختلف کیفیتوں یعنی شوق و اضطراب کو مد نظر رکھا اضطراب عام اور شوق مخصوص - شوق کیا

ہے کسی آرزو کی تکمیل کا خواہش مند ہونا ۔ اس تکمیل کے لئے شوق نے پوری کائنات دل کو چھان مارا ۔ اور اس قدر کاوش کی کہ دل کا اضطراب بھی شوق میں منتقل ہو گیا ۔ تاہم شوق کی تکمیل نہیں ہوئی اور دل کی تنگی کا گلہ مند ہے ۔ غالب اس کی مدلل تو جیہہ یوں کرتے ہیں کہ پورے دریا یعنی دریا کا اضطراب گہر میں محو ہو گیا ۔ محو ہو جانا فنا ہو جانا نہیں ہے ۔ بکہ ایک شے یا ذات کا دوسری شے یا ذات میں گم ہو جانا ہے ۔ عدم تکمیل شوق، تاہم بقائے شوق و اضطراب کو دوسرے مصرعے میں تمثیلاً یوں بیان کرتے ہیں کہ وہ صورت رونما ہوئی جو گوہر ہوتی ہے ۔ ''گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا،،۔ جس کیفیت کو غالب نے اضطراب دریا کے گوہر میں محو ہونے سے تعبیر کیا ہے اسے اصطلاح شعرامین ''موج گہر،، کہتے ہیں ۔ یعنی وہ روشن ڈورا جو بیش قیمت موتی کے گرد ہوتا ہے (میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے) اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برابر گردش کر رہاہے ، متحرک ہے ۔ گوہر بھی تابدار ہوتا ہے ۔ لیکن یہ ڈورا اس سے تابندہ تر ہوتا ہے ۔ سند میں مرزا بیدل کے اشعار اس لئے پیش کرتا ہوں کہ ایک زمانے میں غالب طرز بیدل میں ریختہ کہا کرتے تھے ۔ اور زیر بحث مطلع اس زمانے کا معلوم ہوتا ہے ۔

۱۔ دل آسودۂ ماشور امکان درنفس دارد
گہر دزدیدہ است اینجا عنان موج دریا را

۲۔ ہمت ہراز دو جہاں جست و ز دل در نگزشت
موج بگزشت ز دریا و ز گوہر نگزشت

جسے بیدل نے گوہر کا ''عنان موج دریا د زدیدن،، یا ''موج زگوہر لگزشت،، کہا ہے اس بات کو غالب نے اضطراب دریا کے گہر میں محو ہونے سے استعارہ کیاہے ۔

شعر کا حاصل یہ ہوا کہ جذبہ شوق نے اپنے وسعت و پہنائی کا اندازہ کرنا چاہا ۔ پورے دل پر محیط ہو گیا اور اضطراب دل کی

استعانت حاصل کرنے کو اسے بھی اپنے میں جذب کر لیا ۔ پھر بھی جذبہ شوق کی تسلی نہ ہوئی ۔ دل دریا ہے شوق اس دریا کا موتی ہے جس میں پورے دریا کا اضطراب بہ شکل موج گوھر جذب ہے۔ شوق پورے دریا پر محیط ہے ۔ دریا کے طوفان و تموج (اضطراب) کو اپنے میں سمیٹے ہوئے ہے۔ تاھم تنگی جا کا شاکی ہے ۔ گویا وسعت مکان ولا مکان پر چھا جانا چاھتا ہے۔ بظاھر سعی طلب کی تمام منازل طے کر چکا ہے ۔ تاھم قانع نہیں ۔ بلکہ اور ترقی کرنا چاھتا ہے اور آگے بڑھنا چاھتا ہے ۔ جو انسان کی فطرت بلند تقاضا ہے۔ کبھی قانع نہ ھونا کسی منزل میں دم نہ لینا ۔

(۴) پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

قول شارحین ۔ ''آج مجھے پھر اپنی چشم تر یاد آ گئی اور نتیجے کے طور پر میرا دل و جگر فریاد کا آرزو مند ھو گیا کہ پھر وھی گریہ و زاری کی لذت حاصل کی جائے ۔ بعض لوگ دیدہ تر سے معشوق کی چشم تر مراد لیتے ھیں ۔ یعنی مجھے معشوق کی چشم تر یاد آئی اور اس وجہ سے میرا دیدہ و دل آرزو مند فریاد ھوا بعض حضرات فرماتے ھیں کہ دل جگر تشنہ فریاد ھوا تو مجھے دیدہ تر یاد آ گیا کہ یہ تشنگی رونے سے ھی بجھے گی ۔ ''

اگر غالب کا یہی مدعا ہے تو ردیف واحد غلط ھوئی جاتی ہے۔مزید عیب دل اور جگر کے مابین واو عطف کا حذف ہے ۔ میرے نزدیک دل جگر و تشنۂ فریاد ترکیب مرکب ہے ۔ یعنی دل بذریعہ فریاد جگر کے خون ھونے کے درپے ھوا ۔ مطلب یہ ھوا کہ بتقاضائے غم دل مجھے دوبارہ (پھر) دیدۂ تر کی یاد آئی ۔ مگر پہلے ھی اتنا رو چکا تھا کہ آنکھ میں ایک قطرہ اشک نہ رھا دل جو تشنۂ گریہ تھا مصر ھوا کہ آنکھ میں آنسو نہیں تو فریاد کرکے جگر کا خون کرو اور اس خون کے آنسو روؤ ۔ میری تشنگئ شوق کی تسکین بہر صورت ھونا چاھئے ۔ یہ معنی نہ لیجئے تو گریہ اور فریاد میں ربط پیدا ھی نہیں ھوتا ۔ فریاد کی تسکین گریہ سے کیوں کر ھو سکتی ہے۔

(۵) کیا زھد کو مانوں کہ ھو گرچہ ریائی
پاداش عمل کی طمع خام بہت ھے

تمام شارحین اس شعر کی شرح میں متفق ھیں اور ان کی تحریر کا خلاصہ یہ ھے کہ ”غالب ایسے زھد کو بھی نہیں مانتے جس میں ریا بالکل نہ ھو۔ کیونکہ اس میں جزا کا خیال بہت زیادہ ھوتا ھے ۔ یعنی زھد و تقوی کے بدلے ، اگلے جہاں میں عیش و آرام ملے گا ۔ زھد و تقوی بغیر جزا کے خیال کے ھونا چاھئے ،،

جملہ شارحین نے پاداش کے معنی جزا کے لئے ھیں ۔ یعنی طالب اجروثواب، حالانکہ لفظ پاداش مکافات کا مترادف ھے ۔ اور اس کا اطلاق سزا و جزا پر یکساں ھوتا ھے ۔ غالب نے پاداش عمل کو خواہ بربنائے جزا ھو یا بخوف سزا طمع خام کہا ھے ۔ ان کا ادعا ھے کہ زھد ریائی کی زبونی تو بد یہی ھے ۔ وہ زھد بھی کسی کام کا نہیں جسمیں پاداش عمل یعنی سزا یا جزا کا خیال شامل ھو ۔ کیونکہ جہاں ایسا خیال آیا خلوص رخصت ھوا ۔ پاداش عمل کو طمع خام اس لئے کہا ھے کہ ذات باری بے نیاز ھے ۔ اس کے رحم و کرم قہر غضب بخشش و نوازش کا پیمانہ انسان کے اعمال نہیں بلکہ اس کی صمدیت ھے ۔ بہت ممکن ھے کہ ایک شخص عمر بھر آلودہ معصیت رھے مگر اس کی ادا پسند آ جائے اور بخش دیا جائے ۔ اس طرح اس کا امکان ھے کہ زندگی بھر کی ریاضت پر ایک لغزش پانی پھیر دے اور جہنم کا سزاوار بنا دے ۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ مقدم شے پاداش عمل سے یکسر بے تعلق ھو کر اپنے ھی نفس کی پاکی اور صفائی، فروتنی اور خدمت خلق ھوئی ۔ عبارت کا بھی یہی مقصد ھونا چاھئے ۔ مگر یہی بات زاھدوں میں نہیں پائی جاتی ۔ پاداش عمل کی طمع خام سے چھٹکارا نہیں ھوتا ۔

(۶) ستائش گر ھے زاھد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ھے ہم بےخودوں کے طاق نسیاں کا

میں شرح دیوان غالب مرتبہ آغا محمد باقر صاحب سے شارحین کے اقوال نقل کئے دیتا ہوں ۔

''ستائش گر = مداح ۔ باغ رضواں = باغ جنت ۔ طاق نسیاں = وہ طاق جسمیں کوئی چیز رکھکر بھول جائیں ۔ بالائے طاق رکھنا بمعنی ترک کرنا ۔ طاق نسیاں پر رکھنا اور بھی زیادہ مبالغہ پیدا کرتا ہے ۔ بہشت کو تحقیراً گلدستے کے ساتھ تشبیہہ دی ہے ۔ لطف یہ ہے کہ گلدستہ سجاوٹ کے لئے طاق ھی پر رکھا جاتا ہے ۔ تشبیہہ بالکل اچھوتی ہے ۔ طبا طبائی کہتے ھیں اس شعر میں معنوی خوبی نہیں حسین بیان و بدیع سے تعلق ہے ۔ زاھد جس باغ جنت کی اس قدر تعریفیں کرتا ہے وہ ھم جیسے بیخودوں کے طاق نسیاں کا ایک گلدستہ ہے ۔ گویا ھمارے نزدیک جنت کی توقیر کچھ بھی نہیں ۔ ھم تو اسے طاق نسیاں میں رکھکر بھول جاتے ھیں ۔ بقول آسی بہشت کی تحقیر اس کے مناسب لفظ گلدستے سے کی گئی ہے ۔ اور پھر بھی اس کو باعث زینت قرار دیا ہے ۔ چونکہ خود کو بیخود کہا ہے اس لئے اس کو طاق نسیاں ھی پر رکھا ہے۔

حسرت ۔ ''ھم بیخودی کے ایسے خوشگوار عالم میں ھیں جس کے مقابلے میں ھم نے جنت کو فراموش کر دیا ہے۔''

میں عرض کرتا ہوں کہ کسی صاحب نے لفظ بیخودی کا صحیح مفہوم متعین کرنے کی طرف توجہ نہیں کی اور بھٹکتے پھرے ۔ اصطلاح تصوف میں بیخودی کے معنی ھیں غیر خدا سے منہ پھیر لینا اور اس کی یاد میں ایسا محو ہو جانا کہ اپنا بھی ہوش نہ رہے ۔ ظاھر ہے کہ جو شخص خدا سے لو لگائے گا اور ماسوا اللہ سے بیگانہ و بیخبر ہو جائے گا اس کی نظر میں بہشت کی وقعت ''گلدستہ طاق نسیاں'' سے زیادہ نہ ہوگی ۔ اس میں شریعت اور طریقت کا فرق مضمر ہے۔ شریعت میں جنت وہ ہے جہاں مادی اسباب راحت کے ساتھ ساتھ سکون قلب و طہارت نفس میسر ہو ۔ طریقت میں بہشت اشارہ ہے دیدار خدا سے ۔بقول میر ۔

شیخ جنت تجھے دیدار مجھے
واں بھی ہر ایک ہے جدا قسمت

اس خیال کو غالب نے اس طرح ادا کیا ھے ۔

هم کو معلوم ھے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یه خیال اچھا ھے۔

غالب جنت کے نہیں بلکه عام تصور جنت کے منکر ھیں ۔ یه کوئی مخصوص جائے آسائش نہیں بلکه طرب کی منزل ھے ۔ نفس مطمئنه کی ایک کیفیت ھے۔

(۷) بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاهئے وسعت مرے بیاں کے لئے

عام طرر پر لوگوں نے اس شعر سے یه مطلب نکالا ھے که غالب غزل کے بحیثیت صنف سخن غیر مطمئن اور اس کی تنگ دامانی کے گله مند تھے۔ حالانکه حقیقت یه ھے که وه اس مخصوص غزل میں جس کا جز شعر زیر بحث ھے تجمل حسین خاں کی شان میں مدحیه اشعار شامل کرنا چاهتے تھے غزل میں قصیدے کا پیوند لگانا چاهتے تھے ۔ اس کی تمهید اور معذرت میں کہا که ''بقدر شوق ——— ''اگر غزل کو صنف سخن کی حیثیت سے ناکافی سمجھتے اور اس بنا پر بیزار ھوتے تو لفظ شوق کی جگه ذوق استعمال کرتے کیونکه ذوق کا تعلق عام رجحان اور افتاد طبیعت سے ھے اور شوق محض خواهش و ولوله ھے۔ جو وقتی بھی هو سکتا ھے۔ میرے ادعا کا ثبوت خود غزل کے آخری دو شعروں میں موجود ھے ۔

۱- ورق تمام هوا اور مدح باقی ھے
سفینه چاهئے اس بحر بیکراں کے لئے

۲- ادائے خاص سے غالب هوا ھے نکته سرا
صلائے عام ھے یاران نکته داں کے لئے

''ادائے خاص،، یہی عشقیه غزل میں مدح سرائی کا شمول ھے

غالب اور آزردہ

مفتی صدر الدین خاں آزردہ دهلوی کا پایہ علم و فضل اور نجابت و شرافت میں بہت بلند ھے ۔ وہ مولانا فضل امام خیرآبادی اور حضرت شاہ عبدالقادر کے شاگرد تھے اور مولوی فضل حق کے ھم سبق ۔ حضرت شاہ عبدالعزیز نے ایک فارسی خط میں جو انہوں نے کلکتے کے مولانا امین کے نام لکھا تھا ان کا شمار دھلی کے ''فضلائے نامدار،، میں کیا ھے اور لکھا ھے کہ وہ ''فنون عقلی و نقلی اور ادب و اصول،، میں مہارت نامہ رکھتے ھیں ۔

مولانا ابولکلام آزاد نے لکھا ھے کہ آزردہ کے دیوان خانے میں اھل علم کا مجمع رھتا تھا ۔ اور اس کی حیثیت ایک اکیڈمی کی سی تھی ۔ ان کا مذاق سخن بہت پاکیزہ تھا ۔ افسوس ھے کہ ان کا نہ تو دیوان ملتا ھے اور نہ تذکرہ شعرائے ریختہ ۔ لیکن حالی نے جو اقوال ان سے منسوب کئے ھیں ان سے ان کی نکتہ سنجی اور سخن فہمی کا پورا ثبوت ملتا ھے۔

یہ اشعار ایک اعلا درجے کا شاعر کہہ سکتا ھے۔

آزردہ— میں اور ذوق بادہ کشی لے گئی مجھے
یہ کم نگاھیاں تری بزم شراب میں

کامل اس فرقۂ زھاد میں اٹھا نہ کوئی
جب ھوئے تو یہی رندان قدح خوار ھوئے

اے دل تمام نفع ھے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ھے سو ایسا زیاں نہیں

مکھڑا وہ غضب زلف سیاہ فام یہ کافر
کیا خاک جئے کوئی شب ایسی سحر ایسی

غالب نے اس قطعہ میں ان کی سخن وری کا اعتراف کیا ھے۔

هند راخوش نفسانند سخن ورکہ بود
باد درخلوت شاں مشک فشاں از دم شاں

مومن ونیر و صہبائی و علوی وانگاہ
حسرتی اشرف آزردہ بود اعظم شاں

غالب نے شیفتہ کو ایک مشاعرے کی شرکت کے متعلق لکھا ھے کہ اس میں رنج راہ کی تلافی مخدوم معظم و صدر اعظم مولوی صدر الدین خاں بہادر کے دیدار سے ہو گئی(۱)۔ شیفتہ ھی کو ایک اور مشاعرے کا حال لکھتے ھیں کہ حضرت آزردہ اگرچہ دیر میں آئے لیکن انہوں نے آ کر دل کو صفا اور زبان کو نوا بخشی۔ اور میں نے گریستن کی زمین میں اپنا فارسی قصیدہ پڑھا (۲)۔ حالی کا بیان ھے کہ یہ قصیدہ بہت کامیاب رہا۔

شیفتہ نے گلشن بے خار کے مسودہ میں آزردہ کا ترجمہ شامل نہیں کیا تھا اس کو دیکھ کر غالب نے شیفتہ کو لکھا ھے :

''گہر نہ سفتن خامہ——در ردیف الف بنگارش اشعار پروین شعار حضرت آزردہ از چہ است۔ هر چند ذکر خدام برجیس مقام در جریدہ این فن نہ سزاوار شان فضیلت باشد۔ لیکن اگر بہ مقتضائے فرط محبت جرائتے بکارمی رفت گنا ھے نبود و درتلافی آن بہ پوزش نیاز نمی افتاد،،(۳)
اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیفتہ نے آزردہ کا حال بڑھا کر یہ کمی پوری کر دی۔

---

(۱)۔ پنج آہنگ ص-۲۰۱ (۲)۔ پنج آہنگ ص-۲۰۲
(۳)۔ کلیات نثر غالب پنج آہنگ طبع ۱۸۸۴ء خط بنام شیفتہ

غالب نے آزردہ کی مدح میں ایک قصیدہ بھی لکھا ہے۔ جو کلیات فارسی میں موجود ہے ۔ چند اشعار یہ ہیں ۔

زان نمی ترسم کہ گردد قعر دوزخ جائے من
وائے گر باشد ہمیں امروز من فردائے من

صدر دین و دولت و صدر الصدور روزگار
میر و مخدوم و مطاع والی و مولائے من

گویم واز نکتہ چناں دردلم نبود ہراس
کیقباد و قیصر کیخسرو و دارائے من

مو کیشں چوں مرجع عام ست باغیرم چہ بحث
پرسشے دارد ارسطو میدود ہمپائے من

عاجزم چوں درثنائے دوست با ترشکم چہ کار
میروم از خویش تا گیرد عطارد جائے من

خاک کویش خود پسند افتاد در جذب سجود
سجدہ از بہر حرم نگذاشت درسیمائے من (۱)

غدر کے الزام میں مولوی فضل حق انڈمان بھیجے گئے ۔ شیفتہ کو سات برس کی قید ہوئی آزردہ کو بھی قید و بند کے مصائب جھیلنا پڑے۔ غالب نے ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں لکھا ہے ۔

''حضرت مولوی صدر الدین صاحب بہت دن حوالات میں رہے۔ کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا ، روبکاریاں ہوئیں ۔ آخر صاحبان کورٹ نے جان بخشی کا حکم دیا ۔ نوکری موقوف ، جائیداد ضبط، ناچار خستہ و تباہ حال لاہور گئے۔ فنانشل کمشنر اور لفٹنٹ گورنر نے از راہ ترحم نصف جائیداد واگزاشت کی ۔ اب نصف جائیداد پر قابض ہیں ۔ اپنی حویلی میں رہتے ہیں ۔ اگرچہ یہ امداد ان کے گزارے کو کافی ہے اس واسطے کہ ایک آپ اور ایک بی بی ۔ تیس چالیس روپے مہینے کی آمدنی ۔ لیکن امام بخش کی اولاد ان کی عزت ہے اور وہ دس بارہ آدمی ہیں ۔ فراغ بالی سے نہیں گزرتی

---

(۱) کلیات فارسی ص ۳۲۰ تا ص ۳۲۲

ضعف پیری نے بہت گھیر لیا ہے ۔ عشرۂ ثامنہ کے اواخر میں ہیں ۔ خدا سلامت رکھے غنیمت ہیں ''۔

مجروح کو لکھتے ہیں ۔

''دلی کہاں ۔ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا ــــ اہل اسلام میں صرف تین آدمی باقی ہیں ۔ میرٹھ میں مصطفی خاں۔ سلطان جی میں مولوی صدر الدین ، بلی ماروں میں سگ دنیا موسوم بہ اسد۔ تینوں مردود مطرود محروم و مغموم (خطوط غالب ص ۲۰۸) آزردہ کا انتقال ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ ھ (یعنی ۱۶ جولائی ۱۸۶۸) کو ہوا ۔ شمس الشعرا مولوی ظہور علی نے تاریخ وفات لکھی ہے ۔

چو مولانائے صدر الدین در عصر
امام اعظم آخر زماں بود
زہے صدرالصدور نیک محضر
بعدل و داد چوں نوشیرواں بود
بروز پنجشنبہ کرد رحلت
کہ ایں عالم نہ جائے جاوداں بود
ربیع اللاول و بست و چہارم
وداع رو سوے دارالجناں بود
چرا غش ہست تاریخ ولادت
کنوں گفتم چراغ دو جہاں بود(۱)

آزردہ نے انتقال سے ایک دن پہلے نواب کلب علی خان والئی رامپور کو ایک خط لکھا ہے جو نہایت اہم اور غیر مطبوعہ ہے۔ اس لئے ہم اسے تمام و کمال نقل کرتے ہیں ۔

''جناب مستطاب نواب صاحب معلی القاب جم المناصب کثیر المناقب معدن تفقد و نوازش بے پایاں، استظہار نیاز مندان، ملاذعقیدت کیشاں دامت عنایتکم ۔

---

(۱) تذکرہ علمائے ہند ص ۹۴

شکر الطاف والا میری طاقت سے افزوں ہے - حق یہ ہے کہ آپ نے میری آخری عمر میں مجھ سے ایسا سلوک کیا کہ اس کا عوض سوائے خداوند کریم کے بشر سے ہونا جملہ محالات سے ہے - اللہ کریم آپ کو اپنی بارگاہ والا جاہ سے دین اور دنیا میں مدارج علیا عطا فرمائے - میں ایک عرصہ دراز سے مرض فالج میں مبتلا تھا - چنانچہ جناب پر بھی تمام کیفیت روشن ہے - اب چند روز سے تپ اس شدت سے ہوئی ہے کہ مجھکو زندگی سے یاس ہے - ایک میری زوجہ (۱) ضعیفہ اور دوسرا خواہرزادہ محمد احسان الرحمن خاں نام جس کو میں نے فرزندانہ پیش کیا ہے - اور نہایت لئیق اور سعادت مند اور نیک چلن ہے - ان دونوں کو آپ کے سپرد کئے جاتا ہوں - اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو میرے بعد ان کی خبر گیری کسی قدر فرماتے رہیں - یہ ایک نوع کا حسن سلوک میرے بعد بھی مجھ سے ہوگا -

• سپردم بتو مایہ' خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

شاید یہ میرا آخری خط ہے - ذوالجلال والا کرام آپ کو عمر خضری اور دانش فلاطونی اور اقبال سکندری عطا فرمائے -

معروضہ پانزدہم جولائی ۱۸۶۸ مطابق بست و سوم ربیع الاول ۱۲۸۵ ھ
نیازنامہ - محمد صدرالدین‌خاں صدر الصدور سابق دھلی پتہ پر لکھا ہے

۱- لاڈو بیگم نام تھا رامپور میں نواب صاحب کے نام لاڈو بیگم کی عرضی بھی فارسی میں ہے جس میں انہوں نے آزردہ کے کتب خانہ کی فہرست بھیجی ہے اور لکھا ہے کہ انہوں نے ان کتابوں کو غدر کے بعد فراہم کیا تھا -

بسیار ضرورست زود تر برسد (۱) مہر
محمد صدر الدین خاں۔

طرفہ لطیفہ یہ ھے کہ غالب نے آزردہ کے انتقال کے بعد جن سے زندگی بھر ان کے بڑے اچھے مراسم رہے اور جن کو انہوں نے میرو مخدوم و مطاع اور والی مولا سب ھی کچھ کہا تھا نواب کلب علی خاں کو ایک خط لکھا ھے جس میں مرحوم دوست کی بیوہ کے کام میں رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کی ھے ۔ اور ان کی ضرورت کو غیر اھم ثابت کرکے اپنا کام نکالنا چاھا ھے ۔ غالب کی سیرت کا یہ پہلو عبرت انگیز بھی ھے ۔ ھم وہ غیر مطبوعہ خط بجنسہ نقل کرتے ھیں ۔

''حضرت ولی نعمت آیہ؎ رحمت سلامت، بعد تسلیم معروض ھے آج شہر میں شہرت ھے کہ حضرت امیر المسلمین نے مفتی صدر الدین مرحوم کی زوجہ کو پانسو روپے مفتی جی کی تجہیزو تکفین کے واسطے رامپور سے بھیجے ھیں ۔ فقیر کو بھی توقع پڑی کہ میرا مردہ بے گور و کفن نہ رہے گا۔ جیسا کہ میرزا جلال اسیر کہتا ھے ۔

جرعہ لطف تو بعد ازما بما خواھد رسید

میں نے کل ایک خط نواب مرزا خاں کو لکھا ھے ۔ خدا جانے وہ حضرت کی نظر سے گزرے یا نہ گزرے ۔ اس خط میں میں نے زوجہ مفتی جی کا حال یہ لکھا ھے کہ وہ لاولد ھے اور ساٹھ روپے کرایہ کے مکان اس کے تحت میں ھیں ۔ امین الرحمان اس کا بھانجا ھے ۔ مفتی جی کا کوئی نہیں ۔ اب اپنی حقیقت عرض کرتا ھوں۔ آخر عمر میں تین التماسیں ھیں آپ سے، ایک تو یہ کہ

(۱) دارالانشا سرکار دولت مدار رام پور ۔ مثل نمبر ۲۵۶ صیغئہ دوست آشنایاں ۔ اس کے بعد دو سو روپے لاڈو بیگم کے مقرر کر دئے گئے۔

میں ہزار بارہ سو روپیہ کا قرض رکھتا ہوں ۔ چاہتا ہوں کہ میری زندگی میں ادا ہو جائے ۔ دوسرا التماس یہ کہ حسین علی خاں کی شادی آپ کی بخشش خاص سے ہو جائے اور یہ سو روپے مہینا جو مجھے ملتا ہے اس کے نام پر اس کے حین حیات قرار پائے ۔ یہ دو خواہشیں خواہ میری زندگی میں خواہ میرے بعد اجراء پائیں ۔

تم سلامت رہو قیامت تک
دولت و عزو جاہ روز افزوں

روز شنبہ ۵ ربیع الثانی ۲۷ جولائی سال حال ۔ عرضداشت دولت خواہ اسد اللہ [۱] ۔ (لفافہ پر ۲۷ جولائی ۱۸۶۸ء درج ہے)

یہ خط مکاتیب غالب میں نہیں ہے ۔ لیکن اس تاریخ کے بعد کا پہلا خط مندرجہ ذیل ہے ۔ دونوں میں تعلق ہے ۔ اس لئے اس کے چند جملے نقل کئے جاتے ہیں ۔

تین التماسیں سابق (میں) پیش ہوئی تھیں ۔ سو اب پہلے برخوردار نواب مرزا خاں کی تحریر سے اور پھر جناب مظفر حسین خاں بہادر کے خط سے ان خواہشوں کے منظورو قبول ہونے کی نوید پائی ۔ انشاءاللہ الکریم حسب ارشاد حضور اس برس ۶۸ء میں آمد زمستان یعنی نومبر و دسمبر میں میرا قرض بھی ادا ہو جائے گا اور حسین علی خاں کی شادی بھی ہو جائے گی ۔ اور اس کے واسطے اس کی زندگی تک تنخواہ جدا گناہ مقرر ہو جائے گی ۔

---

(۱) دارالانشا سرکار دولت مدار رام پور مثل نمبر ۲۳۳ صیغہ دوست آشنایان ۔

با کریماں کا رہا دشوار نیست (۱)

معروضہ ۱۳ ماہ اگست ۱۸۶۸ء

ان خطوں کے پیش کرنے سے مقصود غالب سے قطع محبت نہیں ہے - بلکہ اس کی بشریت کو نمایاں کرنا ہے - وہ خود کہتا ہے کہ ''خوئے آدم دارم آدم زادہ ام،، اس بشریت نے اس کی ادبی شخصیت کو جاوداں بنا دیا ہے - اس میں خرابیوں سے زیادہ خوبیاں تھیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے -

---

(۱) مکاتیب غالب، مرتبہ عرشی (ص ۸۱—۸۲) اس مضمون کی تیاری میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور قاضی عبدالودود صاحب سے مدد ملی ہے اور میں ان دونوں بزرگوں کا ممنون ہوں (خ - ف)

امتیاز علی عرشی

غالب کی اپنے کلام پر اصلاحیں

نسخہ حمیدیہ نے پہلی بار ہمیں بتایا کہ مرزا غالب نے اپنے قدیم اشعار میں سے نسبتاً آسان اور اچھے اشعار کا انتخاب کرنے سے پہلے ان میں اصلاح بھی کی تھی ۔ اور موجودہ دیوان کے وہ شعر جو نسخہ حمیدیہ میں بھی موجود ہیں خاصی قطع برید کے بعد منظر عام پر آئے ہیں ۔ نسخہ حمیدیہ کا انتخاب کر لینے کے بعد بھی مرزا صاحب نے اپنے کلام پر نظر ثانی کی یا نہیں اس کے متعلق میرا خیال یہ ہے کہ وہ ایسا ضرور کرتے رہے ۔ اور خصوصاً جب کبھی انہوں نے کوئی نسخہ تحفتاً دینے یا مطبع بھیجنے کے لئے تیار کرایا تو نہ صرف ان کی صحت ہی کی بلکہ ان میں مناسب ترمیم بھی کہیں نہ کہیں ضرور فرمائی ۔ رضا لائبریری رامپور میں ان کے عہد کے لکھے اور چھپے ہوئے متعدد دیوان محفوظ ہیں ۔ ان کو دیکھنے سے مذکورہ خیال کی تائید ہوتی ہے ۔ میں آج کی صحبت میں انہیں ترمیموں اور اصلاحوں میں سے چند آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں ۔

چوں کہ میں دیوان غالب کے متعدد نسخوں کے حوالے دوں گا اس لئے پہلے ان کا آپ سے تعارف کرادوں ۔

(۱) قا سے مراد وہ قلمی نسخہ ہے جسے نواب خلد آشیاں والئی رام پور نے کسی معمولی کاتب سے نقل کرایا تھا ۔ اس کے اشعار کی تعداد ۱۰۶۷ ہے ۔ نواب ضیاالدین احمد خاں نیر نے ۱۸۳۸ء میں جو تقریظ دیوان لکھی تھی اس میں کل تعداد اشعار ۱۰۹۰ بتائی ہے ۔ تقریباً اتنے ہی شعر ۱۸۴۱ء کے مطبوعہ نسخے میں بھی ہیں ۔ 'قا' اس تقریظ سے خالی اور تعداد اشعار میں تقریظ والے نسخے سے کم ہے ۔ اس سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ یہ دیوان غالب قدیم کا پہلا انتخاب ہے

(۲) قب سے مراد وہ قلمی نسخہ ہے جو یونیورسٹی لائبریری دھلی کے نسخے سے میں نے رضا لائبریری کے لئے نقل کرایا تھا ۔ یونیورسٹی کا یہ نسخہ مئی ۱۸۴۷ء میں دھلی کے مطبع دارالسلام سے چھپ کر شائع ھوا ھے ۔ اس ایڈیشن کا ایک نسخہ بھی جو ابتدائی ورقوں کے بعد خاصا ناقص ھے سال گزشتہ لائبریری کے لئے خرید لیا گیا ۔

(۳) قج سے مراد وہ قلمی خوشخط نسخہ ھے جسے مرزا صاحب نے مئی ۱۸۵۷ء میں نواب فردوس مکان ناظم تخلص (والئی رام پور) کی خدمت میں ڈاک کے ذریعے سے بھیجا تھا ۔ یہ نسخہ ترتیب اصناف سخن میں غالب کے تمام قلمی اور مطبوعہ نسخوں سے مختلف ھے ۔ یعنی اس میں فارسی دواوین کی مروجہ ترتیب کے مطابق پہلے دیباچہ، پھرقطعات، پھر مثنوی، پھر قصائد، پھر غزلیات، پھر رباعیات اور پھر خاتمہ ھے۔

چونکہ مرزا صاحب نے بڑی احتیاط سے اس کی تصحیح کی ھے اس لئے تمام نسخوں کے مقابلے میں زیادہ معتبر اور مستند ھے ۔

(۴) ماسے وہ مطبوعہ نسخہ مراد ھے جو شعبان ۱۲۵۷ء (اکتوبر ۱۸۴۱ء) میں سرسید احمد خاں کے بڑے بھائی سید محمد خاں بہادر کے چھاپے خانے دھلی میں طبع ھو کر شائع ھوا تھا ۔ اس ایڈیشن کا ایک مکمل نسخہ صولت پبلک لائبریری رام پور میں اور اس ایڈیشن کی پرانی نقل رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ھے ۔ نیر کی تقریظ کے مطابق اس کے اشعار کی تعداد ۱۰۹۸ ھے ۔

(۵) مب سے وہ مطبوعہ نسخہ مراد ھے جو ۲۰ محرم ۱۲۷۸ ھ (۱۸۶۱ء) کو مطبع احمدی دھلی میں امو جان کے اهتمام سے چھپا تھا ۔ اس کے آخر میں مرزا صاحب نے ”عبارت خاتمہ دیوان،، کے عنوان سے لکھا ھے ۔

”داد کا طالب غالب گزارش کرتا ھے کہ یہ دیوان اردو

تیسری بار چھاپا گیا ھے - مخلص و داد آئین میر قمرالدین کی کارفرمائی اور خاں صاحب الطاف نشان محمد حسین خاں کی دانائی مقتضی اس کی ھوئی کہ اس جزو کا رسالہ ساڑھے پانچ جزو میں منطبع ھوا - اگرچہ یہ انطباع میری خواھش سے نہیں لیکن ھر کاپی میری نظر سے گزرتی رھی - اور اغلاط کی تصحیح ھوتی رھی - یقین ھے کہ کسی جگہ حرف غلط نہ رھا ھو - مگر ھاں ایک لفظ میری منطق کے خلاف نہ ایک جگہ بلکہ سو جگہ چھاپا گیا ھے - کہاں تک بدلتا ناچار جا بجا یوں ھی چھوڑ دیا - یعنی ''کسو،، بکاف مکسور و سین مضموم و واو معروف - میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ لفظ فصیح نہیں - قافیے کی رعایت سے اگر لکھا جائے تو عیب نہیں - ورنہ فصیح بلکہ افصح ''کسی،، ھے - واو کی جگہ یائے تحتانی- میرے دیوان میں ایک جگہ ''کسو،، بواو ھے - اور سب جگہ ''کسی،، بیائی تحتانی ھے - اس کا اظہار ضرور تھا - کوئی یہ نہ کہے کہ یہ کیا آشفتہ بیانی ھے - اللہ بس ماسوائے ھوس،،

(۶) مج سے مراد وہ مطبوعہ نسخہ ھے جو ذی الحجہ ۱۲۷۸ ھ میں کان پور کے مطبع نظامی سے شائع ھوا - یہ نسخہ سب سے چھاپا گیا تھا - اس لئے اس کے مطابق ھے -

(۷) مد سے وہ نسخہ' مطبوعہ مراد ھے جو منشی شونارائن نے اپنے مطبع مفید خلائق (آگرہ) میں ۱۸۶۳' میں چھاپا تھا -یہ نسخہ نقل ھے قج کی - اس لئے ترتیب کلام وغیرہ اس کے مطابق ھے -

چونکہ عام بازاری نسخے مج سے چھاپے گئے ھیں اس لئے وہ قج اور مد دونوں سے مختلف ھیں - اس تشریح و تعارف کے بعد میں آپ کے سامنے مرزا صاحب کے چند اشعار پیش کرتا ھوں - جن میں مختلف نسخوں کے اندر اختلاف الفاظ پایا جاتا ھے - میری دانست میں یہ کاتبوں کی دستبرد نہیں بلکہ خود مرزا صاحب کی ترمیمیں ھیں اس لئے قابل غور ھیں -

(۱) میری تنخواہ میں تہائی کا
ھو گیا ھے شریک ساھوکار

قج اور مد میں ''تہائی،، کی جگہ ''چہارم،، ہے - حقیقت کیا تھی اسے مرزا صاحب اور ان کا ساہوکار جانیں لیکن بظاہر ''چہارم،، بعد کی ترمیم ہے اور اس سے مقصود مبالغے کو حقیقت حال کے قریب کرنا معلوم ہوتا ہے -

(۲) میکدے میں ہو اگر آرزوئے گلچینی
بھول جا یک قدح بادہ بطاق گلزار

نسخہ' حمیدیہ اور عام نسخوں میں اس طرح ہے - لیکن قا اور ما میں ''بصحن گلزار،، ہے - اگر یہ حقیقت ہے کہ نسخہ حمیدیہ کی اصل میں بھی ''بطاق،، ہی ہے تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ مرزا صاحب نے انتخاب کے وقت ''بصحن،، بنایا، جو پہلی اشاعت تک داخل دیوان رہا - بعد ازاں پھر ''بطاق،، ہی بنا دیا لیکن مجھے نسخہ حمیدیہ کے مطبوعہ متن پر اعتبار نہیں ہے - اس لئے میری رائے میں پرانے دیوان کا لفظ بھی ''بصحن ،، ہی ہے - جو اس لئے درست معلوم ہوتا ہے کہ گلزار میں طاق کہاں - وہاں تو صحن ہی صحن نظر آتا ہے - لیکن ''طاق نسیاں،، کی شہرت نے مرزا صاحب کو مجبور کیا کہ وہ ''بھول جا،، کی رعایت سے ''صحن گلزرا ،، کو طاق گلزار سے بدل دیں ''طاق گلزار،، سے نفس گلزار مراد لیں - چنانچہ ۱۸۴۱ء کے بعد انہوں نے یہ تغیر کیا مگر اس سے اس شعر میں کوئی معنوی اضافہ یا صوتی لطف میری دانست میں پیدا نہیں ہوا -

(۳) مردمک سے ہو عزا خانہ اقبال نگاہ
خاک در کی تیرے جو چشم نہو آئینہ وار

متداول نسخوں کے برخلاف قا اور ما میں ''عزا خانہ یک شہر نگاہ،، ہے - نسخہ حمیدیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اصل میں بھی اس طرح تھا - لیکن بعد ازاں مرزا صاحب نے ترمیم کرکے ''عزاخانہ اقبال،، بنا دیا - جس سے مبالغے کی بے مزگی دور اور مضمون کی لطافت بڑھ گئی -

یہاں یہ عرض کرتا چلوں کہ عام طور پر شارحین غالب نے اس شعر کے پہلے مصرعے میں ''ھو،، کا فاعل ''نگاہ،، کو قرار دیا ھے۔ لیکن میری حقیر رائے میں مصحح نسخۂ حمید یہ نے جو ''عزا خانہ اقبال نگاہ،، میں اقبال کو نگاہ کی طرف مضاف قرار دیا ھے،، ان کی یہ رائے صحیح ھے اس صورت میں شعر کی نثر یہ ھوگی کہ۔

''جو چشم تیرے خاک در کی آئینہ دار نہ ھو (وہ) مردمک سے عزا خانہ اقبال نگاہ ھو جائے،، اور مطلب یہ ھوگا کہ جس آنکھ میں تیرے در کی خاک کا سرمہ نہ لگایا جائے خدا کرے اس کی کالی پتلی بجائے رونق اور خوبصورتی پیدا کرنے کے آنکھ کو نگاہ کی تاثیر اور رونق کے عزا خانے میں تبدیل کر دے یعنی اسے بے رونق اور بے اثر بنا دے۔،،

اور یہی صورت حال اس وقت بھی ماننا پڑے گی جب کہ ''یک شہر نگاہ،، ھو اور ''یک شہر نگاہ،، کا وھی مطلب ھوگا جو ''یک جہاں جمال،، یا ''یک شہر آرزو،، کا ھوتا ھے۔

(۴) دیدہ تا دل اسد، آئینہ یک پر تو شوق
فیض معنی سے خط ساغر راقم سرشار

نسخہ حمیدیہ میں یہ شعر اس طرح تھا۔

دیدہ تادل اسد، آئینہ یک سجدۂ شوق
فیض الفت سے رقم تا دل معنی سرشار

مرزا صاحب نے اس میں ترمیم کرکے قا اور ما میں یوں شائع کیا۔

دیدہ تا دل اسد آئینہ یک پرتو شوق
فیض معنی سے رقم تا کف راقم سرشار

بعد ازاں ''تا کف راقم،، کو ''خط ساغر،، میں تبدیل کر دیا جو آج زبان زد ھے۔ میری حقیر رائے میں یہ اصلاح بھی بہتر نہیں۔ رقم (تحریر مراد قصیدہ) کا فیض معنی (اوصاف مرتضوی) سے راقم و شاعر کے کف دست تک جس میں وہ قلم اور کاغذ پکڑتا ھے سرشار ھو جانا

دل چسپ اور حقیقت کے قریب مبالغہ ھے ۔ لیکن فیض معنی سے شاعر کے خط ساغر کا سرشار ھو جانا بہت دور کی بات ھے ۔ اور کچھ بامزہ بھی نہیں ۔

(۵) عشق بے ربطی شیرازہ اجزائے حواس
وصل زنگار رخ آئینہ حسن یقیں

نسخہ حمیدیہ میں یہ دوسرا مصرعہ تھا ۔ ''وصل افسانہ اطفال پریشاں بالیں،، مرزا صاحب نے پہلے انتخاب کے وقت اس میں تغیر کرکے بنا دیا ۔ ''وصل زنگار رخ روشن مراۃ یقین،، چنانچہ قا اور ما میں اس طرح نظر آتا ھے ۔ اگرچہ اس اصلاح نے مضمون شعر کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا تھا لیکن ابھی مصرعہ میں لفظی و معنوی دونوں طرح کی سستی اور جھول تھا ۔ ۱۸۴۱ء کے بعد پھر مرزا صاحب نے اس پر نظر ثانی کی اور ''روشن مراۃ،، کی جگہ ''آئینہ حسن،، رکھ کر مضمون میں لطف کا اضافہ بھی کر دیا اور بے کار لفظ کو حزف کرکے اور ثقیل کی جگہ ھلکا پھلکا لفظ رکھکر لفظی ثقالت بھی دور کر دی ۔

(۶) دل میں پھر گریے نے ایک شور اٹھایا غالب
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

قا میں ''شور مچایا،، ملتا ھے لیکن ما میں ''اٹھایا،، ھی ھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ھے کہ مرزا صاحب نے اس شعر میں ۱۸۴۱ء سے قبل ھی اصلاح کر لی تھی ۔ وجہ ترمیم یہ معلوم ھوتی ھے کہ ''شور مچانا،، زیادہ تر بچوں کی چیخ پکار کے لئیے بولا جاتا ھے ۔ مرزا صاحب جس تلاطم جذبات کو ظاھر کرنا چاھتے ھیں وہ اس محاورہ کے بس کا نظر نہیں آتا ۔ ''اٹھانا،، میں لفظ اور معنی دونوں کے لحاظ سے ''طوفان،، کے ساتھ ھم آھنگی ھے ۔ ادھر ایرانی مصدر ''انگیختن،، (یعنی اٹھانا) بھی شور و شر کے ساتھ استعمال ھوتا ھے ۔ اس لئے مرزا صاحب نے عام محاورہ ترک کرکے یہ نیا محاورہ انتخاب کیا ۔

(۷) نہ بندھے تشنگئی ذوق کے مضموں غالب
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

مب، مج اور بعد کے تمام نسخوں میں اس طرح ہے۔ لیکن قا، قب، قج اور ما، مد میں ''تشنگی شوق،، ملتا ہے۔ میری حقیر رائے میں یہاں شوق کا لفظ ذوق سے بہتر نظر آتا ہے۔ اس لئے ''ذوق،، اگر بعد کی ترمیم ہے تو کچھ بہتر ترمیم نہیں۔

(۸) پوچھ مت رسوائی انداز استغنائے حسن
دست مرہوں حنا، رخسار رہن غازہ تھا

قا اور ما میں پہلے مصرع کے اندر ''انداز،، کی جگہ ''پرواز،، ہے۔ میری دانست میں ''پرواز،، کی جگہ ''انداز،، نے نہ لفظی خوبی پیدا کی اور نہ معنوی بلکہ بنظر غائر دیکھا جائے تو انداز کےمعنی بھی یہاں ''پرواز،، ہی ہیں۔ اس لئے اگر اس لفظ کے حق میں کچھ کہا جا سکتا ہے تو یہ کہ اس کا استعمال مقابلتاً عام ہے۔

(۹) شوق ہے ساماں طراز نازش ارباب عجز
ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

قا اور ما میں ''ارباب عشق،، ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب نے ۱۸۴۱ء کے بعد یہ اصلاح کی ہے۔

(۱۰) مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایان دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

قا، ما، مب اور بعد کے تمام مطبوعہ نسخوں میں اس طرح ہے۔ لیکن قب، قج اور مد میں ''بازو،، کی جگہ ''خنجر،، ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ مرزا صاحب نے ۱۸۴۷ء سے قبل یہ اصلاح کی تھی۔ چونکہ مب ہی نے رواج پایا اور یہ اس اصلاح سے خالی تھا۔ اس لئے اہل ادب اس اصلاح سے واقف نہ ہو سکے۔ رہا اس کا مقابلتاً بہتر ہونا تو وہ اس سے ظاہر ہے کہ لفظ ''خنجر،، سے مفہوم میں معقول اضافہ ہو جاتا ہے۔

(۱۱) مر گیا پھوڑ کے سر غالب وحشی ہے ہے
بیٹھنا اس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس

قا میں ''پھوڑ،، کی جگہ ''مار،، ہے ۔ چونکہ 'سر پھوڑنا، میں وحشت کا اظہار ''مارنے کے مقابلے میں زیادہ ہے نیز ''سر مارنا،، کئی معنی کا احتمال رکھتا ہے جن میں سے بعض وحشت کی ضد بھی ہیں اس لئے ۱۸۴۱ء سے قبل ہی مرزا صاحب نے یہ اصلاح فرمائی ۔

(۱۲) مہرباں ہو کے بلالو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آبھی نہ آسکوں

قا میں اس غزل کی ردیف میں ''بھی ،، کی جگہ ''ہی،، ہے ۔ ما میں ''بھی،، کا وجود اس کی دلیل ہے کہ مرزا صاحب نے ۱۸۴۱ء سے قبل ترمیم کر دی تھی ۔ میری حقیر رائے یہ ہے کہ ''ہی،، میں جو معنوی قوت اور وسعت ہے وہ ''بھی،، میں کسی طرح نہیں ۔ ہاں صوتی زور اس سے ضرور پیدا ہو جاتا ہے ۔ جو معنی کے مقابلہ میں خود مرزا صاحب کے نزدیک بھی چنداں قابل لحاظ نہیں ۔

(۱۳) وہ تب عشق تمنا ہے کہ پھر صورت شمع
شعلہ تا نبض جگر ریشہ دوانی مانگے

قا اور ما میں ''چوں رشتہ شمع،، اور ''مغز جگر،، ہے اور قب میں متن کی طرح ہے ۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب نے ۱۸۴۷ء سے قبل ہی اصلاح فرمائی تھی ۔ لیکن اس اصلاح نے مضمون شعر پر کوئی معتدبہ اثر نہیں ڈالا ۔ چونکہ مرزا صاحب پختگی کو پھونچ کر ''چوں،، اور جوں،، سے پرہیز کرنے لگے تھے اس لئے مصرع اول میں لفظ ''صورت،، لانا پڑا تاکہ تشبیہی معنی پیدا ہو جائیں 'مغز، کی جگہ ''نبض،، لانا اس لئے مناسب تھا کہ ایک تو ''رشتہ شمع،، میں سے ''رشتہ،، گرایا جا چکا تھا جو شمع کے جلنے کے سلسلے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے ''نبض،، نے اس کی کمی کو پورا کر دیا ۔ دوسرے ''ریشہ دوانی،، کی مناسبت ''مغز،، کی جگہ ''نبض،، ہی کو چاہتی ہے ۔

(۱۴) میکده گر چشم مست ناز سے پاوے شکست
موئے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

قا قب اور ما میں ''ناز،، کی جگہ ''یار ،، ہے - نیز قا اور ما میں ''موئے شیشہ ،، کی جگہ ''موئے مینا،، ہے - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی اصلاح ۱۸۴۷ء کے بعد اور دوسری اس سے پہلے کر لی تھی -

(۱۵) ابھی آتی ہے بوبالش سے اس کی زلف مشکیں کی
ہماری دید کو خواب زلیخا عار بستر ہے

قا اور ما میں ''ہماری دید،، کی جگہ ''ہمارے ذوق،، ہے - اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مرزا صاحب نے ۱۸۴۱ء کے بعد یہ اصلاح کی تھی - یہاں ''دید،، سے مراد ''دیدار،، نہیں بلکہ رائے یا نظر ہے - اس لئے ''ذوق،، کی کوئی معنوی کمی اس سے پوری نہیں ہوتی - البتہ خواب کے ساتھ ''دید،، لانے میں لطف تضاد ضرور پیدا ہو جاتا ہے - میری حقیر رائے میں یہ تغیر بھی مرزا صاحب کی روش کے خلاف اور معنی میں غیر دلچسپ پیچیدگی پیدا کرنے کا موجب ہے- اس لئے مقابلتاً بھتر نہیں -

(۱۶) عارض گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسد
جو شش فصل بہاری اشتیاق انگیز ہے

نسخہ حمیدیہ، قا اور ما میں ''جلوۂ گل ،، ہے - جو اس کا ثبوت ہے کہ یہ تغیر ۱۸۴۱ء کے بعد کیا گیا ہے - یہاں یھی ''روئے یار،، کی مناسبت سے ''جلوہ،، کو ''عارض،، بنایا ہے - ورنہ از روئے معنی کوئی فرق نہیں پڑتا

(۱۷) سوزش باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں
دل محیط گر یہ و لب آشنائے خندہ ہے

قا قب قج اور ما اور مد میں ''شورش باطن،،ہے - غالباً کس سہو سے

مب میں پہلی بار اور پھر اس کے تتبع میں بعد کے نسخوں کے اندر ''شورش،، نے ''سوزش،، کی شکل اختیار کر لی ہے۔ جو مقابلتاً مضمون کے ساتھ ہم آھنگ بھی نہیں ۔ اس لئے کہ دل کا ''محیط گریہ،، ھونا اندرونی سوزش کا نہیں شورش و تلاطم کا متقاضی ہے ۔

(۱۸) وہ بدخو اور میری داستان عشق طولانی
عبارت مختصر قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے

قا قب اور قج اور ما اور مب میں ''داستان شوق،، ہے جو ''داستان عشق،، کے مقابلے میں بہتر ہے ۔ میری دانست میں یہاں بھی مب ھی کی وجہ سے یہ لفظ مشہور ھوا ورنہ غالب کی پسندیدہ ترکیب مقدم الذکر ھی ہے ۔

(۱۹) گدا سمجھ کے وہ چپ تھا میری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

مج کے کاتب نے نادانی سے ''جو شامت آئے،، کو ''خوشامد سے،، بنایا تھا ۔ اس کی تصحیح ھونے سے رہ گئی ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مطبع چشمہ فیض دھلی سے ۱۸۸۶ ء میں اور شاید اس زمانے کے لگ بھگ منشی نول کشور کے مطبع سے اور ۱۹۰۸ء میں مطبع نامی لکھنو سے جو نسخے چھپ کر نکلے ان میں بھی اس غلطی نے جگہ پالی ۔

اس طرح بعض نسخوں کے کاتبوں نے ''شامت آئے،، کو اپنی نظر میں غلط یا نامانوس سمجھا اور ''آئے،، کو ''آئی،، میں تبدیل کرکے شعر کو درست کر دیا ۔ چنانچہ سر عبدالقادر مرحوم کے مقدمے کے ساتھ جو نسخہ لاھور سے شائع ھوا تھا اس میں بھی یہ غلطی موجود ہے۔ ارباب ذوق ان دونوں فعلوں کے محل استعمال اور ان کے معنی کے نازک فرق کو اچھی طرح جانتے بوجھتے ھیں اس لئے اس تغیر کو بزم ادبا میں قبول عام حاصل نہ ھو سکا ۔

(۲۰) ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئے

مد میں پہلا مصرع یوں ہے ۔ ''ہے زلزلہ وصرصرو سیلاب کا عالم،، میری دانست میں مروج مصرع زیادہ اچھا ہے ۔ اس لئے کہ معشوق کے آنے کو بجلی کی کڑک شعلے کی لپک اور پارے کی چلت پھرت کہنے میں شعریت ہے۔ اس کے لئے بھونچال کا آ جانا آندھی کا چلنا اور سیلاب امڈ آنا بولنا زیب نہیں دیتا ۔ اندریں صورت اگر یہ ترمیم مرزا صاحب ہی کی ہے تو بادل ناخواستہ قبول کرنے کی ہے ۔

(۲۱) یعنی ہر بار کاغذ باد کی طرح
ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لئے

نسخہ حمیدیہ میں پہلا مصرع اس طرح تھا ''مغرور وفا نہ ہو کہ جوں کاغذ باد،، اس میں ترمیم کرکے مرزا صاحب نے ''یعنی ہر بار کاغذ باد کی طرح،، بنایا ۔ چنانچہ قا اور ما میں اس طرح ہے۔ لیکن قج اور مج میں ''صورت کاغذ باد،، ہے ۔ چونکہ مرزا صاحب خود اپنے بعض شاگردوں کی اصلاح میں یہ ظاہر کر چکے ہیں کہ ''طرح،، بسکون کا استعمال مثل و مانند کے معنی میں انہیں پسند نہیں ۔ اس لئے میں اس ترمیم کو اصلاح مانتا ہوں ۔ اور چونکہ یہی صورت قب میں بھی ہے اس لئے یہ اصلاح ۱۸۴۷ء کے بعد کی ہے۔ مگر مجھے تعجب ہے اس پر کہ مد میں جو قج کی نقل سے چھاپا گیا ہے یہ اصلاح کیوں نظر نہیں آتی ۔ اور مج میں جو مب سے طبع ہوا ہے ''صورت کاغذ باد،، کیوں ہے ۔

راجندر ناتھ شیدا

غالب کا شعور۔ ایک مُطالعہ

ایک زمانہ تھا جب، ہم کسی شاعر کا کلام پڑھتے وقت اس کے ماحول کو سمجھنے کی چنداں کوشش نہیں کرتے تھے۔ ہمیں اشعار کے نشتر دل کی رگوں میں پیوست ہوتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ انبساط اور کیفیت کی لہریں ابھرتی تھیں اور گدگدی ہوتی تھی۔ کبھی کبھی اخلاقی، صوفیانہ اور مذہبی شاعری میں اپنے عقائد کی ترجمانی کا احساس بھی ہمیں ہوتا تھا۔ ہم اس قسم کی شاعری سے استفادہ بھی کرتے تھے اور اس کی اشاعت کے لئے مختلف طریقوں سے کوشش بھی۔ یہ سب کچھ تھا۔ مگر اس کی کوئی خاص فکر نہیں رہتی تھی کہ شاعر نے جن خیالات اور جذبات کو لفظوں کے ان دل کش پیرایوں میں پیش کیا ہے آخر اس کا سرچشمہ کیا ہے۔ شاعر کا شعور بنا کیسے۔ اس کی ذات نے ہم عصر سماجی زندگی کے کون سے دھاروں سے ٹکرا کر مترنم لہروں کا یہ دل فریب جال پھیلایا ہے۔ اور اب۔ اب ہم شاعری کو محض اپنے جذبات کے تاروں پر زخمہ زن ہوتے ہوئے ہی محسوس کرکے مطمئن نہیں ہو سکتے۔ بلکہ ساتھ ہی شاعر کے پورے شعور کا جائزہ بھی لینا ضروری سمجھتے ہیں۔

یہ تو ظاہر ہی ہے کہ شعور مادی زندگی کی پیداوار ہے۔ اس کے نشیب وفراز، عمل اور رد عمل انجماد اور ارتقأ سب اپنے ماحول سے متاثر بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ماحول ہی کی پیداوار ہوتے ہیں۔ اس لئے آج کسی شاعر کا مطالعہ اس وقت تک ناقص سمجھا جاتا ہے جب تک کہ قاری نے شاعر کے شعور کو اس کے سماجی پس منظر میں رکھ کر جذبات کے صحیح محرکات کو سماجی زندگی کے حقائق میں تلاش نہ کیا ہو

غالب پر کافی معلوماتی اور مفید کام ہو چکا ہے اور انکے مکاتیب نے اس کام میں بہت مدد دی ہے ۔ چنانچہ اب اندھیرے میں ان کی ذات اور شاعری کو ٹٹولتے پھرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی ۔ پھر بھی اس سارے کام پر ایک عبوری نظر ڈالنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوششیں غالب کی ذات ، فن اور انفرادی ماحول سے زیادہ متعلق رہیں ۔ اس وقت کی سماجی زندگی سے ان کی شاعری کو منسلک کرنے کی کوششیں بہت کم کی گئی ہیں ۔ بہر کیف اب ضرورت اس بات کی ہے کہ دور غالب کی ٹھوس حقیقتوں اقتصادی، سیاسی، سماجی، اور تہذیبی ماحول اور ان کے ارتقاً کو سمجھ کر ان کے شعور اور شاعری کی صحیح اقدار متعین کی جائیں ۔ مگر یہ کام فرصت بھی چاھتا ہے اور محنت بھی ۔ اس مختصر مقالے میں تو ہمارا مقصد محض غالب کی اردو غزلوں کو ان کے سماجی پس منظر میں رکھ کر ان کے کچھ موٹے موٹے خطوط کی طرف اشارہ کرنا ہے ۔

ابتدا ھی میں یہ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے متعلق جو کچھ بھی کہا جائے گا اس کا اطلاق اس وقت تک کی اردو غزل کی پوری تاریخ پر کم وبیش صحت کے ساتھ ہو سکتا ہے ۔ اس کی وجہ ظاہر ہے ۔ جس قسم کے جاگیردارانہ ماحول میں غالب کا شعور بنا تھا تقریباً اسی ماحول میں غزل نے ارتقائی منزلیں طے کیں ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کہیں یہ رجحانات دھندلے نظر آتے ھیں کہیں روشن ۔ جیسے جیسے جاگیرداری پر انحطاط غالب آتا جاتا ہے ماحول کے یہ اثرات بھی شعور پر گہرے ہوتے جاتے ھیں ۔ غالب کا دور انتہائی انحطاط کا دور تھا ۔ چنانچہ ایسے ادوار کا ادب قدرتی طور پر اپنے مخصوص رجحانات کو نسبتاً زیادہ نمایاں طور پر پیش کرتا ہے ۔

شعور کی آفاقیت کے دعوے اکثر اوقات گمراہ کن ہوتے ھیں۔ طبقاتی ، وقتی اور مقامی حقائق کا صحیح علم نہ ہونے سے ہم بہت سی چیزوں کو ان کے صحیح پس منظر میں نہیں رکھ سکتے ۔ اور ان کے متعلق فریب میں مبتلا ہو جاتے ھیں ۔ شاعر سماج کا آئینہ ہو،

جام جہاں نما ہو یا ایسا کوئی مفید آلہ ہو جو حال کی زندگی میں تحریک پیدا کرنے کے ساتھ تعمیر مستقبل کے بھی کام آئے - بہر صورت اس کا کام ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا - غالب اپنے وقت کے ایک بہت بڑے فنکار تھے - ان کی شاعری میں ہم عصر زندگی کے بہت سے پہلو نظروں کے سامنے آتے ھیں - ان کے قلم میں حیرت انگیز صلاحیت تھی گو ناگوں جذبات انسانی کے نقوش ابھارنے کی، اس سے انکار ممکن نہیں، لیکن انکا شعور بھی پیداوار تھا اپنے ماحول کا ھی یہ بھی اپنی جگہ پر اٹل حقیقت ھے -

جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ھے غالب کا دور زوال پذیر جاگیردارانہ دور تھا جس کے طبقاتی نقوش بڑھاپے کی موٹی موٹی رگوں کی طرح سماج کے پورے جسم پر نمایاں ہو چکے تھے - ان کی جھلکیاں ھمیں غالب کی شاعری میں بھی ملیں گی - یہ دوسری بات ھے کہ وہ اپنے تخیل کی رنگ آمیزی سے بظاھر کریہہ مناظر میں بھی جاذبیت پیدا کرنے میں اکثر اوقات کامیاب ہو جاتے ھیں -

اس سلسلے میں ایک اور بات یاد رکھنے کی ھے کہ اقتصادی نظام جاگیردارانہ ہو یا کوئی اور شعور کے لئے سانچہ نہیں بن سکتا - محض اس کی حدیں اور سمتیں متعین کرتا ھے - ان حدوں میں رہتے ہوئے ھمارے ذھن کو ھر طرح کی آزادی حاصل ہوتی ھے جس سے ایک ھی سماجی ماحول میں رھنے والے مختلف افراد کے نقطہ نظر میں ایک حد تک تنوع کی گنجائش رھتی ھے - کیونکہ آخر اور چیزیں بھی تو ھیں شعور کی تخلیق میں حصہ لینے والی - مثلاً روایات، مزاج، معاشرت -

اب ان کی حدوں پر غور کرنا چاھئے جن میں رہ کر غالب سوچ سمجھ سکتے تھے - طبقاتی نظام میں جیسا کہ غالب کا تھا زندگی اور شعور میں ایک طرح کا تصادم ناگزیر ہو جاتا ھے - اپنی زندگی کو محفوظ، خوش حال اور مطمئن بناتا ھے - لہذا معمولی حالات میں شعور کا کام (مادی ضرورتوں کی متابعت میں) اسی مقصد کے حصول میں مدد دینا ھونا چاھئے تھا - لیکن عملی زندگی میں جذبے کا یہ دھارا تاریخ

کی غیر مسطح زمین پر پیچ و خم کھاتا ہوا چلا اور اس نے شعور کی پوری کائنات کو (جس میں فلسفہ، مذہب، اخلاق، تہذیب اور تمدن سبھی شامل ھیں) اپنی رو میں بہا لیا اور ھم شعوری اور غیر شعوری طور پر اپنے مفاد کے لئے نہیں بلکہ ایک مختصر اقلیت کے مفاد کے لئے سوچنے لگے - یہی بنیادی تضاد ادب میں نہ صرف عینیت اور انفرادیت کی شکلوں میں رو نما ھوتا ھے بلکہ ان عناصر کو طبقاتی نظام کے ادب میں غیر معمولی اھمیت بخشتا ھے -

غالب کی اردو غزلوں میں عینیت اور انفرادیت تلاش کرنا کوئی مشکل کام نہیں - آئیے پہلے عینیت ھی کو لیں - ھم جانتے ھیں کہ اگرچہ غالب کی طبیعت میر اور فانی کی طبیعت نہیں تھی- وہ زندگی پر روتے ھی نہیں تھے قہقہے بھی لگاتے تھے - دنیا کے بازیچہ اطفال کا ھمیشہ تماشا ھی نہیں کرتے تھے - کبھی کبھی بچہ بن کر اس کے کھیلوں میں شامل بھی ھوتے تھے - مگر واقعہ یہ ھے کہ ان سب کے باوجود وہ اس کھیل کو زندگی کی حقیقت نہیں بلکہ کھیل سمجھکر کھیلتے تھے - ان کی نظر واقعاتی زندگی پر مرکوز نہیں تھی اور در اصل ان کی حقیقی دنیا خیالات کی دنیا ھی تھی - مرکزی نقطۂ نظر تو یہ تھا کہ

ھاں کھائیو مت فریب ھستی
ھر چند کہیں کہ ھے نہیں ھے

ھستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقہ دام خیال ھے -

جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور
جز وھم نہیں ھستی اشیاء مرے آگے

ھے مشتمل نمو و صور پر وجود بحر
یاں کیا دھرا ھے قطرہ و موج حباب میں

اور اس لئے انہیں آدمی جہد حیات میں مصروف اور ارتقاً کے لئے کوشاں سماج کا ایک ذی حیات فرد نظر آنے کی بجائے ایک ایسا

''محشر خیال،، معلوم ہوتا تھا جو محض اپنی خلوت کو انجمن میں منتقل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

ہستی کو فریب سمجھ کر مادے کے وجود سے قطعی انکار کرنا عینیت کا انتہا پسند نظریہ ہے ۔ اس عینیت سے قدرتی طور پر دو شاخیں پھوٹتی ہیں ۔ مابعدالطبیعت اور مثالیت ۔ مادہ سے ماوراء روح اور اس سے متعلق ایک پوری کائنات کا تصور اور پھر اس سے متعلق پیچ در پیچ بحثیں ہزار سال سے فلسفے کا ایک اہم جزو رہی ہیں ۔ غالب کے زمانے میں مہذب سماج کا مرغوب روحانی فلسفہ تصوف تھا ۔ اور شاعروں میں تو اسے اور بھی زیادہ مقبولیت حاصل تھی ۔ کیونکہ اس کے بارے میں ''برائے شعر گفتن است،، کہا گیا تھا ۔ پھر ہماری شاعری کو اس سے ایک بڑی حد تک فطری اور روایاتی تعلق تھا ۔ اس لئے غالب کی شاعری اس سے بے نیاز کیسے رہ سکتی تھی ۔ ظاہر ہے کہ تصوف کے متعلق ان کی معلومات بہت اچھی تھیں ۔ ان کی شاعری میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں جہاں تصوف کے مختلف مقامات اور مسائل کو بہت خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے ۔ وہ تو سمجھئے خیر ہوئی بادہ خواری نے بچا لیا ورنہ اچھے خاصے انسان سے ولی بن جانے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی ۔

اب عینیت کی دوسری شاخ مثالیت پر آئیے ۔ دو شعر ہیں غالب کے ۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا لیتے
عرش سے پرے ہوتا کاش کے مکاں اپنا

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخئی فرشتہ ہماری جناب میں

بظاہر ان اشعار میں انسانی عظمت کا اظہار ہے ہم آج بھی انسان کی عظمت کا احساس رکھتے ہیں ۔ لیکن بغور دیکھا جائے تو موجودہ زمانے میں انسان کی حیرت‌انگیز صلاحیتوں کے متعلق جو احساس اور اس کی

عملی قوتوں پر جو اعتماد پیدا ہوتا جا رہا ہے اس سے اس عظمت کا کوئی علاقہ نہیں - کیونکہ عہد حاضرٗ کا احساس اور اعتماد نتیجہ ہے قوائے فطرت کی تسخیر کا جو انسان کے ذہنی ارتقاً اور پیہم جد و جہد کے ذریعہ عمل میں آئی، جب کہ ان تصورات کی عظمت کا انحصار غیب کی ودیعت فرمودہ روحانی قوتوں پر ہے - بد یہی طور پر ان دونوں کے مقاصد میں بھی فرق ہے - اول الذکر کا مقصد نظام ارضی کی حسب خواہش تشکیل ہے تو موخرالذکر کا مقصد اپنی روحانی صلاحیتوں کی مدد سے جزو کو کل میں فنا کرنا ہے - جیسا کہ اس شعر میں کہا گیا ہے۔

پر تو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

اور اس مابہ الا متیاز صلاحیت کے احساس نے ان سے ایک مرتبہ یہ بھی کہلوایا تھا -

گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

انفرادیت کی جڑیں جس زمین میں ہیں اس کا دیکھنا بھی ضروری ہے - جاگیردارانہ نظام میں حاکم طبقہ سماج پر اس طرح حاوی تھا کہ عوام کو کسی قسم کی سیاسی اور اقتصادی تحریک اور تنظیم کے لئے وہ معمولی اختیارات بھی حاصل نہیں تھے جو اس جمہوریت کے دور میں حاصل ہیں - اجتماعی شعور کے سرسبز ہونے کے لئے کچھ نہ کچھ موافق فضا تو چاہئے ہی - ایسا نہ ہونے کی صورت میں عوام کے محبوس شعور کے لئے مصالحت پسند فلسفے، اخلاق اور معاشرت کا اختراع کرنا ضروری ہو گیا - جس کا اثر ادب کی پوری فضا پر انفرادیت، انفعالیت، قنوطیت اور ایذا طلبی کی صورت میں پڑا - انسان کی شکست خوردہ ذہنیت دنیا کے نظام میں مستقل اور ناقابل تغیر حقائق اور اصول تلاش کرنے لگی - ایسا محسوس ہوا کہ خونی ناچ میں محو بے وفا اور ظالم فطرت انسانوں کی طرف فنا کے بے پناہ تیر سر کرتی جا رہی ہے - اور ہم

زخموں سے بے دم ہو ہو کر یکے بعد دیگرے زمین پر گرتے اور سپرد خاک ہوتے جا رہے ہیں ۔ ہمیں زندگی میں اپنے فطری احساس سے نفرت پیدا ہو گئی ۔ انہی کو ہم نے اپنے سارے مصائب کا سرچشمہ قرار دیا اور ضبط نفس کو نجات کا واحد ذریعہ، غرض زندگی کی بے ثباتی ار موت کی اٹل حقیقت نے ہمارے شعور کی پوری فضا کو گھیر لیا۔ اور ہم اس دنیا سے مایوس ہو کر عالم غیب میں اپنی آرزؤں کی جنت تعمیر کرنے لگے ۔ شعور کے افق پر جو چیزیں خاص طور پر ابھر آئیں وہ تھیں شکوۂ روزگار، زندگی کی ناپائداری کا غم، قنوطیت اور موت ۔ دیکھئے غالب کہتے ہیں ۔

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی
دوام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولا برق خرمن کا ہے خون گرم دھقاں کا

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

غم گرچہ جاں گسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

بس ہجوم نا امیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعئی بے حاصل میں ہے

ظاہر ہے کہ آدمی ہمیشہ ایذا اور موت سے بچنا چاہتا ہے ۔ یہ اس کی فطرت ہے ۔ لیکن سماج کے شکنجے سخت ہونے کی وجہ سے ہم انہی کو دعوت دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں ۔ انسان اکثر اوقات انہیں کو اپنی زندگی کا مقصود بنا لیتا ہے ۔ یہ کوئی شعور کی صحت مندی کی علامت نہیں ہے ۔ نفسیاتی طور پر اسے غیر معمولی یا معکوس ذہنیت کہنا ہوگا ۔ ان شعروں میں اس کی کار فرمائی دیکھئے ۔

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا ۔

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

شق ہو گیا ہے سینہ خوشالذت فراق
تکلیف پردہ داری زخم جگر گئی

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
پر گل خیال زخم سے دامن نگاہ کا

گھٹن پیدا کرنے والے اس سماجی نظام میں محبوس ہو کر روح حیات ایک طرح کی انفعالیت اور شکست خوردگی کا شکار ہو جاتی ہے ۔ اسے اپنی صلاحیت پر بھروسہ نہیں رہتا ۔ اور اس خیال سے دل کو تسکین دینے اور زندگی کے غم و الم کو بھولنے کی کوشش کرتی ہے ۔

رات، دن گردش میں ہیں سات آسماں — ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

جن چیزوں کا ذکر اوپر کیا گیا ہے وہ جاگیردارانہ ادب، میں کم و بیش سب جگہ ملتی ہیں ۔ ایسے ادب میں محبت کا غیر معتدل استعمال بھی قدرتی امر تھا ۔ غالب کی غزلوں میں بھی اس کی کثرت نہ ہونا حیرت انگیز بات ہوتی ۔ طبقاتی سماج کے ادب میں عشق کی اس قدر فراوانی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی کو دیکھتے ہیں اوپر کے طبقے کی نظر سے جو فکر معاش اور زندگی کی جدو جہد سے آزاد ہو کر اپنی تقریباً پوری ذہنی قوت کو جنسی مسائل پر مرکوز کر دیتا ہے ۔ بہر کیف غالب کے یہاں عشق کے نہ جانے کتنے مختلف جذبات نظم ہوئے ہیں ۔ اور حقیقت یہ بھی ہے کہ ان میں سے کچھ کو دنیا کی بہترین عشقیہ شاعری کے مقابل میں رکھا جا سکتا ہے ۔ اس کے باوصف غالب کی عشقیہ شاعروں کے کچھ پہلو ایسے بھی ہیں جو آج کے بدلے ہوئے سماج اور مذاق میں ہمیں مضحکہ خیز محسوس ہوں گے ۔

غالب کے یہاں نہ حسن کا کوئی واضح تصور ملتا ہے نہ عشق کا ۔ محبوب کی صحیح جنس کا تعین تک دشوار ہے ۔ کیونکہ ایک ہی شعر میں سبزۂ خط کے ساتھ کاکل سرکش کا ذکر بھی آتا ہے کچھ اعضا اور خصائل کا ذکر ہے ۔ لیکن وہ اسقدر مبہم ہے کہ اس سے اس سلسلہ میں کسی نتیجے پر نہیں پہونچا جا سکتا ۔ محبوب کی بد اخلاقی عیاری، بے وفائی، وعدہ خلافی، شراب نوشی، ستم رانی اور اغیار سے اختلاط وغیرہ کا ذکر البتہ عام ہے ۔ جن کے سبب اگر اسے عورت بھی فرض کر لیا جائے تو یہ علامتیں اسے ارباب نشاط سے بہت مشابہ کر دیتی ہیں اور کہیں کہیں تو دھول دھپا اور غیر کو بوسہ دینے پر تکرار کی نوبت آجاتی ہے ۔ اس کے علاوہ محبوب انسان کہاں ہوتا ہے اور کہاں خدا ہوتا ہے ان کے درمیان خط فاصل کھینچنا بھی کوئی آسان کام نہیں ۔ یہی حال محبت کے داخلی جذبہ کا ہے ۔ وہی ابہام اور انتشار کی کیفیت یہاں بھی ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ دام محبت میں گرفتار ہونے کے بعد شاعر انسان نہیں رہتا ۔ بلکہ ایک عجیب و غریب مخلوق بن کر ہمارے سامنے آتا ہے ۔ وہ عشق کا مسمریزم دکھاتے دکھاتے عینیت اور مثالیت کے سہارے اکثر اوقات فطرت کی حدیں پار کرکے عجائیبستان کی نئی دنیا میں پہونچ جاتا ہے ۔ جہاں جنون عشق اسے صحرا نوردی پر مجبور کرتا ہے ۔ یہاں کی پر خار راہیں اس کے پاؤں کے آبلوں کے لئے پیغام مسرت بنتی ہیں ۔ اسے اپنے جوہر اندیشہ کی گرمی کا کچھ خیال آتا ہے تو صحرا جل اٹھتا ہے صحرا کا تو یہ حشر ہوا ۔ اب رہیں بستیاں سو وہ بھی غالب کے برابر روتے رہنے سے ویران ہوئے بغیر کیسے بچ سکتی ہیں ۔ غرض اسطرح عجائیبستان کی اس نو ایجاد دنیا کا خاتمہ بالخیر ہوتا ہے ۔

اس کے بعد غالب تیغ و کفن باندھکر اس مقتل کی طرف جاتے ہیں جس میں ان گنت عاشقوں کی شہادتوں کے سبب ایسی جوئے خون بہنے لگی ہے کہ محبوب کا توسن تو اس میں تیرتا پھرتا ہے ۔ وہاں شرف شہادت حاصل ہونا کوئی آسان کام تو نہیں تھا مگر یہ بھی غالب تھے

اپنے نام کے ۔ اور پھر سچا جذبہ شہادت آخر شہید ہو کر ہی رہے ۔
یہ غیر معمولی سعادت حاصل ہونے کے بعد ان کی روح شہر دلدار کی فضاؤں
پر اس طرح نخمہ بار ہوئی ۔

گلیوں میں میری لاش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سر رہ گزار تھا

لوگ مرحوم کی اس طرح بے حرمتی کرنے کو تیار تو نہ تھے مگر
کیا کرتے مجبوراً کھینچے پھرے مگر کہاں تک آخر کار لاش کو تجہیزو
تکفین کے لئے کوئے یار میں لائے ۔ وہ چاہتے تھے اس شہید اعظم کو کوئے دلدار
ہی میں دفن کریں ۔ یکایک کسی نے کہا ۔ خبردار اس سے مرحوم کی روح
کو صدمہ پہونچے گا ۔ دیکھتے نہیں انہوں نے ایسا کرنے سے منع کیا تھا ۔

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعد قتل
میرے پتے سے غیر کو کیوں تیرا گھر ملے

مجبوراً بے چارے اس ''عجیب آزاد مرد،، کی لاش کو بے
گوروکفن وہیں چھوڑ کر چلے گئے ۔ کچھ زمانے میں لاش سڑ گل کر
خود بخود خاک میں مل گئی ۔ لوگ بھول سے گئے تھے ۔ مرحوم کا ایک روز
یکایک اس مانوس آواز میں یہ کیف آور نغمہ فضا میں گونجنے لگا ۔

اڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں
بارے اب اے ہوا ہوس بال و پر گئی

چلئے داد پوری ہو گئی ۔

ذکر آچکا ہے کہ جاگیردارانہ نظام میں شعور زندگی سے دور
بھاگنے کی کوشش کرتا ہے ۔ انحطاط کے زمانے میں یہ اور بھی بڑھ جاتا
ہے ۔ فکر جاگیرداری کی چہار دیواری میں محبوس اور حیات سے دور ہونے کی
وجہ سے طرح طرح کے غلط تصورات میں پناہ لینے اور سیدھا میدان نہ
پا کر سرکس کے گھوڑے کی طرح مقررہ احاطے میں کرتب دکھانے
لگتی ہے ۔ اس کرتب کی چند مثالیں ہم اوپر دیکھ آئے ہیں ۔ یہاں ایک

مثال اور لیجئے اس سے معلوم ہوگا کہ یہ مثالیت او عینیت مل کر شاعر کے اخلاق کو کس صورت میں ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں -

ایک حد تک قربانی کا تصور عشق کے ساتھ ہمیشہ وابستہ رہا ہے - اختلاف اگر ہے یا ہو سکتا ہے تو شرائط اور حدود کے متعلق، اصول پر نہیں - بہر حال جاگیردارانہ شاعری کی عام فطرت کو مثالیت سے مناسبت تو ہوتی ہی ہے اردو کے عشق نواز شاعر کو شدید جذبہ کی رو میں اقتصادی تکالیف اور مسائل اور عزیز و اقارب کا تو خیال تک نہیں آتا - بھلا یہ حقیر چیزیں سچی محبت کی راہ میں کیسے حارج ہو سکتی ہیں وہ تو وقف عشق ہو چکا ہے- محبت کے زخموں کو سینوں میں چھپائے پھرتا ہے - ناصحوں کی نصیحتیں، دوستوں کی غم خواریاں، چارہ سازوں کے معالجے (جن میں زندان، طوق اور سلاسل بھی شامل ہیں) ان میں کوئی بھی چیز اس کے عزم محکم پر اثر انداز نہیں ہو سکتی - ہزاروں بار جینے کے لالے پڑتے ہیں، بار بار اجل آتی ہے - مگر ابھی جادۂ عشق جو طے کرنا ہے وہ پھر زندہ ہو جاتا ہے - رسوائی کا تو کہنا ہی کیا وہ تو بہر حال ان کاموں میں ہوتی ہی ہے - لڑکے گلیوں میں پتھر مارتے ہیں مگر ان باتوں سے کہیں نشہ عشق اترتا ہے -

غالب ایثار میں کسی سے کم کیسے رہیں - وہ عام طور پر خود دار شخص مشہور ہیں - آپ کو یاد ہوگا وہ شعر ان کا -

بندگی میں بھی وہ آزاد و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

کس قدر خودداری ہے اس شخص میں، مگر محبت میں خودداری کیا معنی-مومن نے دشنام یار کو شربت کا گھونٹ سمجھکر ھضم کر لیا تھا - تو کیا غالب ان سے بھی پیچھے رہتے - وہ مومن سے بھی دو قدم آگے بڑھتے ہیں - کس انکسار سے فرماتے ہیں -

دے وہ جسقدر گالی ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا ان کا پاسبان اپنا

دیکھئے وہ محبوب کی ھی نہیں اس کے پاسباں کی گالی کو بھی دوستانہ دل لگی کہہ کر ھنسی میں ٹال گئے اور کس طرح خودداری کا پہلو بچا کر ۔

لیجئے پاسباں کا ذکر آ گیا ھے تو عشقیات کے اس صیغہ پر بھی غور کر لیں ۔ آخر کیا وجہ ھے کہ غزلوں کے اس عشق میں محفل، ساقی، شراب، ندیم، قاصد اور دربان وغیرہ کا ذکر اس کثرت سے ملتا ھے اور غالب کے یہاں تو اس کی اور بھی فراوانی ھے ۔ دیکھا جائے تو یہ چیزیں عوام تو کیا متوسط طبقہ کی بھی زندگی کا حصہ نہیں ھو سکتی تھیں، اگر یہ ممکن تھیں تو محض اعلا طبقہ کے لئے جن کی زندگی میں یہ کوئی لاینحل اقتصادی مسائل پیدا نہیں کرتی تھیں ۔ کیا آپ سمجھتے ھیں کہ یہ محض رسمی تھیں اور اس عشق کے طبقاتی کردار کی غمازی نہیں کرتیں ۔ اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے تو یہ سوال پیدا ہوتا ھے کہ شاعر کا ذھن انہی کی طرف کیوں منتقل ھوتا تھا ۔ اس کو آخر اتنا مہنگا عشق مول لینے کی کیا ضرورت تھی ۔ کچھ بھی سہی اتنا تو ماننا ھی پڑے گا کہ شاعر کے شعور کے لئے اعلا طبقہ کی زندگی اور تہذیب میں کچھ نہ کچھ کششً ضرور تھی ۔ ایک جگہ تو غالب نے صاف صاف یہاں تک کہا ھے ۔

ھمیشہ شعر کہنا کام تھا والا نژادوں کا
سفیہوں نے دیا ھے دخل جب سے بس یہ فن بگڑا

فنکار کا اسلوب بھی مواد کی طرح شعور ھی کا ایک جزو ہوتا ھے ۔ اس لئے ماحول کا اثر مواد کے ساتھ انداز بیاں پر بھی پڑتا ھے ۔ جب فنکار کی فکر زندگی سے سیراب نہیں ھوتی تو اس کی جدت پسند طبیعت کا زور لایعنی تکلفات اور موشگافیوں میں صرف ھونے لگتا ھے ۔ اس کی تخلیقات میں تاثیر کی صلاحیت کم ھو جاتی ھے ۔ اور جدت طرازی کی تمنا صرف لفظی ھیر پھیر اور تراش خراش اور لسانی اور عروضی داؤ پیچ کی مشق کرنے لگتی ھے ۔ اس کا نتیجہ یہ ھوتا ھے

که فن لطیف اپنا مقصد بھول کر ایک طرح کا فن شعبدہ بازی بن جاتا ھے -

غالب کے یہاں یہ رجحانات کئی شکلوں میں رونما ھوتے ھیں (مضحکہ خیزی کی حد تک) - مبالغہ کے غیر معتدل استعمال کی شکل میں اور لفظی بازی گری کی شکل میں (جس میں رعایت لفظی، اجتماع ضدین اور اکثر صنائع وغیرہ شامل ھیں) پھر لفظی بازی گری بھی طرح طرح کی ھوتی ھے - جس کی مثالوں سے اردو شاعروں کے دواوین بھرے پڑے ھیں - ذیل کے اشعار میں باقی رجحانات کی کارفرمائی دیکھئے -

عرض کیجے جوھر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت میں کہ صحرا جل گیا
میں عدم سے بھی پرے ھوں ورنہ غافل بارھا
میری آہ آتشیں سے بال عنقا جل گیا
مری ھستی فضائے حیرت آباد تمنا ھے
جسے کہتے ھیں نالہ وہ اسی دنیا کا عنقا ھے

دیکھئے انھیں اپنی مشکل پسندی کا کتنا شدید احساس ھے اور اس کا اظہار کس دعوے کے ساتھ کرتے ھیں -

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ھے
خوش ھوں کہ میری بات سمجھنا محال ھے
آگہی دام شنیدن جس قدر چاھے بچھائے
مدعا عنقا ھے اپنے عالم تقریر کا

اوپر شعور غالب کی حدوں کا ذکر کیا گیا ھے - ان میں رہ کر سوچنا ان کے لئے ایک ناگزیر تاریخی ضرورت تھی - غالب کو پڑھتے وقت اس بات کو ذھن میں رکھنا ضروری ھے کہ زندگی کے ارتقا نے آج ان حدوں کو خود بخود توڑ دیا ھے اور شاعری نئی فضا میں سانس لینے لگی ھے - غزل اور دوسری اصناف بھی - غالب نے ان حدوں میں

رہتے ہوئے بھی جو سدا بہار پھول کھلائے ہیں وہ آج بھی اپنے پورے
شباب پر ہیں جیسا کہ شروع ہی میں کہا گیا ہے ۔ یہ سطریں محض اس
ضرورت کو واضح کرنے کی غرض سے لکھی گئی ہیں کہ جب ہم کسی
شاعر یا ادیب کا مطالعہ کریں تو اس کا پورا شعور سمجھنے کی کوشش
کرنی چاہئے اور ہمعصر سماجی نظام سے شعور کے باہمی روابط کا
پتہ چلانے کے ساتھ ہی ہمارے لئے اس عہد میں ترقی اور انحطاط کی
باہمی کشمکش اور مختلف النوع تحریکات کا سمجھنا بھی ضروری ہے
چونکہ محض اسی صورت میں ہم شعر و ادب کی صحیح قدروں کا اندازہ
لگا سکتے ہیں ۔

غالب کے خطوط، صفیر بلگرامی کے نام

صفیر بلگرامی (۱۲۴۹ تا ۱۳۰۷ھ) غالب کے دوست صاحب عالم مارہروی کے حقیقی نواسے تھے - ان کی شعر گوئی کا آغاز تو زمانہ طفلی ھی میں ہو چکا تھا اور غالب سے تعلق پیدا ھونے کے قبل تین چار استادوں سے اپنے کلام پر اصلاح لے چکے تھے - لیکن جب ۱۲۸۰ھ میں ان کا مارہرہ جانا ہوا تو وہاں انہوں نے ''غالب کا چرچا اور ان کا ذکر بہت پایا ـ،، انھیں بھی خواھش ھوئی کہ میں غالب کا شاگرد بنوں اور انہوں نے ایک فارسی خط جس میں غالب سے استدعا کی گئی تھی کہ مجھے حلقہ تلامذہ میں داخل کیجئے ، کچھ فارسی اردو کلام کے ساتھ مارہرہ سے غالب کی خدمت میں بھیجا - خط مذکور کے کچھ عبارات یہ ھیں -

''درآب وگل ایں بیدل کہ نمک مذاق ریختہ اند—ازبدو شعور ہم بہ ارث آرائی وھم بہ ھنجار طبع آزمائی با غزل سرائی سرے دارد - اما ایں شاھدیست شوخ وشنگ کہ درکنار کساں بمشکل جاگرم میکند نہ کہ جون من ناکس ھوسش درسردارد - اینھم خوبی تقدیر اوست چہ کند - مجبور است کہ افسونے چند از کلام بزرگان خصوصاً غالب معجز بیان یاد دارم - بہ ھزار حیلہ تا لب آغوش بیان مے آرم - زیادہ ازیں عرصہ مجال تنگ و حوصلہ فراخ ھنوز در کنار گرفتن باقیست و حصول ایں مدعا دشوار تاکہ رشک نظیری و کلیم وغیرت صائب وسلیم ظھوری ھنجار نظامی کردار نجم‌الدولد دبیرالملک نواب اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ متخلص بہ غالب ... افسونے تازہ نہ برانگیزد و بہ رھنمائی این نابلد....نہ برخیزد.....بنا بر اظھار بے استطاعتی خود غزے چند فارسی و اردو مے رسد بامعان نظر دیدہ این انگارہ را از رنگ اصلاح

جلوہ تازہ دادہ شود و بعد ازین این گمنام درزمرہ مستفیدان نگاشتہ آید کہ سرافتخارم بر فلک ساید ۔،، جلوہ خضر صفحہ ۲۲۷ ۔ اس خط کے ساتھ صفیر کے نانا صاحب نے جو سفارشی نظم ونثر کہی تھیں درج ذیل ہے ۔

''صاحب عالم (۱) غفراللہ الا عظم سلام و دعا باآرزومندیہائے بے حد وانتہائے رساند وایں دوبیت حالیہ میخواند ۔

اے لعل ز اشعار تو شرمندہ گہر ہم
مشتاق تو ارباب دول اہل ہنر ہم
لخت جگرم راکہ صفیراست تخلص
خواہد زتو فیض سخن آں لخت جگر ہم،،

غالب نے اس کے جواب میں ایک خط لکھا اور اپنی مثنوی ابر گہر بار بھیجی ۔ خط جو بہ تاریخ دہم ذی الحجہ ۱۲۸۰ھ مارہرہ میں ورود ہوا تھا یہ ہے ۔

''مخدوم مکرم سید فرزند احمد صاحب کو سلام پہنچے ۔ مجھ کو حضرت برجیس فطرت جناب حضرت صاحب عالم سے نسبت اویسی ہے ۔ غائبان حاضر کی فہرست میں پہلے میرا نام مرقوم ہے ۔ آپ کی طرز نگارش نظماً اور نثراً درخشندگی جوہر طبع سے خبر دیتی ہے ۔ اگر آپ کی طرف سے استصلاح کا کلمہ درمیان نہ آتا تو میں فضولی نہ کرتا ۔ باوجود خواہش خدمت کیوں نہ بجالاؤں ؟ میں یہ چاہتا ہوں کہ میری معلومات آپ پر مجہول نہ رہیں ۔ مجموع ایک ورق میں کیوں کر گنجائش پائیں ۔ ناگریز جو اس نظم و نثر میں ہے اس کو عرض کرتا ہوں بسر درآوردن (۲) مخل

---

(۱) جلوہ ۲ صفحہ ۲۲۹

(۲) صفیر کے فارسی خط میں ہے ''مرابغرض پابوسی بزرگان بسر درآورد،، جلوہ ۳ صفحہ ۲۳۶

معنی، درآوردن کافی، شور در سر انگیختن(۳) ٹکسال باھر، از سر انگیختن مناسب، نہ برانگیزد و نہ برخیزد فارسی ھند، برنخیزد و نینگیزد فارسی عجم - بر لفظ زائد اور نون معنی نفی، لفظ زائد ماقبل کلمہ چاھئے - نالہ ھا کہ ازدل سربرزدہ اندیعنی چہ(۴) ؟ غیر ذوی الروح بلکہ غیر ذی العقول کی جمع کی خبر بصیغہ مفرد رسم ھے - پریستان (۵) اصل لغت مخف اس کا پرستان پری استھان توھم محض مگر یہ بھی یاد رھے کہ آدم الشعرا' رودگی (کذا) سے سے فخرالمتاخرین شیخ علی حزیں تک کس کے کلام میں پریستان یا پرستان دیکھا نہیں -

حضرت صاحب قبلہ کی جناب میں میرا سلام عرض کیجئے اور کہئے کہ آپ کا عطوفت نامہ اور ساتھ اس کے چودھری صاحب کا مودت نامہ پہنچا - دونوں نگارشیں جواب طلب نہ تھیں - کل میں نے ایک چھاپے کی کتاب کا پارسل جس کا عنوان سید فرزند احمد صاحب کے نام کا ھے ارسال کیا ھے - آپ بھی بہ نظر اصلاح مشاھدہ کیجئے گا - ھاں پیر و مرشد فارسی کے کلیات کو بھی کبھی آپ دیکھتے ھیں یا نہیں - بہ قول انشااللہ خاں "یہ میری عمر بھر کی پونجی ھے-"

جناب سید فرزند احمد صاحب سے التماس ھے کہ حضرت صاحب کو سلام و پیام پہنچا کر حضرت شاہ عالم صاحب کو اور ان کے اخوان کو اور حضرت مقبول عالم کو میرا سلام کہئے گا اور جناب چودھری

---

(۳) شور سودا از سر برانگیختہ جلوہ ۲ص ۲۲۷

(۴) نالہ ھائے چند کہ ازدل ضم پیوند سرزدہ اند "، جلوہ ۲ ص۲۲۷

(۵) یہ صفیر کے خط کا جواب ھے -

عبدالغفور صاحب کو سلام کہہ کر یہ فرمائیے گا
کہ وہ اپنے عم نام دار اور استاد عالی مقدار کو میرا
سلام کہیں - زحمت تبلیغ سلام و پیام تقدیم خدمت
اصلاح کا دست مزد ہے - و السلام نجات کا طالب
غالب - یوم الخمیس ذی الحجه و ۲۱ مئی سال حال ،،

صفیر نے اپنے خط کے ساتھ جو کلام اصلاح کے لئے بھیجا تھا اس
میں غالب نے حسب ذیل ترمیم کی تھی -

(۱) خیال روئے تو اے قبلہ نظر کردم
زدیدنت نظر خویش بہرہ ور کردم

(۲) بلند شد شب ھجراں چو شعلہ آھم
چراغ ماہ خمش گشتہ بود برکردم

شعر نمبر ۱ میں غالب نے ''روئے تو اے،، کی جگہ ''روئے
ترا،، بنا دیا تھا اور شعر نمبر ۲ کے مصرع ۲ کو اس طرح بدل دیا تھا ''چراغ
مہ بہ فلک مردہ بود برکردم،،

صفیر نے مثنوی ابر گہر بار کے شکریے میں ایک فارسی مثنوی
صبح امید غالب کو بھیجی غالب نے اسے اصلاح سے مزین کیا اور خط
ذیل صفیر کے نام لکھا :

مخدوم زادہ مرتضوی دودمان سعادت و اقبال تواماں مولوی سید
فرزند احمد صاحب کو فقیر غالب کی دعا پہنچے - میں نے استصلاح
اشعار میں امتثال امر کیا ہے تو اس واقعے کو یوں سمجھ
لیا کہ میں امیر المومنین کا بوڑھا غلام ھوں - امیر نے اپنی اولاد
میں سے ایک صاحبزادہ میرے سپرد کیا ہے (اور حکم دیا ہے)
کہ تو اس کے کلام کو دیکھ لیا کر ورنہ میں کہاں اور یہ ریاضت
کہاں - (اپنے نانا صاحب کی خدمت میں فقیر کی بندگی عرض
کیجئے گا - اگرچہ حضرت میرے ھم عمر ھیں مگر ان کے ابوآبا

کا غلام ہو کر سلام کیا لکھوں ۔ مجھ کو ارادت میں ان سے نسبت اویسی ہے اور محبت بھی بے تکلف ویسی ہے جیسی اس معنوی نسبت میں چاہئے) ۔ نجات کا طالب غالب (یوم الخمیس پنجم ذی الحجہ ۱۲۷۸ ہجری)(۱) ۔

اصلاحات اشعار مثنوی صبح امید

(۱) صباحے کہ مست وے اند اہل ہوش
بدنبال او خور صبوحی بدوش

(۲) چہ ابرے کہ ازوے شب زلف ماہ
زصبح بنا گوش شد پردہ خواہ

(۳) نویسد ہم او در ہمان مثنوی
بہ ہنجار جادو بیان قوی

شعر نمبر ۱ میں بدوش کی جگہ فروش، شعر نمبر ۲ میں کہ 'ماہ، کی جگہ کزد روز گیسو سیاہ اور پردہ خواہ کی جگہ باج خواہ اور شعر نمبر ۳ کا مصرع ۲ اس طرح '' زبانش پراز منطق پہلوی ،، ۔

غالب کا تیسرا خط :

نورچشم لخت جگر زبدۂ اولاد پیغمبر حضرت مولوی سید فرزند احمد (صاحب) زاد مجدہ اس درویش گوشہ نشین کی دعا قبول فرمائیں ۔ بوستان خیال کے ترجمے کا عزم اور دوجلدوں کا منطبع ہو جانا مبارک، حضرت یہ آپ کا احسان عظیم ہے مجھ پر

---

(۱) یہ سنہ صریحاً غلط ہے مراسلت کا آغاز ۱۲۸۰ ھ میں ہوا ہے ۔ اگر یہ خط ۱۲۸۰ ھ کا سمجھا جائے جو قرین قیاس ہے تو تاریخ صحیح نہیں ۔ اس لئے کہ پہلا خط ذی الحجہ کی دسویں کو مارہرہ پہنچا تھا ۔ یہ دوسرا ہے ۔

خصوصاً اور بالغ نظران هند پر عموماً جناب میرولایت علی (۱) صاحب سے بعد ارسال قیمت و محصول دو جلدیں مانگی هیں - خدا کرے وہ یہ پارسل پہلے بھیجیں اور یہ رقم تمہارے پاس بعد۔
غالب ذی‌قعدہ ۱۲۸۱ هجری

چوتھا خط :

به علاقه مهرو محبت نور چشم و سروردل و به رعایت سیادت مخدوم مطاع مولوی سید فرزند احمد طال بقاؤہ و زاد علاؤہ اس مصرع سے میرا مکنون ضمیر دریافت فرمائیں - بندہ شاہ شمایم و ثنا خوان شما (۲) ـــــ یا رب وہ کون بزرگ هیں که سودائی کو معمائی سمجھتے هیں ؟ اصل فطرت میں (۳) میرا ذهن تاریخ و معما کے ملائم و مناسب میں نهیں پڑا ھے۔ جوانی میں ازراہ شوخی طبع گنتی کے عامیانه معمے لکھے هیں - وہ مبادی کلیات فارسی میں موجود هیں - تاریخیں اگر هیں تو مادے اوروں کے هیں اور نظم فقیر کی ھے یہ کلام نه به طریق کسر نفسی ھے نه به سبیل اغراق، سچ کہتا هوں اور سچ لکھتا هوں - اس نامه مہر افزا کو دیکھ کر مبادی پرستان خیال کی عبارت

---

(۱) میر ولایت علی اس مطبع کے منتظم تھے جس میں بوستان خیال کاترجمه طبع هوا تھا ان کے نام کا ایک خط میں نے رشحات صفیر سے لے کرماثر غالب میں درج کیا ھے - اس کا لفافه اب تک کتب خانه مشرقیه ، پٹنه میں موجود ھے -

(۲) یہ مصرع حافظ کا ھے -

(۳) اس کے متعلق صفیر نے حاشیے میں لکھا ھے ''بندہ صفیر نے حضرت غالب کو لکھا تھا که پٹنه کے لوگ آپ کے معما اور چیستان کے مشتاق هیں که ان لوگوں نے آپ کو معمے میں کامل سنا ھے ،، - غالب کے معمے کلیات کے مطبوعه نسخوں میں نهیں لیکن قلمی نسخوں میں هیں جن سے تین معمے لے کر میں نے ماثر غالب میں درج کئے هیں -

یاد آئی ۔ افسوس ہے کہ اس ہیچ میرز کے اجزائے خطابی اس مسودے کی تسوید کے وقت تک آپ نے نہیں سنے تھے ورنہ اس کے کیا معنی کہ خط میں لکھے جائیں اور کتاب میں اندراج نہ پائیں ۔ محمد رضا برق کا خطاب معلوم تھا تو آپ نے لکھا ہے، حکایت ہے شکایت نہیں ——— پہلی جلد جس کا نام افق الخیال ہے اس کے دیکھنے کا بہت مشتاق ہوں ۔ جناب میر ولایت علی صاحب کو تاکید رہے کہ جب اس کا چھاپا تمام ہو بے طلب بھیج دیں اور معاً قیمت لکھ بھیجیں——اشعار گہر بار دیکھ کر دل بہت خوش ہوا ۔

سب اچھے ہیں مگر جو میرے دل میں اتر گئے ہیں وہ تم کو لکھتا ہوں ۔

هائے وہ لب ہلا کے رہ جانا
ابھی کچھ بات کر نہیں آتی

(کیوں حضرت ابھی کچھ کی تحتانی (۱) کا دبنا غیر فصیح نہیں ۔ کچھ ابھی بات کر نہیں آتی، کیا اس کا نعم البدل نہیں) ۔

ورق ہیں جوشش مضمون گریہ سے بادل
بہ سان ژالہ ہے ہرنقطہ کتاب میں آب

در قائل :

کبھی ہوں گرم کبھی سرد حسب موقع و وقت
صفیر آگ میں ہوں آگ اور آب میں آب

---

(۱)—'ی' کے دبنے کے متعلق شعرائے ایران و ہند کے مسلک کا حال راقم کے مضمون 'نکات سخن' سے معلوم ہوگا جو اردو ادب کے حسرت نمبر میں شائع ہوا ہے ۔ خود غالب کے اشعار فارسی و اردو میں 'ی' بکثرت دبتی ہے :

نیست در رہروی از سایہ و سر چشمہ گزیر
خامہ رہرو بود و سایہ وسرچشمہ دعاست
دل سے مٹنا تری انگشت حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

عارفانہ و موحدانہ مضمون اور بالغانہ الفاظ :

تم سلامت رہو قیامت تک
صحت و لطف طبع روز افزوں

نجات کا طالب غالب شنبہ ذی القعدہ ۱۲۸۱ ہجری،،

پانچواں خط :

''نورچشم و سرور دل فرزانہ مرتضوی گہر مولوی سید فرزند احمد صاحب زاد مجدہ، اس نسبت عام سے کہ ہم اور آپ مومن ہیں سلام ۔ اور اس نسبت خاص سے کہ آپ میرے دوست روحانی کے فرزند ہیں دعا اور اس نسبت اخص سے کہ آپ میرے خداوند کی اولاد میں سے ہیں بندگی ۔

میں قائل خدا و نبی و امام ہوں
بندہ خدا کا اور علی ، کا غلام ہوں

آپ کے دو خطوں کا جواب بہ سبیل ایجاز لکھا جاتا ہے ۔ دہائی خدا کی مجھے ولایت کی اپیل کی تاب نہیں ۔ نہ تم اپیلانٹ بنو نہ مجھے رسپانڈنٹ بناؤ ۔ لکھ بھیجو کہ صبح بہار کی عبارت فارسی ہے یا اردو ماکتب فیہہ اس کا کیا ہے۔ (نجات کا طالب) غالب چہار شنبہ ہفتم ذی الحجہ ۱۲۸۱ ہجری ۔

یہ پانچوں خط مرقع فیض (۱) اور جلوہ خضر جلد ۲ دونوں میں ہیں ۔

---

(۱)—مرقع فیض جس میں صفیر اور ان کے تلامذہ کے تراجم اور منتخب اشعار ہیں ۱۲۹۵ ھ میں طبع ہوا تھا اور اس کے سرورق پر نواب سید تجمل حسین خاں عرف سلطان مرزا المتخلص بہ سلطان شاگرد صفیر کا نام مصنف کی حیثیت سے درج تھا لیکن تنبیہ صفیر بلگرامی

وہ عبارات جو صرف مرقع میں ہیں قوسین کے اندر ہیں اور وہ جو صرف جلوہ میں ہیں قلابین کے اندر ہیں ۔ اس کے علاوہ اختلافات یہ ہیں : خط ۳ : مرقع ۔ نور نظر : جلوہ ۔ نور چشم ۔ خط ۵ : مرقع رسپاڈنٹ جلوہ ۔ رسپانڈنٹ : مرقع چہار شنبہ : جلوہ ۔ چہار شنبہ : جلوہ میں کہیں کہیں خط میں عبارات کے بعد نقطے بھی ہیں یہ بے کار ہیں یا ان سے مراد ہے کہ ان کی جگہ جو الفاظ تھے وہ کسی وجہ سے درج نہیں ہونے میں نہیں کہہ سکتا ۔ صفیر نے جلوہ ۱ صفحہ ۲۲۷ میں لکھا ہے کہ ''جب تک حضرت غالب کے ہوش و ہواس درست رہے خط و کتابت جاری رہی،، لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے صفیر کی زندگی میں ان پانچ خطوں کے علاوہ کوئی خط شائع نہیں ہوا ۔ ان کی وفات کے بہت بعد ان کے پوتے

میں جو مرقع کا رد ہے سلطان کا ایک خط شامل ہے جس کے مکتوب الیہ ان کے والد ہیں ۔ اس خط سے قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ کتاب سلطان نے نہیں لکھی ۔ ''میر صفیر صاحب بلا اطلاع غلام کہ ہرگز حاشافدوی ازاں مطلع نیستم از تصنیف خود یا دیگرے از شاگردان خود بنام غلام طبع نمود ۔ نزد غلام مع چند نسخہ مرقع فیض آمدہ گفتد کہ آنچہ نوشتہ ام آنرا قبول نمایند ۔ بندہ عرض کردم باعث بدنامی و توہین من خواہد شد چراکہ کلام دیگر منسوب بخود نمایم بے حیائیت ویک نسخہ ہم ازان باوجود اصرار شان ہرگز نزد خود نداشتم،، صفحہ ۱۲۷ تبنیہ صفیر بلگرامی ۔ ایک شخص سردار مرزا تخلص بہ آزاد کی طرف منسوب ہے جناب سید وصی احمد بلگرامی نے س ش ص میں لکھا ہے کہ ''جناب سخن نے —— لکھی اور ایک فرضی شخص سردار مرزا کے نام سے شائع کی ،، یہ بات قرین قیاس ہے کہ خود سخن اس کے مصنف ہیں ۔ لیکن سردار مرزا ایک فرضی شخص نہیں ۔ یہ سخن کے دوستوں میں تھے اور ان کا نام دیوان سخن میں آیا ہے ۔ جلوۂ خضر صفیر کی تصنیف ہے ۔ جلد نمبر ۱ ان کی زندگی میں شائع ہو گئی تھی ۔ جلد ۲ کا حصہ ۱ زیر طبع تھا کہ صفیر کا انتقال ہو گیا ۔ اس کا حصہ ۲ لکھا گیا تھا یا نہیں ۔ اس کی خبر نہیں ۔

جناب سید وصی احمد بلگرامی نے اپنے طویل مقالے س ش ص میں
جو 'ندیم، گیا کے بہار نمبر (بابت ۱۹۲۰ء) میں چھپا تھا دو خط درج
کئے جن میں سے ایک کی نسبت ان کا بیان ھے کہ صفیر نے غالب کو
لکھا تھا اور دوسرا ان کے دعوے کے مطابق غالب کی طرف سے اس
کا جواب ھے ۔ یہ دونوں خط ذیل میں درج کئے جاتے ھیں ۔

خط صفیر : (کذا) ملازمت کے وقت میں نے خواجہ
فخر الدین صاحب سخن جن کا دادیہال لکھنئو اور نانیہال دھلی
میں ھے اور غدر کے سال میں بہ عمر چاردہ یا پانزدہ سالگی
آرہ میں تشریف لائے اور جناب محمد ابراھیم صاحب خلف مرزا
محمد صدیق صاحب کی صاحبزادی سے منسوب ھوئے اور مجھ
سے تلمذ کیا اور قصہ مسمی بہ سروش سخن جس کو ان کی رائے
سے درست کرنے کا اتفاق ھوا ۔ سب حال آپ سے بیان کیا تھا
چونکہ اس قصے کو چھپنا چاھئے اور لکھنئو بھیجنا منظور نہیں
اس کے سوا حضور سے بڑھکر کون ھے ۔ اس لئے وہ قصہ بھیجتا
ھوں ۔ حضور اس کو میری تصنیف سمجھ کر بہ نظر تامل بنائیں
کہ بڑا مقابلہ (۱) ھے اور طبیعت ان کی اچھی ھے چنانچہ آج ھی
ایک غزل میرے پاس پٹنہ اصلاح کو آئی ھے اس کا ایک شعر
میرے دل میں کھب گیا وہ یہ ھے

سنبھالا ھوش تو مرنے لگے حسینوں پر
ھمیں تو موت(۲) ھی آئی شباب کے بدلے

نمبر—(۱) سروش سخن فسانہ عجائب کے جواب میں لکھا گیا
تھا اور اس میں سرور پر اعتراض کئے گئے تھے ۔

نمبر (۲)—سخن نے غالب کی زندگی ھی میں یہ دعوی کیا تھا
کہ غالب میرے نانا ھوتے ھیں اور میں ان کا شاگرد ھوں ۔ تنبیہ صفیر
بلگرامی میں ھے کہ سنبھالا الخ سخن نے دھلی ھی میں کہا تھا اور غالب
نے اسے سن کر انہیں گلے لگا لیا تھا اور آب دیدہ ھو کر کہا تھا میری

نواب غالب :

مولوی سید فرزند احمد ––(کذا) اس پیر هفتاد ساله کی دعا پہنچے - آج میں نے لیٹے لیٹے حساب کیا که یه ستروان برس مجھے جاتا ہے - ہائے

سنین عمر کے ستر ہوئے شمار برس
بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس

نامه محبت افزا کو دیکھکر آنکھوں میں نور دل میں سرور آیا اور قصه سروش سخن اس کے دوسرے دن پہنچا–(کذا) قصه دیکھا - آپ کے(۱) جوہر طبع کی لمعانی اور نیز فکر کی درخشانی بہت جگه پر پسند آئی - اگرچه وہ قصه تو بچوں کے سلانے کی کہانی ہے مگر محنت کی گئی ہے - ہاں اگر فسانه عجائب کا مقابله کیا ہے تو کیا لکھوں که کیا کہا ہے - ابھی دیکھتا ہوں آئینده اس کی کیفیت سے اطلاع دی جائے گی (کذا) جابجا لاچار لکھا ہے –(کذا) لا کا لگانا کاتب کی جہالت ہے–– (کذا) ہائے خدا کی مار کاتبان ناهنجار پر میرا دیوان اور پنچ آهنگ اور مہرنیم روز ستیاناس کر کے چھوڑ دیا––(کذا) لو بس اب میں نواب ضیاالدین خاں سے باتیں کر رہا ہوں تمہارے خط کے جواب نے اتنی دیر تک ان کو چپکا بٹھا رکھا اور وہ بھی تم کو سلام اشتیاق آمیز پہنچاتے ہیں ––(کذا) ،،

جان ایسا شعر نه کہا کرو ابھی تو تم نے ہوش بھی نہیں سنبھالا ، دنیا میں کیا دیکھا بھالا - دیکھو عارف ایسے ہی لخت جگر اگل کر دنیا سے ناشاد گیا - تم بھی زندگی سے بیزار ہو - الغرض نہایت خفا ہوئے اور تاکید کی که خبردار اب جو سنوں گا که ایسا شعر کہا تو سید تیری جان اور اپنے ایمان کی قسم صورت سے بیزار ہو جاؤں گا ص––: ۸

نمبر (۱)–اس سے یه ثابت کرنا مد نظر ہے که کتاب صفیر کی لکھی ہوئی ہے -

جناب سید وصی احمد لکھتے ہیں کہ حضرت غالب کے شعر کا جواب صفیر بلگرامی نے یہ بھیجا ۔

سنا صفیر یہ کہتے ہیں حضرت غالب
بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس
مگر یہ پہلے سے اعداد غین کی ہے دعا
خدا کرے مرا غالب جئے ہزار برس

میں نے نادر خطوط غالب کے تبصرے میں جو 'معاصر' پٹنہ میں شائع ہوا تھا موصوف سے دریافت کیا تھا کہ صفیر و غالب کے خط انہیں کہاں سے ملے لیکن انہوں نے اس کا کچھ جواب نہیں دیا ۔ یہ دونوں خط میری رائے میں جعلی ہیں اورجعل سازی کی غرض یہ ثابت کرنا ہے کہ سخن صفیر کے شاگرد تھے ۔ سخن کو اس سے انکار ہی نہیں ۔ وہ اس کے مدعی تھے کہ خود صفیر کو ان سے تلمذ ہے (تبنیہ صفیر بلگرامی ۸۸) اس موقع پر میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاھتا کہ صفیر و سخن میں سے کس کا دعوی صحیح ہے اورخطوط زیر بحث کو جعلی قرار دینے کی وجہ بیان کرنے پر قناعت کروں گا ۔ صفیر کے خط میں دھلی جانے اور وھاں غالب سے سخن کے متعلق گفتگو آنے کا ذکر ہے صفیر اوائل ۱۲۸۲ھ میں دھلی گئے ہیں (جلوہ‌صف—۱۲۲) اور وھاں دو ڈھائی مہینے ٹھہرے(جلوہ ۲ صف ۲۲۹) اس سے لازم آتا ہے کہ خط دھلی سے واپسی کے بعد کا ہو ۔ غالب کے خط میں جو ان کی عمر کا ذکر ہے اس سے اس کا زمانہ تحریر ۱۲۸۲ھ ثابت ہوتا ہے لیکن سروش سخن (قطعات تاریخ طبع اور تاریخ دتاسی جلد۲ ص—۱۷۱) ۱۲۸۱ھ میں لکھنو کے مطبع نول کشور نے چھاپ کر شائع کر دیا تھا ۔ اس لئے یہ ممکن نہیں کہ یہ خط اس کے بعد لکھے گئے ہیں ۔ جعل کسی ایسے شخص نے بنایا ہے جو سروش سخن طبع اول کے سال انطباع سے ناواقف ہے اور اس بنا پر میں

یہ سمجھتا ہوں کہ اس کے ذمہ دار صفیر نہیں ۔ یہ مستبعد ہے
کہ وہ اسے نہ جانتے ہوں ۔

غالب نے صفیر کے رسالہ تذکیر و تانیث کے لئے ایک دیباچہ لکھا جو عود ہندی اور اس رسالے کی اشاعت میں موجود ہے صفیر جلوہ ۱ صـــ ۲۲۴ میں اسے تقریظ کہتے ہیں اور اس کے متعلق تحریر کرتے ہیں کہ میرے دوران قیام دھلی میں غالب نے رسالہ دیکھا بہت تعریف کی اور تقریظ لکھکر دی ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریظ یا دیباچہ اوائل ۸۲ھ میں حوالہ قلم ہوا لیکن علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر میں غالب کا ایک خط جس کے مکتوب الیہ صاحب مارہروی ہیں شائع ہوا ہے اس میں مرقوم ہے کہ ''دیباچے کا عظیم آباد کو روانہ ہونا معلوم ہوا ۔ مگر یہ نہ معلوم ہوا کہ مولوی سید فرزند احمد کو وہ دیباچہ پسند آیا یا نہیں ،، صـــ ۹۷ ۔ یہ خط ۲۶ اگست ۱۸۶۶ء کا لکھا ہوا ہے جو ربیع الثانی ۱۲۸۳ ھ کے مطابق پڑتی ہے ۔

برجموهن دتاتریه کیفی

غالب اور اُردو خطوط نویسی

تحقیق کچھ عجیب چیز ھے ۔ وہ بت ساز بھی ھے اور بت شکن بھی ۔ دنیائے فکر و عمل میں کتنے سالمات تھے جو سالبات ھو کر رہ گئے ۔ اور اس طرح سالبات سے سالمات وجود پزیر ھوئے ۔ دنیا میں جتنی چیزیں اننت ھیں ان میں تحقیق بھی شامل ھے اگر کوئی انسان واقعی محقق ھے یعنی تعصب نفس سے مبرا ھے تو وہ تحقیق کے کسی نتیجے کو آخری لفظ ھرگز نہیں کہے گا ۔

تحقیق یا ریسرچ کے طریقوں کی پرواز انسانوں کی شخصی کیفیت نفسی سے رنگ تو لیتی ھے مگر ملکی اور کلچرل خصائص سے بہت کچھ متاثر ھوتی ھے ۔ ھمارے یہاں یعنی مشرقی ملکوں میں اخلاق عامہ کی تحلیل نفسی کی جائے تو ثابت ھوگا کہ قدامت پرستی کا عنصر ھماری رائے اور تحقیق پر بے حد حاوی اور عامل ھے ۔ کبھی اسے پاس وضع اور نباہ کا نام دیا جاتا ھے اور کبھی اعتقادی استقامت کا سہرا اس کے سر باندھا جاتا ھے ۔ اور جگہ یہ حالت نہیں ھے ۔ اور اسی لئے وہ نئی نئی حقیقتیں اور قوانین قدرت دریافت کرنے میں کامیاب ھوتے ھیں ۔

آج میں زیر زمین یا عالم بالا سے متعلق کوئی فلسفیانہ یا عملی مسئلہ پیش کرنے کو نہیں ھوں بلکہ اردو ادبیات کی ایک شق ''غالبیات،، سے متعلق صرف ایک امر کا ذکر کروں گا جو ادبی تحقیقات کے سلسلے میں میرے علم میں آیا ھے ۔

عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ھے کہ مرزا غالب خطوط کے نئے طرز تحریر کے موجد ھیں ۔ انھوں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ھے ۔ مرزا خود اس ایجاد کا دعوے کرتے ھیں اور اسی دعوے پر انتقادی

نظر ڈالنا مقصود ہے مرزا کا وہ خط جس میں یہ دعوے کیا گیا ہے ان کے خطوط کے تمام مجموعوں میں موجود ہے ۔ اس پر تاریخ تحریر درج نہیں ہے ۔ مگر خط کے مضمون سے یہ مشکل حل ہو جاتی ہے ۔ پہلے اس خط کی پوری نقل دی جاتی ہے ۔ جو مرزا حاتم علی مہر کے نام ہے ۔

نقل خط

''مرزا صاحب میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے ۔ ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو ۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو ۔ یہ تم نے مجھ سے بات کرنے کی قسم کھائی ہے ۔ اتنا تو کہو یہ کیا بات تمہارے من میں آئی ہے ۔ برسوں ہو گئے کہ تمہارا خط نہیں آیا نہ اپنی خیر و عافیت لکھی نہ کتابوں کا بیورا بھجوایا ۔ ہاں مرزا تفتہ نے ہاترس سے یہ خبر دی ہے کہ پانچ ورق پانچ کتابوں کے آغاز کے ان کو دے آیا ہوں ۔ اور انہوں نے سیاہ قلم کی لوحوں کی تیاری کی ہے ۔ یہ تو بہت دن ہوئے جو تم نے خبر دی ہے کہ دو کتابوں کی طلائی لوح مرتب ہو گئی ہے ۔ پھر اب ان دو کتابوں کی جلد بن جانے کی کیا خبر ہے ۔ اور ان پانچ کتابوں کے تیار ہونے میں درنگ کس قدر ہے ۔ مہتمم مطبع کا خط پرسوں آیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ تمہاری چالیس کتابیں بعد منہائی لینے سات جلدوں کے اس ہفتہ میں تمہارے پاس پہونچ جائیں گی ۔ اب حضرت ارشاد کریں کہ یہ سات جلدیں کب آئیں گی ۔ ہر چند کاریگروں کے دیر لگانے سے تم بھی مجبور ہو مگر ایسا کچھ لکھو کہ آنکھوں کی نگرانی اور دل کی پریشانی دور ہو ۔ خدا کرے ان پینتیس جلدوں کے ساتھ یا دو تین روز آگے پیچھے یہ سات جلدیں آپ کی عنایتی بھی آئیں تا خاص و عام جابجا بھیجی جائیں میرا کلام میرے پاس کبھی کچھ نہیں رہا ۔ ضیاء الدین خاں اور حسین مرزا جمع کر لیا کرتے

تھے جو میں نے کہا انہوں نے لکھ لیا ان دونوں کے گھر لٹ گئے - ہزاروں روپے کے کتب خانے برباد ہوئے - اب میں اپنے کلام کو دیکھنے کو ترستا ہوں - کئی دن ہوئے کہ ایک فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرواز بھی ہے ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا - اس نے وہ کاغذ جو مجھ کو دکھایا یقین سمجھنا کہ مجھ کو رونا آیا غزل تم کو بھیجتا ہوں -

"درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا"

غزل کے مقطع کے ساتھ یہ خط ختم ہوتا ہے - تاریخ تحریر درج نہیں - مگر اس کا تعیئن بالجملہ بہت آسان ہے - غدر ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ختم ہو چکا ہے مرزا غالب دستنبو لکھ چکے ہیں اور آگرے میں چھپوانے کے لئے منشی شونرائن کے پاس بھیج چکے ہیں - کتاب یا کتابوں سے مراد دستنبو ہی ہے جس کی لوح وغیرہ سے متعلق مرزا کے متعدد خط منشی نبی بخش حقیر وغیرہ کے نام ہیں - ان دنوں مرزا کے یہ چاروں دوست اور شاگرد آگرے میں تھے منشی شو نرائن تو وہاں کے رئیس ہی تھے - مرزا حاتم علی مہر وہاں وکالت کرتے تھے - منشی نبی بخش کسی عدالت میں سررشتہ پر مامور تھے - مرزا تفتہ بھی ان دنوں آگرے گئے ہوئے تھے - مرزا غالب نے دستنبو کی تیاری کے سلسلے میں ان چاروں کو فرداً فرداً اور مشترکہ طور پر کئی خط لکھے ہیں - حاصل کلام یہ کہ وہ خط جس کی نقل اوپر کی گئی ۱۸۵۸ء کا لکھا ہوا ہے -

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خطوط نویسی میں مرزا کی تاریخ اس خط کی تحریر سے قائم کی جائے یا اسے کچھ پہلے کے زمانے سے وابستہ کیا جائے- اس کے لئے مرزا کے اردو خط کا توقیاتی جائزہ ضروری ہے اس بارے میں راقم نے اپنے دوستوں میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور مسٹر مالک رام سے مشورہ کیا مگر کچھ حاصل نہ ہوا - یہ امر

کہ مرزا نے پہلا اُردو خط کس تاریخ کو لکھا یا یوں کہئے کہ مستقل طور پر اردو میں خط لکھنا کب شروع کیا ایک مسئلہ ہے جو کافی طور پر حل نہ ہو سکا - حالی لکھتے ہیں کہ "جب مرزا مہر نیم روز لکھنے میں مصروف ہوئے تو انہوں نے اردو میں خط لکھنے شروع کئے"، اور مہر نیم روز کی تصنیف ۱۸۵۷ء میں شروع ہوئی - غالب خود ایک خط میں لکھتے ہیں کہ اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں، زیادہ محنت نہیں ہو سکتی - اس لئے اردو میں خط لکھنے لگا ہوں - خطوط کے مجموعوں کے جائزے سے جہاں تک پتہ چلا، یہ معلوم ہوا کہ غالب کے اردو خطوط مسلسل طور پر ۱۸۵۲ء تک پہنچتے ہیں - اس سے آگے منظر تاریک ہے - ممکن ہے مزید تحقیق اس پر اور روشنی ڈال سکے -

مرزا کی فہم وذکا، ذہانت اور فطانت بے شک تعریف کے قابل ہے - اکثر انسانوں کے ذہن ان اوصاف سے مزین نہیں ہوا کرتے - ماننا پڑے گا کہ مرزا کا ادبی شعور ایک خاص قسم کا تھا - خود نظری یا خود اصلاحی کا جوہر ان میں موجود تھا - اردو شاعری انہوں نے مرزا بیدل کو سامنے رکھکر شروع کی - مگر ان کے آخری زمانے کا کلام اس سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا - اس طرح فارسی شاعری ایرانی استادوں کے کٹکھنوں سے شروع ہوتی ہے مختصر یہ ہے کہ کسب، اخذ اور ترقی کی غیر معمولی استعداد غالب کی طبیعت میں موجود تھی - مگر ایجاد کوئی اور چیز ہے کامیاب تقلید یا ترقی کو ایجاد نہیں کہہ سکتے -

ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۸۳۶ء سے دھلی میں اردو کا لتھو پریس قائم ہو گیا ہے - صرف دھلی سے کم سے کم دو اخبار نکلنے شروع ہو گئے ہیں - کتابیں چھپتی ہیں رسالے شائع ہوتے ہیں - ادھر دوسری طرف مغربی ادب اور علوم کی تعلیم نئی روشنی ملک میں پھیلا رہی ہے لوگوں کی رغبت نئی باتوں اور نئے نظریوں کی طرف ہوتی جاتی ہے اور پرانی روایات نئی کسوٹی پر کسی جانے لگی ہیں - اس ماحول کو ادبی پہلو تک محدود رکھنا مقصود ہے - لوگ جو مغربی تعلیم

سے حاصل کرتے تھے اس کو تبرک سمجھ کر اپنائے وطن تک پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔

مرحوم دھلی کالج کے متعلم اور معلم ماسٹر رام چندر ان لوگوں میں سے ھیں جنھوں نے اس قدیم زمانے میں اردو کے تمول کی ترقی میں اور لوگوں کو اصلاح و ترمیم کی طرف توجہ دلانے میں نمایاں کام کیا ھے۔ ماسٹر رامچندر انگریزی کے ماھر اور ریاضیات کے جید عالم ھوتے ھوئے اردو کی خدمت کا پرجوش جذبہ اپنے دل میں رکھتے تھے۔ وہ برسوں تک کئی رسالے اردو میں نکالتے رھے یہاں صرف ان کے ایک رسالے ''محب ہند،، سے استفادہ کیا جائے گا۔ اس رسالے کی جلد نمبر ۲۹ بابت دسمبر ۱۸۴۹ء و جنوری ۱۸۵۰ء اس وقت میرے سامنے ھے۔ اس نمبر کے صفحہ ۴۶ سے جو عبارت نیچے نقل کی جاتی ھے۔ ھر مفکر اور بے تعصب ادیب کے غور و فکر کی مستحق ھے۔

''تتمہ علوم در باب توھمات و رسوم
طریقہ خط و کتابت،،

''یہ ظاھر ھے کہ جب دو آدمی آپس میں باتیں کرتے ھیں اور اپنا مطلب ایک دوسرے سے بیان کرتے ھیں اس میں سوا مطلب کی باتوں کے اور کچھ نہیں ھوتا۔ چنانچہ کسی کو یہ کہتے نہیں دیکھا کہ......

''بعد گذارش تسلیمات فراواں و کورنشات بے پایاں واستحصال ملازمت کثیرالمباھجت و ملاقات مسرت سماعت فلاں کتاب مجھکو عنایت کرو،، ۔ بلکہ وقت خطاب کے نفس مطلب پر اکتفا کرتے ھیں۔ چونکہ دو شخص کہ تعارف رکھتے ھیں ھمیشہ ایک جا نہیں رھتے۔ اسی واسطے ضرور پڑا کہ کوئی طریقہ مخاطبت اظہار مافی الضمیر کا جاری کیا چاھئے۔ لکھنے سے بہتر کوئی طریقہ نہ تھا اس لئے تحریر قائم مقام تقریر ھے۔ صرف مضمون جو وقت مخاطب کے کہا جاتا ھے اس کو لکھنا بھی چاھئے۔ چنانچہ دستور اھل عرب کا یہی ھے کہ کاغذ پر صرف سلام و مطلب لکھ دیتے ھیں۔ من فلاں اے فلاں و کذا و کذا والسلام۔ ناگری میں

بھی اہل ہند صرف مطلب سیدھی سیدھی طرح صاف صاف لکھ دیتے ہیں
معہ سمبت و تاریخ ۔ انگریزی میں بھی یہی دستور ہے کہ ضرورت
سے زیادہ خط میں اور واہیات و منشات داخل نہیں کرتے ۔ سوائے حضرات
فارسی بازوں کے جنہوں نے موافق اپنی عادت کے سب چیزوں
کو بگاڑا تھا خط کو خراب کیا ۔ اول میں خط کے لمبے چوڑے القاب
بعد اس کے آداب تسلیمات و شرح اشتیاق پانچ چار دس بیس سطروں
میں، بعد اس کے حال خیریت و عافیت چار سطروں میں، پھر شکایت
نہ پہنچنے خط کی طرح طرح سے اور بیقرار و مضطر ہونا جس کا بالکل اثر
نہیں ہوتا یا حال پہنچنے خط کا اور سرفراز و ممتاز ہونا پھر کچھ
تھوڑا مطلب بڑی عبارت میں یا بعضے خطوط میں سوائے امور مذکورہ اور
کچھ بیان نہیں ہوتا ۔ بعد اس کے سب آشنایوں کو اسامی وار سلام کہتے
ہیں ۔ اکثر امرا بلکہ عوام میں دستور ہے کہ مبادا دوسرا آدمی شکایت
کرے کچھ نہ کچھ لکھ کر جس میں مطلب کی ایک بات نہیں ہوتی ،
البتہ انشا پردازی اور عبارت آرائی میں حتےالوسع دریغ نہیں ہوتا،
بھیج دیتے ہیں ۔ خطوط تہنیت و تعزیت کے دفتر کے دفتر ہوتے ہیں ۔
بعضے خطوں میں دیکھا کہ مضمون نہایت عتاب کا ہے لیکن القاب و
آداب سے شرف و عظمت و اخلاق و محبت ٹپکتا ہے ۔ عبارت مضمون
یہ ہے کہ آن صادق الوداد فلاں امر نہایت قبیح کردند آیندہ چناں
نکنند ۔ و از صدور چنیں امر معلوم شد کہ آن مہربان را باماعداوتے نامہ
است ۔ لیکن القاب میں مشفق مہربان کرم فرمائے مخلصان ۔ مخلص اخلاص
پرستاں وغیرہ اور آداب میں بعد تمنائے حصول مواصلت کہ حدے و
پایانے ندارد و اظہار لوازم تسلیم و عبودیت وغیرہ مندرج ہے ۔ علاوہ یہ
کہ عربی و ناگری و انگریزی میں ہر ایک چیز کا جو نام ہے وہ خط میں
لکھا جاتا ہے۔ بخلاف فارسی کہ اس میں خط کو عنایت نامہ و چنیں و
چناں صدہا طرح کے نام و عبارات صرف خط کے واسطے لکھے جاتے ہیں ۔
——— ایک جا تین خط سات روز کے عرصے میں آئے ۔ تینوں میں دو دو
چار چار سطریں خیروعافیت کی مندرج تھیں ۔ بار بار خیریت کے لکھنے
کی کیا حاجت ہے ——— خط کو نائب و خلیفہ تقریر کا اختیار کیا

تھا - نہ دفتر واسطے انشا پردازی و اخلاق عبارات و صناعات و استعارات کے جس کا فارسی والوں کو نہایت مرتبے میں خبط ہو گیا ہے - نفس انشاء میں کچھ برائی نہیں بلکہ ایک فن شریف ہےلیکن اپنے مقام مناسب میں کہ ہر جگہ - تقریر و تحریر و سلام و کلام میں دس سطریں لکھنی جس میں نفس مطلب ایک سطر میں ہو تضیع اوقات ہے - ایک خط ۲۳ سطر کا میں نے دیکھا جس میں مضمون صرف اتنا تھا کہ قریب چار ساعت نواختہ بر غریب خانہ تشریف آرند ہر چہ کہ اس مضمون کو بھی بڑی دھوم دھام سے لکھا تھا -،،

اس امر میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ یہ رسالہ یعنی ''محب ہند،، قلعہ میں ضرور جاتا ہوگا - کیونکہ اس کے قریباً ہر نمبر میں بادشاہ ظفر کی دو تین تازہ غزلیں چھپا کرتی تھیں - چنانچہ اس اشاعت میں جس میں سے خطوط نویسی کے متعلق مضمون ابھی نقل کیا گیا ہے بادشاہ کی دو غزلیں عین مضمون مزکورہ کے بعد درج ہیں - عنوان ہے ''غزلیات شاہ جمجاہ دھلی ،، ظاہر ہے کہ قلعے سے تعلق رکھنے والے اس رسالے اور ان غزلوں کو ضرور پڑھا کرتے تھے - ظن غالب یہ ہے کہ ماسٹر رامچندر کا یہ مضمون مرزا غالب کی نظر سے ضرور گزرا ہوگا - اور ان کی طبع وقاد نے اس سے ضرور اثر لیا ہوگا -

اب رہی یہ بات کہ ۱۸۵۸ء میں وہ خطوط نویسی میں اپنے موجد ہونے کا دعوی کرتے ہیں جیسا کہ انہوں نے مرزا مہر کے خط میں لکھا - اس کو محض ان کی انانیت اور خود بینی کہنا چاہئے - مرزا غالب ابن الوقت تھے - جب جیسا موقعہ دیکھا ویسی بات کہہ دی - سہرے کے وقت میدان صاف دیکھا تو بے تامل پکار اٹھے

هم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دےکوئی بہتر سہرا -

کیا دنیا اندھی تھی - سب نے جانا کہ یہ استاد ذوق کو چیلنج ہے - غالب و ذوق دونوں کے سہروں کا موازنہ حالی نے 'یادگار غالب، میں صحیح ناقدانہ طور پر کیا ہے - مرزا کا معذرت کا قطعہ جو

اس قضیئے کے سلسلے میں ہے سب کے سامنے ہے - بھئی اگر شاعری ذریعہ عزت نہیں ہے تو اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے - اور اپنے آباؑ کے صد سالہ پیشے کو کیوں نہیں اختیار کر لیتے - اردو میں بات بنتی نہ دیکھی تو فارسی سے پناہ کے طالب ہوئے اور فرمایا کہ

فارسی بیں تابہ بینی نقش ھائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعہٴ اردو کے بے رنگ من است

دوسرے موقعہ پر عارف کے لئے لکھتے ہیں :

آن پسندیدہ محوے عارف نام
کہ رحش شمع دودمان من است
جائے دارد کہ خویش را نازم
کہ فلانی ز پیروان من است
جاودان باش اے کہ درگیتی
سخنت عمر جاوداں من است
اے کہ میراث خوار من باشی
اندر اردو کہ آں زباں من است

اس موقعہ پر مرزا اپنی اردو کو میراث کے طور پر عارف کو دے رہے کہ پیاروں کو اچھی اور پیاری چیزیں ھی دی جاتی ھیں بے رنگ و بے مزہ چیزیں نہیں دی جاتیں -

اردو دیوان میں ایک جگہ فرمایا ہے

غالب اپنا بھی عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

مگر منشی نبی بخش حقیر کو ۱۸۵۲ء میں خط میں ایک اردو غزل بھیجتے ھیں اور انہیں میر صاحب موصوف کی بابت لکھتے ھیں

"بھائی خدا کے واسطے غزل کی داد دینا - اگر ریختہ یہ ہے تو میرو مرزا کیا کہتے تھے - اگر وہ ریختہ تھا تو پھر یہ کیا ہے -"

میرے خیال میں جس طرح مرزا غالب نے اپنی شاعری کی بابت دعوے کئے ھیں اسی طرح خطوط نویسی کے متعلق سمجھنا چاہئے -

تنویر احمد علوی

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ اور خطوطِ غالب

غالب کی زندگی ، سر تا سر ایک ڈرامائی ٹریجڈی ، کا سب سے زیادہ الم انگیز حصہ حیات غالب کا وہ باب ہے جو ۱۸۵۷ء کے ھنگامے سے متعلق ہے ۔

غالب آگرہ میں پیدا ہوئے تھے ۔ مگر ان کی عمر کا زیادہ حصہ دھلی میں گزرا ۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ ڈراما مرحوم دھلی کی دم توڑتی ہوئی تہذیب کے اسٹیج پر اور لال قلعے کی مٹتی ہوئی عظمت کے سائے میں کھیلا گیا۔ غالب جب اکبر آباد (آگرہ) چھوڑ کر شاہ جہان آباد (دھلی) آئے تو اس گل کدہ دیرینہ میں خزاں آ چکی تھی ۔ اکبر شاہ ثانی لال قلعہ میں تخت نشین تھے مگر دور اکبری کا جاہ و جلال اور آل بابر کی عظمت اور سطوت گزرے ہوئے وقت کی کہانی تھی ۔ تاہم مغل عہد کے اس دور آخر میں دھلی کے اندر علما و فضلا، شعرا اور ادبا کا ایک ایسا مجمع اکٹھا ہو گیا تھا جسے دیکھ کر دربار اکبری کے نورتنوں اور عہد شاہ جہاں کے جواھر پاروں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی ۔ آگرے کو چھوڑ کر غالب کا ھمیشہ کے لئے دھلی میں سکونت اختیار کرلینا سسرال کی رنگ رلیوں ھی کی وجہ سے نہیں بلکہ ان مغتنم انسانوں کے درمیان رھنے اور ان کی صحبت سے لطف اٹھانے کے لئے بھی تھا جن کی سوسائٹی کو یقیناً غالب ایسے قدرشناس و نکتہ سنج انسان کی طبیعت نے نعمت غیر مترقبہ سمجھا ہوگا مگر اس نعمت غیر مترقبہ سے قطع نظر شادی کے بعد کے کچھ ابتدائی ایام کو چھوڑ کر دھلی کی زندگی میں غالب کو کبھی دلی سکون اور اطمینان نصیب نہیں ہوا ۔ وہ رئیس زادے تھے اور دلی کے رئیس زادوں میں رہ کر اپنی زندگی کو اپنی خاندانی عزت و وقار کے شایاں شان گزارنا چاھتے تھے ۔ مگر

آمدنی کفایت نہ کرتی تھی اور اس کے نتیجے میں وہ ھمیشہ مقروض رہتے تھے - علاوہ ازیں ان کا بہت سا وقت اور روپیہ اپنی خاندانی پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں دوڑ دھوپ، بلاد شرقیہ کے سفر میں ضائع ہو گیا اور جس میں انجام کار انہیں بری طرح ناکامی ھوئی - اس طرف سے مایوس ھو کر انھوں نے دوسرے راستے اختیار کئے - روسائے عہد اور سلاطینؔ وقت کے لئے قصیدے اور تہنیت نامے لکھے اور اپنے آپ کو دامن دولت اور درباروں سے وابستہ کر لینے کی سعی کی- دھلی دربار سے بھی اپنے تعلقات کو بڑھایا - لال قلعہ اس وقت کی ادبی انجمن تھی اور غالب بھی کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی حیلے سے وھاں ضرور جاتے رھے ھونگے - مگر قلعہ سے ان کا باقاعدہ اور مستقل تعلق اس وقت ھوا جب کہ بہادر شاہ ظفر کی جانب سے انہیں خطاب دیا گیا اور پچاس روپیہ ماھوار تنخواہ کے عوض فارسی زبان میں خاندان تیموری کی تاریخ لکھنے کی خدمت ان کے سپرد ھوئی-ذوق کے انتقال کے بعد بہادر شاہ ان کے شاگرد بھی ھو گئے - اگرچہ اس وقت بادشاہ کی مالی حالت بہت سقیم تھی تاھم جس حد تک بھی ممکن تھا وہ ان کی عزت فرمائی اور قدر افزائی کرتے رہتے تھے-مگر غالب نے ھمیشہ اسے اپنے فن اور اپنی حثیت سے کم تر سمجھا اور زمانہ کے شاکی رھے - ویسے بھی وہ قلعہ کے مستقبل کی طرف سے مایوس تھے - چنانچہ اپنے خط میں لکھتے ھیں - ”کبھی اس محفل میں جاتا ھوں اور کبھی نہیں جاتا اور یہ صحبت خود چند روزہ ھے اسے دوام کہاں، کیا معلوم ھے اب کے نہ ھو اور اب کے ھو تو آیندہ نہ ھو ،، بھر حال جلد ھی وہ وقت بھی آ گیا اور انقلاب کے ایک ھی جھونکے نے ۱۸۵۷ء کے ھنگامے کی صورت میں بزم تیموری کی اس آخری شمع کو بھی گل کر دیا -

داغ فراق صحبت شب کی جلی ھوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ھے

اور اس قیامت کے اندھیرے میں وقت کے بے رحم ھاتھوں نے ھمیشہ کے لئے اس بساط کو ھی الٹ دیا جو اپنی تمام بے رونقی اور بے رنگی کے باوجود غالب کے لئے دامان باغباں و کف گل فروش سے کم نہ تھی -

لال قلعہ کی بزم کا درہم برہم ہونا غالب کے لئے غیر متوقع نہ سہی تب بھی غدر ان کے لئے کوئی معمولی سیاسی انقلاب نہیں تھا بلکہ اس ماحول کی سر تا سر تباھی اور ان تہذیبی قدروں کی مکمل بربادی تھی جو غالب کو اپنی زندگی سے زیادہ عزیز تھیں -

غالب کی زندگی اگرچہ اس طوفان مرگ مفاجات سے بچ گئی مگر گھر کا وہ تمام اثاثہ و اسباب لٹ گیا (جو اس وقت اِن کے پاس نہیں تھا) اور اس کے ساتھ آیندہ کی امیدیں بھی منقطع ہو گئیں - اس ھنگامے کے دوران میں دلی صرف چند مہینے باغی سپاھیوں کے ھاتھوں میں رھی اس کے بعد اس پر دوبارہ انگریزی فوجوں کا قبضہ ھو گیا - تمام شہر ایک کیمپ اور چھاونی بن گیا - قدم قدم پر پہرے بیٹھ گئے - جگہ جگہ پھانسیاں گڑ گئیں - اور اس کے ساتھ نادر شاھی قتل عام اور لوٹ مار کی خونی تاریخ دھرائی گئی - غالب اس وقت جس مکان میں رہ رھے تھے وہ چونکہ خاندان شریفی کے مکانات سے متصل تھا اس لئے اس کی حفاظت مہاراجہ پٹیالہ کے سپاھیوں نے کی - غالب نے اس کا ذکر اپنے ایک خط میں اس طرح کیا ھے :

''مہاراجہ نے صاحبان عالیشان سے وعدہ لیا تھا کہ بروقت غارت دھلی یہ لوگ بچے رھیں - چنانچہ بعد فتح کے مہاراجہ کے یہاں آ کر بیٹھ گئے اور یہ کوچہ محفوظ رھا ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں مبالغہ نہ جاننا امیر غریب سب نکل گئے اور جو رہ گئے تھے نکالے گئے جاگیر دار و پنشن دار، اھل حرفہ کوئی بھی نہیں بچا مفصل حالات لکھتے ھوئے ڈرتا ھوں ملازمان قلعہ پر شدت ھے - اور باز پرس و گیرودار میں مبتلا ھیں -''

غالب خود بھی قلعہ کے ملازم تھے مگر نئے نہیں پرانے - گذشتہ دس سال سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے کی خدمت پر مامور تھے اور اس دور پر آشوب میں اگرچہ انھوں نے بر بنائے مصلحت کسی مجلس میں حصہ نہیں لیا تھا تاھم اشعار کی خدمت برابر بجالاتے رھے اور اس ھنگامے کے بعد اپنی بےگناھی پر نظر رکھتے ھوئے شہر سے نکل

نہیں گئے ۔ چنانچہ اپنے اس خط میں آگے چل کر انہوں نے ان حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے ۔: ''میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات نہیں پائی گئی لہذا طلبی نہیں ہوئی ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں میری کیا حقیقت تھی غرض کہ اپنے گھر میں بیٹھا ہوں دروازہ سے باہر نہیں نکل سکتا ۔،،

پہلی جنگ آزادی کے اس طوفان کے فوراً بعد غالب کی نظر اپنے اور انگریزی سرکار کے تعلق پر سب سے پہلے اس لئے پڑی کہ وقت بڑا نازک تھا، گناہگاروں کے ساتھ بے گناہ اور مجرموں کے ساتھ معصوم بھی سزا پا رہے تھے ۔ جرنیلی بندوبست تھا غالب اس ہنگامے سے تو بچ گئے تھے مگر خطرے سے باہر نہ تھے اور پھر اسباب معیشت کے لئے اب سوائے انگریزی سرکار کی پینشن کے کوئی دوسرا سہارا کہیں نظر تک نہ آتا تھا ایک دوسرے خط میں اس متوقع خطرے کی طرف اشارہ موجود ہے :

''روپوش ہوں حکام جانتے ہیں کہ کہاں ہے مگر نہ بازپرس و گیرودار میں آیا نہ میں نے اپنی طرف سے قصد ملاقات کیا با ایں ہمہ ایمن بھی نہیں ہوں،، یہ چند سطریں بھی اس سلسلے کی دوسری کڑیاں ہیں ۔

''یہ جو خانہ کوچی اور گریزپائی اور بے اطمینانی کا گمان آپ کو مجھ پر ہے ۔ اور اس کا رنج ہے یہ کسی نے خلاف واقعہ آپ سے کہا ہے میں مع زن فرزند ہر وقت اس شہر میں قلزم خون کا شناور رہا ہوں نہ دروازے سے باہر قدم رکھا نہ پکڑا گیا نہ نکالا گیا نہ قید ہوا نہ مارا گیا ۔،،

یہ سب کچھ تھا مگر غالب کا اپنی بے گناہی پر یقین غلط اور آیندہ کے اندیشے بالکل صحیح تھے حکام کی خاموشی بے معنی نہ تھی ۔ غالب کے لئے یہ ایک راز تھا جس کو جاننے کے لئے وہ بے چین تھے اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کا یہ ذہنی خلفشار اور مالی دشواریاں بڑھتی جا رہی تھیں ۔

مرزا تفتہ کو لکھتے ھیں ––'' نہ جزا نہ سزا نہ نفرین نہ آفرین نہ عدل نہ ظلم نہ لطف نہ قہر،، انہیں کو ایک دوسرے خط میں لکھا گیا ھے - ''بوڑھا ناتوان مفلس قرضدار کانوں کا بہرہ قسمت کا بے بہرہ زیست سے بے زار مرگ کا امیدوار ،، آخر حکام کی اس آزردگی غیر سبب کا سبب بھی معلوم ھو گیا اور پتہ چلا کہ انگریزی حکام غالب کو بے قصور بے خطا نہیں سمجھتے بلکہ باغیوں کا دوست اور ھم نوا گردانتے ھیں - اور اپنے خیال کے سبب اور ثبوت کے طور پر ان سکوں کو پیش کرتے ھیں جو بہادر شاہ کے لئے کہے گئے تھے - مگر وہ غالب کے نہیں ذوق کے کہے ھوئے تھے - اور ھنگامہ دارو گیر کے زمانہ سے بہت پہلے بادشاہ کی اصل تخت نشینی کے وقت پیش کئے گئے تھے- غالب نے اس واقعہ کو اس کو طرح بیان کیا ھے- ''سکہ کا وار تو مجھ پر ایسا چلا جیسے کوئی چھرا یا گراب کس کو کہوں کس سے گواہ لاؤں یہ دونوں سکے ایک وقت میں کہے گئے ھیں یعنی جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے تو ذوق نے یہ سکے کہہ کر گزرانے- بادشاہ نے پسند کئے اور مولوی محمد باقر نے جو ذوق کے معتقدین میں تھے دلی اردو اخبار میں دونوں سکے چھاپے - اب یہ دونوں سکے سرکار کے نزدیک میرے کہے ھوئے اور گزارے ھوئے ثابت ھوئے ھیں - میں نے ھر چند قلمرو ھند میں دھلی اردو اخبار کا یہ پرچہ ڈھونڈا لیکن ھاتھ نہ آیا یہ دھبہ مجھ پر رھا پینشن بھی گئی اور وہ ریاست کا نام و نشان خلعت و دربار بھی مٹا،، غالب کے لئے خاندانی عزت اور ذاتی ملازمت کا یہ نقصان ناقابل برداشت بن گیا وہ اسے اپنے کیرکٹر پر ایک زبردست دھبہ سمجھتے ھیں اس کا حال و ملال خود ان کی اپنی زبان سے سنئیے––''سرکار انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا - رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا اور پورا خلعت جیفہ سر پیچ مالائے مروارید معہ تین رقوم جواھر کے پاتا تھا اب بدنام ھو گیا ھوں اور ایک بہت بڑا دھبہ لگ گیا ھے -،،

دراصل مرزا کے لئے یہ خاندانی اعزاز ھی کا سوال نہیں معیشت کے اسباب کا بھی سوال تھا ––''وہ عزت و ربط و ضبط جو ھم رئیس زادوں کا

تھا وہ اب کہاں، روٹی کا ٹکڑا ہی مل جئے تو غنیمت ہے۔،، یہ وقت غالب کے لئے سخت مصیبت کا وقت تھا زمانہ ان سے برسر امتحان تھا نہ کوئی امید بر آتی تھی نہ کوئی صورت نظر آتی تھی پھر بھی وہ حکام تک رسائی حاصل کرنے اور اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے برابر ھاتھ پیر مارتے رہے۔ دوسروں سے سفارشیں کرائیں خود قصیدے لکھ لکھ کر بھیجے۔ زمانہ داروگیر اور کچھ بعد کے حالات سے متعلق اپنی ایک نثری تصنیف دستنبوکی طباعت کے وقت چند خاص نسخے تیار کرائے اور ان کی طلائی الواح مرتب کراکے حکام انگریزی کو بطور تحفہ بھیجیں خود خدام و دربار میں حاضریاں دیں مگر کہیں پرسش نہ ھوئی۔ افسران نے ملنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ جب تم غدر کے دوران میں باغیوں کی خوشامد کیا کرتے تھے تو پھر اب ہم سے کیوں ملنا چاھتے ھو، یہ جوابات اس شخص کو سننے پڑے اور اپنی خود داری کی یہ توھین اس انسان نے برداشت کی جو بندگی میں بھی اپنے آپ کو اتنا آزاد اور خود بین رکھنا چاھتا تھا کہ اگر در کعبہ بھی خود اس کی پزیرائی کے لئے وانہ ھو تو وہ الٹا پھر آئے۔ آخر حکام کی اس بیزاری ، تلخ گفتاری اور اپنی اس ناکامی و نامرادی سے غالب کی طبیعت جھک ھو گئی اور وہ جھنجلا اٹھے –،، میں نے سکہ نہیں کہا اور اگر کہا تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا یہ گناہ نہیں اگر گناہ بھی ھے تو ایسا سنگین گناہ نہیں کہ ملکہ معظمہ کا اشتہار بھی اسے نہ مٹا سکے۔،،

،،سبحان اللہ گولہ انداز کا گولہ بارود بنانا، توپیں لگانا اور بینک گھر اور فیکٹریاں لوٹنا تو معاف ھو جائے شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ھوں۔،،

اس وقت میں کہ غالب پینشن سے مایوس ھو چکے تھے اور اس کے علاوہ معیشت کے دوسرے تمام راستے بھی بند تھے نواب رام پور نے ان کی بڑی دست گیری کی۔ نہ صرف یہ کہ انہیں ان کے یہاں سے سو روپیہ ماھوار وظیفہ ملنے لگا بلکہ انہیں کی سفارش سے انگریزی حکام کے خیالات غالب کے بارے میں بدلے اور پینشن کے دوبارہ جاری ھونے کی صورت نظر آئی۔

غالب کی زندگی میں سرکاری پینشن کی ضبطی اور واگزاری کا معاملہ ہی ایسا نہ تھا جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے تعلق رکھتا تھا اور جس نے اس کے بعد غالب کی زندگی کو گوناگوں آلام اور مصائب کا شکار بنا دیا تھا بلکہ اس ہنگامے کے نتیجے میں شہر اور اہل شہر کی وہ تباہی اور بربادی بھی تھی جسے ضعیف اور ناتوان غالب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سنا اور جس نے ان کی زندگی کے ان لمحوں کو موت سے بدتر بنا دیا ۔ یہ ہنگامہ ایک ایسا خوفناک زلزلہ تھا جس نے شہر اور اہل شہر پر یکبارگی قیامت صغرا نازل کرکے ہی دم نہیں لیا بلکہ مدت تک اس کے جھٹکے برابر محسوس ہوتے رہے اور ارضی و سماوی آفتیں بھی اس کی تباہی اور بربادی میں اضافہ کرتی رہیں ۔ اس مسلسل تباہی و مستقل بربادی کا دردِ انگیز خاکہ غالب نے اپنے خط میں اس طرح کھینچا ہے ——— ''اس شہر پر پانچ لشکروں کا حملہ پے بہ پے ہوا ۔ پہلا حملہ باغیوں کا جس میں شہر کا اعتبار لٹا، دوسرا خاکیوں کا اس میں جان و مال عزت و ناموس مکان و مکین و آسمان و زمین اور آثار ہستی سراسر لٹ گئے، تیسرا لشکر کال کا جس میں ہزار ہا آدمی بھوکے مرے، چوتھا لشکر ہیضہ کا جس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے ۔ پانچواں لشکر تپ کا اس میں تاب و طاقت نہ پائی، نہ لشکر نے اب تک شہر سے کوچ کیا ہے ۔ '' اس ہنگامے کے بعد کافی مدت تک شہر انگریزی فوج کی چھاونی بنا رہا اور اہل شہر کو کہیں اور کسی طرح امان نہ تھی پناہ نہ تھی انگریزی حکام ان سے بری طرح اپنی ابتدائی شکست اور شرمندگی کا بدلہ لے رہے تھے غالب نے ان دردناک واقعہ کا حال اپنے قلم کو خون دل میں ڈبو کر لکھا ہے :—

''ہے ہے کیوں کر لکھوں کہ حکیم رضی الدین خاں کو ایک خاکی نے گولی مار دی اور احمد حسین خاں اور ان کے بھائی اسی دن مارے گئے ۔ طالع یار خاں کے دو بیٹے رخصت لے کر آئے تھے ۔ غدر(۱) کے سبب نہ جا سکے یہیں رہے بعد فتح دہلی کے دونوں بے گناہوں

---

(۱) افسوس غالب بھی اس جنگ آزادی کے ہنگامے کو غدر کہتے ہیں ۔ ع-م

کو پھانسی ملی - میر چھوٹنم نے بھی پھانسی پائی ،،---حکیم غلام نجف خاں کو لکھا ''خصوصاً اس فتنہ و آشوب میں تو میرا کوئی جاننے والا نہ بچے گا -،، یوسف مرزا کے نام خط اور بھی رقت انگیز ھے ---میرا حال سوائے میرے خدا کے کوئی نہیں جانتا - آدمی کثرت غم سے سودائی ہو جاتے ھیں عقل جاتی رھتی ھے اگر اس ھجوم غم میں میری قوت متفکرہ میں فرق آ گیا ھو تو کیا عجب ھے بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ھے۔ پوچھو کہ غم کیا ھے؟ غم مرگ، غم رزق، 'غم فراق، غم عزت۔ غم مرگ میں قلعہ نا مبارک سے قطع نظر کرکے اھل شہر کو گنتا ھوں مظفر الدولہ میر ناصر الدین، مرزا شور بیگ میرا بھانجہ اس کا بیٹا مرزا احمد انیس برس کا بچہ، مصطفے خاں اور اس کے دو بیٹے ---کیا میں ان کو عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا---انہیں کہاں سے لاؤں---غم فراق حسین مرزا، یوسف مرزا، میر مہدی، میر سرفراز حسین، میرن صاحب خدا ان کو جیتا رکھے کاش یوں ھوتا جہاں ھوتے خوش رھتے گھر ان کے بے چراغ وہ خود آوارہ - سچ تو یہ ھے کہ غالب کو اپنے دوستوں اور عزیزوں کی موت اور مصائب کا غم اپنی تباھی اور بے رونقی سے بھی زیادہ تھا مرزا حاتم علی مہر کو لکھا ھے --- ''کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں اپنی تباھی اور بے رونقی کے غم میں مرتا ھوں - جو غم مجھکو ھے اس کا حال تو معلوم مگر اس غم کی طرف اشارہ کرتا ھوں کہ انگریز کی قوم میں جو ان روسیاہ کالوں کے ھاتھوں سے قتل ھوئے اس میں میرا کوئی امید گاہ تھا کوئی میرا شفیق تھا کوئی میرا دوست تھا کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد اور ھندوستانیوں میں کچھ عزیز کچھ دوست کچھ معشوق تو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ھوتا ھے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ھو زندگی اس کی کیوں کر نہ دشوار ھو،،--- اس غم مرگ کے بعد غم فراق کا ایک اور منظر دیکھیئے--- ''وہ ھی میں ھوں وھی بالا خانہ ھے سیڑھیوں پر نظر ھے کہ وہ میر مہدی آئے وہ میر سرفراز حسین آئے وہ یوسف مرزا آئے وہ یوسف علی خاں آئے، مرے ھوؤں کا نام نہیں لیتا - بچھڑے ھوؤں کے نام گنے ھیں - اللہ اللہ ھزاروں کا ماتم دار ھوں میں مروں گا تو مجھے کون روئے گا -،، حقیقت یہ ھے کہ

غدر کے بعد غالب کے لئے زندگی کا تمام تر ماحول اور دھلی کے زمین و آسمان کچھ اس طرح بدل گئے کہ خود انہیں یہ احساس ہونے لگا کہ انہیں اپنی زندگی میں دوبارہ جنم لینا پڑا ھے ––''وہ ایک جنم تھا–– بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا–––اگرچہ صورت اس جنم کی مثل پہلے جنم کے ھے مگر ناگاہ وہ زمانہ رہا نہ وہ اشخاص، نہ معاملات نہ وہ اختلاط،، ۔ اور اس طرح اس جنم میں سوائے اس کے کہ غالب کا سلسلۂ حیات پہلی زندگی سے منقطع نہیں ہوا مگر اور سب کچھ بدل گیا بلکہ درھم برھم ہو گیا ۔ غالب نے آلام روزگار کا ھمیشہ مردانہ وار مقابلہ کیا تھا ۔ ان میں غم کے لئے برداشت ھی نہیں طلب بھی پائی جاتی تھی ۔ واقعہ کتنا ھی سخت کیوں نہ ھو زندگی انہیں پھر بھی عزیز رھتی تھی اور وہ ھمیشہ تاب لاتے ھی بنے گی غالب کہتے نظر آتے تھے مگر اب زندگی ان سے بری طرح انتقام لینے پر آمادہ تھی–––''حضرت سچ تو یہ ھے کہ غم ھائے روزگار نے ہم کو گھیر لیا ھے سانس نہیں لے سکتا تنگ کر دیا ھے،، ۔ وہ گھر کی رونق کو ایک ھنگامہ پر موقوف سمجھتے تھے ۔ مگر اس ھنگامہ میں گھر کو وہ آگ لگی کہ جو تھا جل گیا ۔ اور جو کچھ رہ گیا تھا وہ جلتا جا رھا تھا وہ تہذیب دم توڑ رھی تھی اور وہ تمام آثار مٹ رھے تھے جن کا نام مغل دور تھا اور جو خود غالب کی زندگی میں سمٹ آئے تھے اور اس کارواں رفتہ کا یہ آخری مسافر اس آخری تباھی اور بربادی پر تنہا ماتم سرائی اور مرثیہ خوانی کرنے کے لئے زندہ تھا––– ''سال حال جمعہ کے دن ابو ظفر سراج الدین بادشاہ قید فرھنگ و قیہ جسم سے آزاد ھوئے ۔،، اور ان کی د لی ––– ''آغا باقر کا امام باڑہ اس سے علاوہ کہ خداوند کا عزا خانہ ھے ایک بنائے قدیم رفیع مشھور اس کے انھدام کا کس کو غم نہ ھوگا–––اس سے بڑھکر یہ بات کہ گوروں کا بارک بھی شہر میں بنے گا اور قلعہ کے آگے جہاں لال ڈگی ھے ایک میدان نکالا جائے گا ۔ آج نثار خاں کے چھتے کے مکان ڈھینے شروع ھو گئے ھیں ۔ کیوں میں دلی کے ویرانہ سے خوش نہ ھوں جب اھل شہر ھی نہ رھے تو شہر کو کیا چولھے میں ڈالوں،، ––''یہاں شہر ڈھے رھا ھے بڑے بڑے نامی بازار خاص بازار، اردو بازار، خانم کا بازار کہ ھر ایک بجائے خود ایک

قصبہ تھا پتہ بھی نہیں کہاں تھے ۔ صاحبان امکنہ دوکا کین نہیں بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا اور دوکان کہاں ۔ برسات بھر مینہ نہیں برسا اب تیشہ و کلند کی طغیانی سے مکان گر گئے ——— مصیبت اعظم یہ ہے کہ قاری کا کنواں بند ہو گیا لال ڈگی کے کنوئیں یک قلم کھاری ہو گئے ۔ پرسوں سوار ہو کر کنووں کا حال دریافت کرنے گیا تھا ۔ جامع مسجد سے راجگھاٹ تک بے مبالغہ ایک صحرائے لق و دق ہے ۔ اب جو کنویں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا زندگی گراں ہے اور موت ارزاں ۔،،

اس طوفان بلا اور اس مرگ انبوہ میں اس جشن کا ذکر نہیں جس میں غالب کو بادل ناخواستہ حصہ لینا پڑا تھا نہ اس چراغان کا بیان ہے جس میں انہوں نے اپنے خون دل اور اشک غم کو جلایا تھا ۔

بہر حال ان خطوں میں غدر اور بعد از غدر کی کوئی مربوط اور مفصل تاریخ تو نہیں ہے مگر وہ سب کچھ ہے جس کے ذکر سے تاریخ کے صفحات خالی ہیں اور جسے خود غالب نے اپنی بوڑھی اور پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا تھا ۔ غالب اس کے بعد بھی زندہ رہے مگر اب انہیں زندہ رہنے کی نہیں مرنے کی تمنا تھی ۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نا امیدی اس کی دیکھا چاہیے

منظور الحسن برکاتی

غالب کی ایک نادر فیصلہ کُن تحریر

ماطفل کم سواد و سبق قصه هائے دوست
صد بار خوانده و دگراز سر گرفته ایم

انیسویں صدی کے باکمال شعراء میں مرزا غالب هی کی ایسی خوش نصیب شخصیت هے جس کی زندگی کے هر هر گوشے کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جا رهی هے - اور اس کے متعقد و پرستار اس کے کلام، اس کے خطوط اور مضامین حتی که زبان و قلم سے نکلے هوئے گم شده الفاظ و حروف بهی محفوظ و مدون کرنے میں سرگرم هیں - اور یه حقیقت بهی هے که غالب نے اردو ادب کو جو عظیم الشان اور بلند خیالات عطا کئے هیں وه اس کے متقاضی هیں که ان کے تمام ادبی شه پاروں کو زمانے کی دست برد سے محفوظ اور غیر فانی بنا دیا جائے -

غالب کے فکر کی وسعت اور خیال کی بلندی کے مقام تک اردو ادب کے آسمان میں ابهی تک کوئی پهنچا نهیں هے - بین الاقوامی زبانوں کی دنیا میں دوسرے شعرا کے مقابلے میں غالب کا مقام کیا هے - یه مضمون ابهی تشنهٔ تبصره هے - غالب کے تعلقات اور اس کے ماحول کی تحقیق و تجسس میں ابهی تک شیفتگان غالب لگے هوئے هیں اور جوینده یا بنده کے مصداق هندوستان کے طول و عرض میں گم شده اوراق دستیاب بهی هو رهے هیں - زیر نظر مضمون غالب کے بعض قصائد کی ترسیل سے متعلق هے -

ایک مدت سے یه مسئله موضوع بحث بنا هوا هے که مرزا غالب نے نواب وزیرالدوله محمد وزیر خاں والئی ٹونک کی مدح میں جو قصائد لکھے هیں ان کی تاریخ ارسال کیا هے -

محققین غالب مولانا غلام رسول مہر اور مولانا امتیاز علی عرشی بھی اس بارے میں متفق نہیں ھیں -

مولانا مہر قصیدوں کی تاریخ ارسال ۱۲۷۸ھ بتاتے ھیں - ''نواب وزیر الدولہ بہادر والیٔ ٹونک کی مدح میں دو قصیدے ھیں - پہلا قصیدہ ۱۲۷۸ مطابق ۱۸۶۱ء میں بھیجا گیا تھا اس وقت غالب کی عمر چونسٹھ پینسٹھ برس کی تھی -'' (غالب از مہر صفحہ ۲۲۱)

عرشی صاحب نے علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر میں ''غالب کی شعر گوئی'' پر جو سیر حاصل مقالہ تحریر فرمایا ھے - اس مقالے میں ''دواوین فارسی'' کے تاریخی تعین کے ذیل میں کتب خانۂ رام پور کے ایک قلمی نسخے کا تذکرہ فرمایا ھے - اور اس کی تاریخ کتابت پر بحث کرتے ہوئے غالب کے ان قصیدوں کا بھی ذکر کیا ھے - وہ لکھتے ھیں کہ :

''کتاب خانہ رام پور کا یہ قلمی نسخہ ۱۲۶۱ھ کے مطبوعہ نسخے کی نقل ھے - یا یہ دونوں نسخے ایک ھی مسودہ سے منقول ھیں - اور تقریظ کے سنین ۱۲۵۳ھ میں ۱۲۶۳ھ والے نول کشوری کی طرح ردو بدل نہیں کیا گیا ھے -

اس کتاب کی مزید تقویت حاصل ہوتی ھے جب ھم یہ دیکھتے ھیں کہ مرزا صاحب کی غزل

اے ذوق نوا سنجی بازم بخروش آور

جو ۴ اکتوبر ۱۸۵۵ء کی رات میں لکھی گئی تھی - اس نسخہ میں موجود نہیں ھے -''

اس فیصلہ پر صرف یہ اعتراض کیا جا سکتا ھے کہ رام پور کے اس قلمی نسخہ کے صفحہ ۱۸۷ پر نواب وزیر الدولہ وزیر محمد خاں بہادر والیٔ ٹونک کی مدح کا قصیدہ درج ھے جو مولانا مہر کے خیال میں ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) کو ٹونک بھیجا گیا تھا پھر یہ نسخہ ۱۲۶۱ھ کے مخطوطہ سے کیا علاقہ رکھ سکتا ھے -

اس کا جواب یہ ہے کہ وزیرالدولہ والا قصیدہ صرف اس نسخہ میں نہیں کلیات فارسی کے اس نسخہ میں بھی موجود ہے جو نواب فخرالدین خاں مرحوم کا نوشتہ ہے اور ۳۰ مارچ ۱۸۶۱ء کو رام پور پہنچ گیا تھا۔

۱۲۷۸ھ تقریباً ۷ جولائی ۱۸۶۱ء کو شروع ہوا تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ ۳۰ مارچ ۱۸۶۱ء کو رمضان ۱۲۷۷ھ ہوگا اگر یہ قصیدہ ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) میں ٹونک جاتا تو اس نسخہ میں اس کا ہونا ممکن تھا اس طرح ٹونک کا دوسرا قصیدہ بھی اسی مانی الذکر نسخہ میں موجود ہے۔ لہذا اس کو بھی ۱۲۷۷ھ سے قبل کا ہونا چاہیئے۔،،
(علی گڑھ میگزین ۴۸-۹۴ء صفحہ ۱۱۷)

بھر حال ہر دو محققین تاریخ ارسال قصائد کے بارے میں ''مضطرب،، ہیں اور یہ تاریخی اضطراب حل نہ ہو سکا۔

میں ایک مدت سے کتب خانہ وزیری و دفتر منشی خانہ ریاست ٹونک کے کاغذات و فائل ''ادبی شہ پاروں،، کی تلاش میں کھنگال رہا تھا کہ مرزا غالب کی ایک رسید بطرز عرضداشت نظر پڑی اپنی کاوش کے اس انجام پر خدا کا شکر ادا کیا۔

عرضداشت کی نقل ذیل ہے:-

عرضداشت بندہ درگاہ اسد اللہ

بحضور مکرمت ظہور بندگان دارا دربان حضرت نواب صاحب قبلہ و کعبہ درجہان، قلزم فیض و محیط احسان دام اقبالہ،

محتوی بر این کہ روزے چند ازین پیش عرضداشتی با قصیدہ کہ درتہنیت عید سعید ذی الحجہ فرد ریختہ کلک نیاز صریر بود بتوسط خان صاحب الطاف نشان میر فضل حسین خاں ارسال یافتہ امروز کہ چہاردھم صفر ۱۲۶۸ھ است خانصاحب مشفق طالع یارخاں منشور کرامتے کہ مہر مہر شعاع

خدائگان بر عنوان داشت بمن سپردند و مبلغ چہار صد و پنجاه و سه روپیه سکهٔ انگریزی که دریں قلمرو روائے دارد حوالت کردند، سپاس یاد آوری شکر درویش پروری بجائے آوردم یارب ولی نعمت را عمرو دولت و جاه و مکنت فراوان و لفظ امیر المو مینن مشرف نامه اقبال خدا داد را زیب و عنوان باد -

مہر

نجم الدوله دبیرالملک

اسد الله خاں نظام جنگ

غالب کی اس تحریر نے ''عیدالاضحی،، والے قصیدے کی تاریخ کا تو فیصله کر دیا که یه قصیده ذی الحجه ۱۲۶۷ھ میں ارسال کیا گیا تھا اور اس سال عیدالاضحی موسم سرما کے آغاز ھی میں آئی تھی - جیسا که خود غالب نے قصیدے کی تشبیب میں کہا ہے -

عیدالاضحی برسر آغاز زمستان آمد
وقت آراستن جمره و ایوان آمد
گرمی از آب بروں رفت و حرارت ز هوا
محمل مہر جہان تاب به میزان آمد
روز می کا هدوشب راست درافزائش روئے
موسم دیر، غنودن به شبستان آمد
آذر افروز و خزو اطلس و سیقور بدوز
مہر می رود اینک مه آباں آمد
هند درفصل خزاں نیز بہارے دارد
گونا گون سبزه علی بند خیاباں آمد
دی و بہمن که دراقلیم و گریخ بندد
اندرین ملک گل و سبزه فراواں آمد
نخل تاریخ نه بینی که هم ازمیوه و شاخ
گوئے و چوگاں بکف آورد به میداں آمد

ایسی صورت میں عرشی صاحب کا یه فیصله کرنا که ''کتب

خانہ رام پور کا قلمی نسخہ ۱۲۶۱ھ کے نسخے کی نقل ہے،،۔ محل نظر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جب غالب کی تحریر کے بموجب یہ قصیدہ ۱۲۶۷ھ میں لکھا گیا تو پھر یہ ۱۲۶۱ھ والے نسخے میں کیسے شامل ہو سکتا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ رام پور کا وہ قلمی نسخہ ۱۲۶۷ھ کے بعد کا مرتب کردہ ہے ۔

البتہ نواب فخرالدین خاں مرحوم کے نوشتہ کلیات میں اس قصیدے کا ہونا باعث تعجب نہیں ۔ کیونکہ بقول عرشی صاحب یہ نسخہ ۱۸۶۱ء میں رام پور پہنچا تھا ۔ ۱۸۶۱ء کے مطابق سن ھجری ۱۲۷۷ ہے ۔ ۱۲۷۷ھ میں اس قصیدے کو لکھے ہوئے دس سال گزر چکے تھے اور غالب کو صلہ بھی چار سو ترپن روپیہ مل گیا تھا ۔

گزیٹیر ٹونک میں ہے کہ ٹونک میں ۱۸۷۳ء تک مادھوپوری سکہ رائج تھا جس کے مقابلے میں کلدار روپیہ (سکہ انگریزی) ایک آنہ سوا آنہ زائد ہوتا تھا ۔ چارسو ترپن کا مطلب یہ ہے کہ مرزا غالب کو نواب وزیرالدولہ کے دربار سے پانچ سو روپیہ سکہ مادھو پوری صلہ مرحمت ہوا ۔ عرضداشت میں ''درین قلمرو روائے دارد،، کا فقرہ اس چیز کو بتاتا ہے کہ انگریزی اور ٹونک کے سکہ میں فرق مرزا غالب کو بھی معلوم تھا ۔

بادی النظر میں پانچ سو روپے کا صلہ بہت تھوڑا معلوم ہوتا ہے ۔ لیکن ٹونک کی آمدنی اور روسائے ٹونک کی بالعموم عادت داد و دھش کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو نظر آئے گا کہ پانچ سو روپے کا صلہ اس وقت کے لحاظ سے بلند صلہ تھا ۔

ساتھ ہی اس کو بھی نظر میں رکھنا چاہیے کہ نواب وزیرالدولہ سید احمد شہید کی مجاھدانہ تحریک کو اور سید صاحب کے ساتھیوں کو ہمیشہ خفیہ طور پر ہزاروں روپے سے مالی امداد دیتے رہے ۔ اور سید صاحب کی شہادت کے بعد آپ نے پورے قافلہ کو ٹونک میں لا بسایا اور سینکڑوں آدمیوں کی کفالت کی ۔

ان حالات کے پیش نظر ایک مجاہدانہ نظر رکھنے والے رئیس کے دربار سے ایک قصیدے کے صلے میں دور بیٹھے ہوئے آدمی کو پانچ سو روپے صلہ مل جانا ہی بہت کچھ ہے ۔ اس کے علاوہ روپیہ کی قیمت اس زمانے میں بہت بڑی تھی ۔ ٹونک کی فوج کے ملازم کو چار پانچ روپیے تنخواہ ملتی تھی ۔ اہل کاروں میں دس روپیہ تنخواہ رکھنے والا آدمی دولت مندوں میں شمار کیا جاتا تھا اس لئے بھی ہمارا فیصلہ ہے کہ غالب کو گراں قدر صلہ ملا ۔

منقولہ بالا عرضداشت میں مرزا غالب نے میر افضل حسین خاں اور طالع یار خاں کا ذکر کیا ہے ۔ یہ دونوں غالب کے حلقۂ احباب میں داخل تھے اور ریاست ٹونک سے بھی وابستہ تھے ۔

طالع یار خاں کا ٹونک کے ''استادان فن سپہ گری،، میں شمار تھا نواب وزیر الدولہ بڑی قدرو منزلت کرتے تھے ۔ ٹونک میں ''استاد،، کے لقب سے مشہور تھے ۔ غدر کے زمانے میں ان کے دو بیٹے جو ٹونک سے دھلی رخصت پر گئے ہوئے تھے پھانسی پر چڑھا دئے گئے ۔ مرزا غالب نے اپنے خط میں جو نواب انور الدولہ سعدالدین خاں کے نام ہے ان کے قتل پر ان الفاظ میں اظہار افسوس کیا ہے :

''طالع یار خاں کے دونوں بیٹے ٹونک سے رخصت آئے تھے غدر کے سبب جا نہ سکے یہیں رہے ۔ بعد فتح دھلی دونوں بے گناھوں کو پھانسی ملی ۔ طالع یار خاں ٹونک میں زندہ ھیں پر یقین ہے کہ مردہ سے بدتر ھوں گے ۔،،

('عود، مطبوعہ نولکشوری صفحہ ۵۷)

میر تفضل حسین خاں غالباً یہ وھی میر تفضل حسین خاں ھیں جو مضطر خیر آبادی کے دادا تھے ۔ اور اس زمانے میں ریاست ٹونک کے سفیر تھے اور سفارت ریاست کے سلسلے میں دھلی میں بھی آمد و رفت اور قیام رھتا تھا اردو معلی کے بعض خطوط میں مرزا غالب نے مرزا تفضل

حسین کا ذکر کیا ہے اور ایک خط خاص انہیں کے نام ہے - خیال ہوتا ہے کہ وہ یہی میر تفضل خاں ہوں - غالب ان کو بھی مرزا تفتہ کی طرح کمال اتحاد و یگانگی کی بنا پر ''مرزا،، کے لقب سے یاد کرتے ہوں - بہر حال یہ نام تحقیق طلب ہے -

تاریخ ٹونک میں ہے کہ ''میر تفضل حسین کا انتقال ۱۲۷۰ھ میں ہوا،، ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے حافظ احمد حسین سفارت پر مامور ہوئے - حافظ احمد حسین سید افتخار حسین مضطر کے والد تھے - اب رہ گیا غالب کا دوسرا قصیدہ ''عرفی کی زمین والا،، جس کا مطلع ہے

اے ذات تو جامع صفت عدل و کرم را
دے برشرف ذات تو اجماع امم را

مولانا مہر اس کی تاریخ ارسال بھی ۱۲۷۸ھ ہی بتاتے ہیں - اور عرشی صاحب ۱۲۷۷ھ سے پہلے کی تاریخ قرار دیتے ہیں - تاریخ ٹونک میں بھی اصغر علی آبرو نے ۱۲۷۸ ھ میں غالب کے ایک قصیدے کا ٹونک آنا ظاہر کیا ہے اور یہ کہ جب اس کے صلے میں تاخیر ہوئی تو تقاضے کا ایک قطعہ اور لکھ بھیجا - جس کے چند اشعار یہ ہیں :

گفتم بخرد - بخلوت انس کائے شمع و چراغ ہفت ایوان
آیا زچه او بود که نواب ننوشت جواب نامه ام هاں
آن گونه' عریضه' که دانی درویش نوشته— سوئے سلطاں
آن گونه قصیده' که گوئی از صفحه دمیده سنبلستاں
ایں هر دو رسید نیست پیدا زاں سو اثرے به هیچ عنواں
رنجید مگر ز مدح نواب اے کاش نه گشتمے ثنا خواں
هیهات چه گفته ام که باشم از گفته' خویشتن پشیماں
عقلم بجواب گفت ''غالب،، زنہار مخور فریب شیطاں
نواب بفکر ارمغان است تا نامه فرستدتت بساماں
وانہا که بخاطرش گزاشته است زود آن همه جمع کرد نتواں
زود است که جمع نیز گردد دیراست که داده است فرماں

مولانا مہر لکھتے ہیں -

''تاریخ ٹونک سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قصیدہ کے صلہ میں تاخیر ہو گئی تو غالب نے ایک قطعہ بھیجا جسے خواجہ حالی مرحوم نے ''یادگار،، میں ''ہجو ملیح،، کی مثال کے طور پر نقل فرمایا ہے (یادگار غالب صفحہ ۸۵) اور غالب کی کلیات میں شامل نہ ہو سکا لیکن ''سبد چیں،، میں چھپ گیا تھا - میری رائے میں یہ قطعہ محض حسن طلب کی حثیت رکھتا ہے - اس کے بعد غالب کو صلہ بھیجا گیا لیکن اس کی مقدار و نوعیت معلوم نہ ہو سکی -،، (غالب از مہر صفحہ ۲۲۲)

صلہ کے بارے میں صاحبزاداہ یار محمد خاں بہادر شوکت بھوپالی کی تحقیق یہ ہے کہ ''جناب ممدوح نے ایک قصیدہ جو دیوان فارسی میں مرقوم ہے وزیرالدولہ امیر الملک نواب وزیر محمد خاں صاحب بہادر رئیس ٹونک کی مدح میں لکھ کر ممدوح کے پاس بھیجا - نواب صاحب موصوف نے ارسال صلہ میں عمداً یا سہواً دیر کی - مرزا صاحب نے ایک خط بھیجا (یہ مذکورہ بالا قطعہ کی طرف اشارہ ہے) نواب صاحب نے بعد ملاحظہ ہزار روپیہ بطریق جائزہ روانہ کیا -،،

(انشائے نور چشم صفحہ ۴۷)
مطبوعہ نظامی کانپور ۱۲۸۹ھ

لیکن قصیدے کی ارسال کی ان تاریخوں (۱۲۷۸ھ بقول مولانا مہریا ۱۲۷۷ھ مولانا عرشی کی تحقیق کے مطابق) پر ایک اعتراض تو یہ ہو سکتا ہے کہ مرزا غالب نے اپنے ایک خط میں جو سرور مارہروی کو لکھا تھا اس قصیدے کا تذکرہ کیا ہے کہ ''میں نے کسی زمانہ میں اسی زمین میں ایک قصیدہ لکھ کر وزیرالدولہ والئی ٹونک کو بھیجا تھا - اس میں کے دو شعر آپ کو لکھتا ہوں -،،

ناموس نگہ داشتی از جود بگیتی جز پرد گیان حرم معدن دیم را
وقتیست کہ ایں قوم بہر کوچہ و بازار پرسند زھم منشا رسوائی ھم را
(عود مطبوعہ نولکشوری صفحہ — ۹)

اس خط کے بارے میں جمیل الدین صاحب(۱) ٹونکی کی تحقیق ہے کہ یہ ۸ نومبر ۱۸۵۸ء سے کچھ پہلے لکھا گیا ہے اور ۱۸۵۸ء کے مطابق هجری سن ۱۲۷۴ ہوتا ہے - اور ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۸ء) کے خط میں ''کسی زمانہ میں بھیجا جانا،، لکھنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس وقت اس قصیدے کو بھیجے ہوئے کافی مدت گزر چکی تھی -

دوسرا اعتراض یہ کہ پھر یہ قصیدہ ۱۲۶۱ھ والے مخطوطہ میں کیسے شامل ہوا اور چونکہ عرشی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ دوسرا قصیدہ بھی ۱۲۶۱ھ والے مخطوطہ میں موجود ہے تو پھر اس کی تاریخ ارسال عیدالضحی والے قصیدے سے پہلے کی تسلیم کرنا پڑے گی - اور اس قیاس کی اس بات سے بھی تائید ہوتی ہے کہ کلیات فارسی میں عید الاضحی والا قصیدہ پنجاہ و هفتم اور عرفی کی زمین والا قصیدہ پنجاہ و ششم کے زیرعنوان مندرجہ ہے -

ان تمام تصریحات کے پیش نظر مولانا مہر کا قصیدے کی تاریخ ارسال ۱۲۷۸ھ قرار دینا محل غور ہو جاتا ہے - بہر حال تحقیق ابھی تھک کر نہیں بیٹھی ہے اس کو بھی تلاش کر لے گی -

ان قصیدوں کے علاوہ مرزا غالب اور نواب وزیر الدولہ میں مراسلت رہی ہے اور غالب نے ''دامن وزیری،، سے وابستگی کو آخر دم تک باقی رکھا ہے - یہی وجہ تھی کہ جب مرزا کی کوئی کتاب شائع ہوتی تو وہ اس کو اپنے دوسرے قدردان امراء، رؤسا اور حکام وقت کی طرح نواب وزیر الدولہ کو بھی ہدیتاً بھیجتے - چنانچہ جب ۱۲۶۸ھ مہر نیمروز فخر المطابع سے شائع ہوئی تو اس کا ایک نسخہ نواب وزیر الدولہ کو بھی تحفتاً بھیجا اور غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ''دستنبو،، طبع ہوئی تو یہ قطعہ لکھ کر اس کو بھی نذر کیا

---

(۱) ملاحظہ ہو مقالہ ''مہر نیمروز کا ایک خاص نسخہ،، شائع کردہ رسالہ نوائے ادب بمبئی بابت جولائی و اکتوبر ۱۹۵۲ء -

نذر نواب وزیر الدوله آن محیط کرم و دانش و داد
هم بدیں حیله مگر یاد آید غالب خسته که رفتت زیاد

''دستنبو،، پر یاد غالب کے عنوان سے فروری ۱۹۵۳ء کے آج کل میں قطعه کے عکس کے ساتھ ایک مضمون هدیه ناظرین کر چکا هوں -

نواب وزیرالدوله کے انتقال کے بعد جب ۱۲۸۱ھ میں نواب محمد علی خاں مسند نشین ریاست هوئے تو مرزا غالب نے روایت قدیم کے مطابق ان کے مدح میں بهی ایک مثنوی بهیجی - جس میں اپنی قدیمی نیاز مندی کا اظهار کیا هے - فرماتے هیں -

ز غالب که از روز گارے دراز
برین عتبه ساید جبین نیاز

غالب کے چند اہم نقاد

غالب کے نقادوں میں سب سے پہلا نام تو غالب ہی کا ہے جس نے بڑی بے دردی سے اپنے ضخیم دیوان کو چند مختصر اوراق میں منتخب اور محدود کر دیا۔ یہ وہ غالب ہے جس نے دوسروں کے لئے بارہا ''دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھکو زباں اور،، کی دعائیں کی ہیں۔ اور جس کے تنقیدی شعور نے ایک نقطے پر ٹھہرنے کی بجائے کبھی ''رنگ بیدل میں ریختہ لکھنے،، میں خود کو ''قیامت،، ثابت کیا تو کبھی اس قیامت زائی سے آگے بڑھکر سادگی اور پرکاری کے وہ انداز اختیار کئے جو ''میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔،، کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ یہی نہیں شاعر غالب کی وہ دوسری شخصیت جو تنقیدی شعور رکھنے والے غالب کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے کبھی قتیل سے معرکوں میں، کبھی عرفی اور ظہوری کے اشعار کی وضاحت کرنے میں اور کبھی آتش و ناسخ کے کلام میں ''ورائے شاعری چیزے دگر ہست،، کی تلاش میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

اگر تنقید و تخلیق کی ان دو دنیاؤں کو یک جا کیا جائے اور نقاد غالب کے تنقیدی شعور کی روشنی میں شاعر غالب کے کلام، انتخاب کلام اور معیار شاعری کا جائزہ لیا جائے تو یقیناً ان دونوں شخصیتوں کی یہ ملاقات مفید ہوگی۔ نقاد غالب وہ ہے جو قتیل سے دست و گریباں ہوتا ہے۔ خسرو کے سوا ہندوستان کے کسی فارسی شاعر کے ذوق پر ایمان نہیں لاتا (یہ اور بات ہے کہ میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے) اور مومن اور ذوق کے اچھے اشعار پر جھوم کر اپنا سارا دیوان ایک شعر پر نثار کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔ خود اپنے دیوان کے معتدبہ حصے پر خط نسخ کھینچ دیتا ہے۔ شاعر غالب وہ ہے جو مذاق شعر کا اس

درجہ قدرداں ہے کہ شیفتہ کی داد اس کے لئے حاصل کلام ہے اور صہبائی اور فضل حق کا علم و فضل اس کے نزدیک مسلم -

شیفتہ غالب کے پہلے نقاد ہیں جن کا شعری شعور غالب کے تخلیقی عمل میں بھی کسی حد تک کارفرما نظر آتا ہے - شیفتہ ہماری تنقید میں نظیر اکبرآبادی کی شاعری کو سوقیانہ اور مبتذل قرار دینے پر بدنام ہوئے ہیں - لیکن اس ایک بات ہی سے کم از کم یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ وہ ''طریقہ راسخہ قدما،، کے پابند ہیں اور ان کا مذاق ثقات کا مذاق ہے جس میں روایت کا رچاؤ اور کلاسیکی نظم و ضبط کا شدید احساس ہے - وہ جدت اور تخیل کو صرف اس حد تک پسند کر سکتے ہیں جہاں تک وہ روایت کے قوس قزح کے باقی رنگوں سے ہم آہنگ ہو - وہ صرف متوازن لہجے اور معتدل رنگوں کے رسیا ہیں شوخی اور بے باکی ان کے ہاں روا نہیں -

شیفتہ دور گذشتہ کی حد اوسط کے نمائندہ ہیں - ان کا مذاق شعر نہ صرف فارسی علم و ادب کی روایات کا پروردہ ہے بلکہ وہ مشرقی تنقید کے سینہ بسینہ منتقل ہوتے ہوئے اصول و ضوابط کے پاسبان بھی ہیں - شیفتہ نے غالب کے لئے اعلا توصیفی کلمات استعمال کئے ہیں - شیفتہ کی تعریف اس بنا پر حیرت ناک ہو تو ہو کہ وہ ناقدردانی کے دور میں غالب کی بڑی قدر کرتے ہیں - لیکن اس لحاظ سے قطعاً حیرت خیز نہیں ہے کہ کہ وہ غالب میں بھی عہد قدیم کی اعلا ترین شاعری کی بنیادی خصوصیات تلاش کرتے ہیں اور غالب کو اسی معیار پر رکھ کر ظہوری، خاقانی، حافظ اور نظیری کے پہلو بہ پہلو بٹھاتے ہیں -

اس طرح شیفتہ غالب کے نقاد نہیں کہے جا سکتے ہاں وہ غالب کے دور کے نقاد ضرور ہیں اور غالباً اس دور کے مذاق سخن کے پاسبان بھی - غالبیات کی باقاعدہ ابتداء تو ''یادگار غالب،، ہی سے ہوتی ہے -

حالی کی ''یادگار غالب،، معذرت سے شروع ہوتی ہے -

——''اگرچہ مرزا کی تمام لائف میں کوئی بڑا
کام ان کی شاعری اور انشا پردازی کے سوا نظر نہیں آتا مگر
صرف اسی کام نے ان کی لائف کو دارالخلافہ کے اخیر دور کا
ایک مہتم بالشان واقعہ بنا دیا ہے۔''

ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

''اگرچہ مرزا کی لائف —— ان فائدوں سے خالی نہیں
ہے جو ایک بائیگرافی سے حاصل ہونے چاہئیں لیکن اگر ان فائدوں
سے قطع نظر کی جائے تو بھی ایک ایسی زندگی کا بیان جس میں
ایک خاص قسم کی زندہ دلی اور شگفتگی کے سوا کچھ نہ ہو
ہماری پژمردہ اور دل مردہ سوسائٹی کے لئے کچھ کم ضروری
نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ہر قوم میں عموماً اور گری ہوئی
قوموں میں خصوصاً ایسے عالی فطرت انسان شاذونادر پیدا ہوتے
ہیں جن کی ذات سے اگرچہ قوم کو براہ راست کوئی معتدبہ فائدہ نہ
پہنچا ہو لیکن کسی علم یا صناعت یا لٹریچر میں کوئی حقیقی
اضافہ کم و پیش ظہور میں آیا ہو۔''

حالی سے اردو میں نئے تنقیدی شعور کی داغ
بیل پڑی۔ حالی ہی نے با شعور طریقے پر اس بات کا اعتراف کیا
کہ ''خیال بغیر مادے کے پیدا نہیں ہوتا''، اور اس خیال کے
پیش نظر انھوں نے ادب اور شعور کی کیفیات اور خیالات کی
بنیادیں سماجی زندگی کے رابطے میں تلاش کیں، پھر اس دور
میں جب پرانی بساط تہ ہو چکی تھی اور مغربی علوم سے
وابستگی کی مدد سے نئے راستے کھل رہے تھے، نئی اصلاحی
تحریکیں تعلیمی اور معاشرتی قطع و برید کے محرکات رواج
پا رہے تھے۔ حالی اور ان کے ساتھیوں نے نیچرل شاعری کی
آواز بلند کی اور اپنی نئی مقصدیت اور مغرب کی اصلاح پسندی
کے جوش میں ادب سے بھی اخلاقی تقاضے کئے۔

لہٰذا حالی کے سامنے غالب پر تنقید کا سوال بھی اس شکل میں آتا ھے ۔ کیا غالب کے کلام میں اخلاقی مضامین کی کثرت پائی جاتی ھے ؟۔ کیا غالب کا کلام قوم کی اخلاقی اصلاح کرنے کی قدرت رکھتا ھے ؟ کیا ان کے اشعار نیچرل شاعری کے اس معیار پر پورے اتر سکتے ھیں جسے ملٹن کے الفاظ میں مولانا حالی نے ''اصلیت، سادگی اور جوش،، کی شکل میں ظاھر کیا تھا ؟

مولانا نے غالب کے کلام میں اس ''جدت مضامین اور طرفگئی خیالات،، کا عکس دیکھا جسے وہ متقدمین کی ''نیچرل،، شاعری کا خاصہ قرار دیتے آئے تھے ۔ حالی لکھتے ھیں :

''میر و سودا اور ان کے متقدمین کے کلام میں ایک قسم کے خیالات اور مضامین دیکھتے دیکھتے جی اکتا جاتا ھے اور اس کے بعد مرزا کے دیوان پر نظر ڈالتے ھیں اور اس میں ہم کو ایک دوسرا عالم دکھائی دیتا ھے اور جس طرح کہ ایک خشکی کا سیاح سمندر کے سفر میں ایک بالکل نئی اور نرالی کیفیت مشاھدہ کرتا ھے اس طرح مرزا کے کلام میں ایک اور ھی سماں نظر آتا ھے ۔،،

اس نئی طرز کے بارے میں خود ان کا یہ کہنا ھے کہ ''نئی طرز اس وقت تک ایجاد نہیں ھوتی جب تک ضرورتیں اھل فن کو مجبور نہیں کرتیں ۔،، اور اس بنا پر نئی طرز جو فارسی میں چار سو سال بعد ظہور میں آئی تھی ریختے میں ڈیڑھ سو سال کے اندر اندر پیدا ھو گئی اور مومن ، شیفتہ ، سالک، عارف، تسکین اور داغ نے اسے رواج دیا ۔ لیکن جو سوال حالی کے عہد سے لے کر آج تک کے نقادوں کو الجھن میں ڈالتا رھا ھے وہ یہ ھے کہ آخر اس ''جدت مضامین اور طرفگئی خیالات،، کی نئی طرز کو جنم دینے والے ادبی اور عمرانی عناصر کیا تھے ؟

حالی خیال پر مادے کی اولیت کے قائل ھیں اور قائل ھوتے

ہوئے بھی مرزا کے خیالات کے انوکھے پن، ان کی شوخی اور ظرافت، ان کے استعارے اور کنائے کے چونکا دینے کی حد تک دل کش استعمال اور ان کے دو معنی اشعار ہی کے تذکرے پر اپنی تنقید ختم کر دیتے ھیں - انھیں دھلی کی آخری بہار کے لٹ جانے کا دل دوز احساس ھے اور وہ اس جلوہ ٔ آخریں کی یادگار ہستیوں کی جیتی جاگتی تصویروں کو محفوظ کر لینے کا اہتمام بھی کرتے ھیں - لیکن حالی کی نظر اس نئی فکر کو پیدا کرنے والے عناصر کا پتہ لگانے میں کامیاب نہیں ہوئی - وہ غالب کے ھاں ایک نیا لہجہ اور انوکھا پن تو دریافت کر لیتے ھیں لیکن اس نئے موڑ کے سماجی عوامل تک پہنچنا ان کی دسترس میں نہیں -

یہی وجہ ھے کہ حالی کی کھینچی ہوئی تصویر غالب کے ذہنی پس منظر کو تقریباً نظر انداز کر دیتی ھے ان کے سوانح اور علمی اور ادبی مشاغل کے بیان کے باوجود حالی غالب کو سماجی پس منظر میں نہیں دیکھتے - وہ کہیں تقابلی تنقید کی مدد سے انھیں ظہوری، حافظ اور نظیری کے مقابل لا بٹھاتے ھیں اور کبھی ان کے اشعار کو تصوف، عاشقانہ اور اخلاق کے عنوان میں تقسیم کرکے ان میں مشرقی تہذیب کے نظام اقدار کی ترتیب قائم کرنے کی کوشش کرتے ھیں -

میر نے اپنے عہد کے مذاق سے اپنی طرز کو علیحدہ کرتے ہوئے کہا تھا -

کیا جانیں دل کو کھینچے ھیں کیوں شعر میر کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

حالی نے یہی استفہامیہ غالب کے کلام کے بارے میں قائم کیا - انھوں نے غالب کے نغموں میں ایک نئی صوت اور نئے آہنگ کا پتہ لگایا - اس صوت و نغمہ کی انوکھی دل کشی کے مختلف عناصر کیا ھیں اس کا جواب ان کے پاس نہیں ملتا -

حالی کے بعد آزاد کے تبصرے کا ذکر عجیب بے محل سا معلوم ہوتا ہے ۔ تاریخی اعتبار سے آزاد کا تبصرہ ''یاد گار غالب،، سے پہلے آتا ہے لیکن اہمیت کے اعتبار سے اس کا ذکر بعد میں ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے ۔ یوں تو مرزا کے کلام میں ''معنی آفرینی اور نازک خیالی،، کی دو خصوصیات کی تلاش زیادہ اہم نہیں ۔ پھر بھی آزاد کا یہ فیصلہ کہ ''غالب نے آتے ہی ایک چوب زور سے نقارے پر ماری کہ کچھ سمجھے اور کچھ نہ سمجھے مگر سب کے منہ سے بے اختیار واہ نکل گئی،، گویا غالب کے دور کے مذاق سخن کی غمازی کرتا ہے جب جدت طرازی کو قدامت نے شرف قبول نہ بخشا تھا اور مرزا کا بانکپن ور بیدل پرستی طعن و تشنیع کا مورد بنی ہوئی تھی ۔

زمانے کا مذاق بدلا اور اس تبدیلی کی پیش گوئی مولانا حالی اور آزاد دونوں ہی کرتے آئے تھے ۔ مغربی ادبیات کے مطالعے نے پہلے ذہنوں کو خیرہ کیا تھا لیکن کچھ عرصے بعد مغرب کے معیاروں سے اخذ نور و نغمہ کرنے کے بعد اپنے سرمائے پر بھی نظریں ڈالی جانے لگیں ۔ کچھ اصلاح پر جوش کی وجہ سے اور کچھ مغربی تصور کو محض وکٹورین عہد کے اخلاق پرست انگلستان کی معاشرت تک محدود سمجھنے کی وجہ سے جو افراط تفریط کا سماں پیدا ہو گیا تھا وہ آہستہ آہستہ دوسرے راستوں میں ڈھلنے لگا ۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے فکری اور تنقیدی سانچے بدل رہے تھے ۔ اب ہمارے نزدیک کمال کا معیار نظیری اور حافظ کے مقابلے پر نہ تھا بلکہ اس عالم گیر فلسفیانہ میزان پر تولنے پر تھا جو مغرب اور مشرق کے علم کو کسی حد تک ایک ہی سلسلے میں پروتی تھی ۔ مغرب کی روشنی اور حرارت کے ساتھ مشرق کی ماورائیت اور داخلیت نے مل جل کر ایک نو رومانوی انداز نظر کورواج دیا تھا جس میں احساس جمال ہی سب کچھ تھا اور خیال اور کیفیت کی پرچھائیاں ہی دراصل فن کی بنیادی خصوصیات تھیں ۔

حالی کے اندیشوں کے خلاف غالب کا کلام استداد زمانہ سے مٹنے کی بجائے ایک ایسے نقش کی طرح ابھرا جو واقعی لوح جہاں پہ

حرف مکرر نہ تھا، نئی نسل نے غالب کے کلام میں نظیری، حافظ اور ظہوری کی استادانہ کاریگری کا عکس دیکھنے کی بجائے ان میں نئے علوم اور فلسفوں کا پرتو دیکھا ۔ ان اشعار میں نئی نسل کی ذہنی کیفیت کی پوری ترجمانی تھی ۔ غالب کو اس آنے والی نسل کے مسائل کا علم نہ تھا لیکن کم از کم ان کے کلام کی فضا نئی نسل کی ذہنی کیفیت کی غماز ضرور تھی ۔ دونوں ایک ایسے دوراہے پر ملے تھے جہاں پرانی تہذیب غروب ہو رہی تھی اور نئی تہذیب طلوع نہیں ہوئی تھی ۔

بجنوری کا مطالعہ غالب ، دراصل اسی روحانی ہم آہنگی کی صدائے باز گشت ھے ۔ مہدی افادی نے یاد گار غالب کے بارے میں لکھا تھا ''ایک شریف انسان نے ایک شریف تر انسان کی ہمدردانہ سرگزشت لکھی ھے اور آشنائے فن ہو کر لکھی ھے ۔،، یہ بات کسی حد تک بجنوری کے ''محاسن کلام غالب،، کے بارے میں کہی جا سکتی ھے ۔ ایک شریف انسان نے ایک شریف تر انسان کی وکالت کرنے کی کوشش کی ھے اور آشنائے فن ہو کر کی ھے ۔ بجنوری کے علمی تبحر ان کی وسعت نظر، ان کے فلسفیانہ عمق اور جزباتی و فور کا انکار ممکن نہیں تھا ۔ وہ غالب کے ہر شعر کو فکری کائنات میں تحلیل کر دیتے ھیں ۔ یہ کائنات، آفتاب و ماہتاب بہار و خزاں گریہؑ ابر و بہار اور خندۂ برق ھی سے آراستہ ھے ۔ یہ اور بات ھے کہ یہاں کا ماہتاب مہ نخشب کی طرح بناوٹی ھے اور یہاں کے ابروباد، بہار و خزاں سب ایسی فضائے نا معلوم کے اجزا ھیں جن تک غالب کی فکر کی پوری طرح رسائی نہیں ہوئی تھی ۔

غالب بجنوری کے موضوع نہیں ان کے ہیرو ھیں ۔ ان کی اپنی ذات کی توسیع ھیں ۔ ایک ایسا ماورائی اور روحانی تصور ھیں جس کی تخلیق بجنوری کے فلسفہ طراز ذہن نے کی ھے ۔ بجنوری یہ چونکا دینے والا اعلان کرنے کے بعد کہ ''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ھیں ۔ ایک مقدس وید اور دوسرا دیوان غالب،، اپنے کو غالب کے نقاد کی حیثیت سے نہیں بلکہ ان کے مفسر کی حیثیت سے پیش کرتے ھیں ۔ یہ اور بات

ھے کہ غالب کا یہ نفس ناطقہ یا ھمزاد تفسیر کرتے کرتے خود شاعر کی حد بندیوں سے بہت دور نکل جاتا ھے -

''کتاب فطرت ایک تاریک کتاب ھے اور اس پر صرف شاعر ھی روشنی ڈال سکتا ھے ،، بجنوری نے یہ خراج غالب کو پیش نہیں کیا، غالب کے اس تصور کو پیش کیا ھے جسے ان کے ذھن نے پیدا کیا ھے اور ھیرو کی شکل دے دی ھے چنانچہ بجنوری کی تنقید تنقید نہیں تشریح ، تفسیر بلکہ تاویل کا درجہ رکھتی ھے اور اس تاویل کی کوشش میں وہ غالب کے دور، ان کی شخصیت اور ان کے فکری پس منظر کو سمجھنے کی بجائے شعر کے الہامی تصور اور خیال کی تاثراتی وسعتوں میں کھو جاتے ھیں -

بجنوری کا مقدمہ ''تنقید غالب،، نہیں غالب کی خدمت میں نئی نسل کا خراج عقیدت ھے - بجنوری کے نزدیک کلام غالب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ھے کہ

''وہ کون سا نغمہ ھے جو ان تاروں میں خوابیدہ یا بیدار نہیں -،،

مضامین کا تنوع اور فکر کی وسعت ان کے نزدیک غالب کے کلام کا بنیادی آھنگ ھیں وہ حالی کی طرح صرف غالب کی خوش طبعی اور زندہ دلی کا پرتو ھی نہیں دیکھتے بلکہ ان کے قہقہوں اور آنسوؤں میں کائنات کے فلسفیانہ ادراک اور انسانیت کے گہرے درد کی پرچھائیاں بھی تلاش کرتے ھیں جو غالب کے قہقہوں کو حالی کی طرح ان کے ''حیوان ناطق کے بجائے حیوان ظریف ھونے،، کے جواز میں پیش نہیں کرتے بلکہ ان قہقہوں میں ایک مفکر کی سنجیدگی اور متانت کا پتہ لگاتے ھیں - بقول بجنوری جو شخص زندگی کو دور سے دیکھتا ھے اور خود بے پروا رھتا ھے وہ ھنستا ھے اور جو قریب سے دیکھتا ھے اور اس میں شریک ھوتا ھے وہ نہیں ھنستا - غالب کی طبیعت میں رحم ھے وہ انسانی کمزوریوں پر لب آسا ھنستے نہیں بلکہ چشم آسا روتے ھیں ایک اور جگہ لکھتے ھیں :

''ان کے لب ہنسی سے نا آشنا نہیں لیکن ہنسی صرف برنجی قہقہے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس سے ان کا سارا کلام دو آتشہ بن جاتا ہے۔''

غالب کی عظمت کی یہ بہت بڑی دلیل ہے کہ بجنوری کی شکل میں نئی نسل نے نہ صرف ان سے عقیدت کا اظہار کیا بلکہ ان کی عظمت کو پرانے معیاروں کے بجائے نئے علمی معیاروں پر قایم کیا ہے ۔ لیکن اس عظمت کا اس سے بھی زیادہ کامیاب اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ غالب کی مقبولیت بجنوری کے استدلال کے شکست ہو جانے پر بھی قائم رہی ۔ ان اشعار کو پڑھئے :

چھوڑا مہ نخشب کی طرح دست قضا نے
خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولی برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

ہم میں سے کتنے ہیں جو ان اشعار میں بجنوری کی طرح ڈارون کے فلسفۂ ارتقایا چاند کی تشکیل اور اس کے اخذ نور کی سائنٹفک حقیقتوں کا ادراک تلاش کریں اور یہ معلوم ہونے کے بعد بھی کہ غالب انیسویں صدی کی مغربی سائنس کی تحقیقات سے واقف نہ تھے ان اشعار کو پہلے ہی کی طرح عزیز نہ رکھیں ۔

بجنوری نے غالب کے کلام میں مغربی مفکر کے ذہن کی تلاش کی ۔ اول تو یوں بھی غزل کے اشعار میں مختلف النوع اور بظاہر متضاد بیانات کی کثرت ہوتی ہے ۔ اور ان کی مدد سے ایک مربوط فلسفۂ خیال کی ترتیب دشوار ہوتی ہے ۔ دوسرے بجنوری غالب کا مطالعہ غالب کے دور کے ذہنی اور عمرانی پس منظر سے الگ کرکے پیش کر رہے تھے ۔ غالب

صرف ایک ماورائی وجود محض ایک خیال مجرد کی تجسیم نہیں تھے ایک معاشرے کا نقطہٴ عروج تھے - جن کی شخصیت نے اپنے دور کے فکری ذخیرے سے متاثر ہو کر اپنے تمدن کی ساری قدروں کو اپنا کر انفرادی جوہر کی رونمائی کی تھی -

بجنوری نے جس بلند سطح پر غالب کی عظمت کا ستون استوار کرنے کی کوشش کی تھی ان سے ایک حلقے کو ناامیدی اور بے اطمینانی کا احساس پیدا ہونا لازمی تھا - ڈاکٹر عبداللطیف نے غالب کے کلام میں اس ''روحانی ہم آہنگی،، کی تلاش کی جس کا عکس بجنوری نے جگہ جگہ پیش کیا تھا اور ان کی تحقیق نے صرف اس نتیجے تک پہنچایا کہ

''بحیثیت ایک لفظی صنعت گر کے غالب تمام اردو شعرا میں ایک بلند مرتبہ پر فائز نظر آتا ہے -،،

اور ''غالب کے کلام میں روحانی ہم آہنگی کی کمی ہے ،،

ڈاکٹر عبداللطیف بھی دراصل غالب کو ایک مفکر کی حیثیت سے دریافت کرنے کی سعی کر رہے تھے اور جب کچھ تو غزل کے آرٹ کی حد بندیوں کی بنا پر کچھ غالب کے ذہنی ارتقا کی مختلف اور پرپیچ منزلوں کی بنا پر اور کچھ واقعی مربوط فلسفہٴ فکر کی عدم موجودگی کی وجہ سے انہیں اس کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی تو انہوں نے اسے روحانی ہم آہنگی کی کمی سے تعبیر کیا -

اس ''روحانی ہم آہنگی،، یا ''مربوط فلسفہٴ فکر،، کی تلاش کو مجرد تصورات کی شکل میں جاری نہیں رکھا جا سکتا - ظاہر ہے کہ غالب یا اس دور کے عظیم ترین ادیب اور شاعر بھی ان معنوں میں مفکر قرار نہیں دئے جا سکتے - لیکن کیا اس مربوط فلسفہٴ فکر کا تصور غالب کے عہد میں واقعی اس شکل میں موجود تھا جن معنوں میں آج ہم اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں -

بد قسمتی سے اس دور کی ہندوستانی اور اسلامی فکر کی مکمل تصویر ابھی مربوط طریقے پر پیش نہیں کی گئی اور اس عہد کی معاشی اور عمرانی

زندگی کا خاکہ بھی ہنوز تشنہٗ تکمیل ہے - پھر بھی اگر اس دور کے ادبی ذہن کا تصور کیا جائے تو اس کے مختلف تضاد اور اختلافات نظر کے سامنے آتے ہیں - ایک طرف خود ہمارے تمدن میں قدیم عناصر کی باہمی آویزش کے ساتھ ساتھ مغربی اثرات کا ایک نیا عنصر داخل ہوا تھا اور وہ سیاسی اور انتظامی اعتبار ہی سے اپنا جلوہ نہیں دکھا رہا تھا بلکہ اس کے جلو میں نئے تہذیبی عناصر کی جھلکیاں بھی تھیں - پرانی تہذیب اور اس کی اقدار کہیں کہیں سنبھالا لیتی نظر آتی تھیں - لیکن نئی زندگی کے تقاضوں سے پوری طرح عہدہ برآ نہیں ہو رہی تھیں -

ایک طرف اسلامی تصوف کی وہ روایت تھی جس نے اردو شاعری کی فکر کو پروان چڑھایا ہے اور جس کے نشوونما میں اگر ایک طرف نوافلاطونی فلسفے، ایرانی اثرات اور ہندو یوگیوں کے رابطوں کا حصہ رہا ہے تو دوسری طرف اسلامی فکر کے مختلف عناصر خصوصاً معتزلہ فرقہ اور اس کے استدلال نے بھی کافی مدد بہم پہنچائی ہے - اس میں شک نہیں کہ اسلامی تصوف اس دور کا غالب فلسفہ تھا اور اردو شاعری کو نہ صرف نفس مضمون کے اعتبار سے بلکہ علامتوں، اشاروں، اسالیب بیان حتی کہ تشبیہہ واستعارہ کے سارے ذخیرے تصوف ہی کے مرہون منت ہیں -

پھر یہ بھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ غالب عملاً صوفی نہ تھے عقائد کے اعتبار سے جہاں وہ صوفیا کے بہت سے مروجہ عقائد کو مانتے تھے وہاں نہ تو وہ ان کی راہ سلوک پر پوری طرح ایمان لاتے تھے اور نہ اس کے مقابلے میں کوئی نیا فلسفہ فکر پیش کرتے تھے - ان کے نزدیک ہمیشہ تصوف کو ''برائے شعر گفتن خوب است،، کا درجہ حاصل رہا - اس کے باوجود کہ وہ کہتے ہیں

''بندہ پرور میں تو بنی آدم کو مسلمان ہو یا ہندو عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں دوسرا مانے یا نہ مانے،،

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :-

''میں موحد ہوں ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں - لاالہ الا اللہ لا موجود الا اللہ لا مؤثر فی الوجود الا اللہ -

وہ صوفی نہیں تھے وہ زندگی سے دامن کش ہونے کے قائل نہیں البتہ اس کے دکھ درد کو رندی و قلندری کے انداز سے گزارنے کے ضرور موید ہیں - اس بنا پر نیاز فتح پوری نے کہا تھا کہ

''اگر غالب نے کوئی فلسفہ پیش کیا تو وہ تفاول و مسرت تھا''

ڈاکٹر عبد اللطیف کی ''روحانی ہم آہنگی'' کی تلاش اگر انہیں اس دور کے فکر اجتماعی کے تجزئے تک لے جاتی تو یقیناً وہ اس ''سفید اور سادہ رنگ تک پہنچ جاتے جس میں سارے آفتابی رنگ مضمر ہیں -''

غالب میں اس فلسفیانہ یک جہتی کے عدم وجود کا جواز محمد اکرام نے 'غالب نامے' میں اس طرح پیش کیا ہے -

''ہر بڑا شاعر زندگی پر اثر ڈالتا ہے اور انتہائی شاعرانہ عظمت کے معیار ہی میں انسانی زندگی کو بدلنے کی قابلیت ہے لیکن اس اثر اندازی کے لئے یہ ضروری نہیں کہ شاعر کسی معین فلسفۂ زندگی یا پیغام کا حامل بھی ہو ——یہی نہیں بلکہ دنیائے شعر میں انتہائی عظمت اکثر انہیں لوگوں نے حاصل کی ہے جنھوں نے انسانی عقائد اور زندگی کے فلسفوں کو تو نہیں چھوا - لیکن اپنے کلام میں تخیل کی تربیت اور نشوو نما کا ایسا سامان چھوڑ گئے جس سے انسانی فطرت میں ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے ——ایک پہلو پر زور تو وہ دے جسے دوسرے پہلو نمایاں نظر نہ آتے ہوں''

اکرام غالب سے فلسفہ فکر تو درکنار ایک مربوط نقطۂ نظر کا بھی تقاضا نہیں کرتے بلکہ اس کمی کو غالب کے فن کا سب سے بڑا حسن قرار دیتے ھیں - اکرام نے غالب کے مطالعے کے سلسلے میں سب سے بڑی خدمت یہ انجام دی کہ ان کے کلام کو مختلف ادوار میں تقسیم کرکے ان ادوار کی خصوصیات تلاش کیں۔ لیکن اگر واقعی ان غزلوں میں کسی مربوط نقطۂ نظر اور کسی باشعور شخصیت کا تصور نمایاں طور پر سامنے نہیں آتا تو پھر ان ادوار میں ھم ذھنی ارتقا کی تلاش ھی کیوں کرتے ھیں -

اکرام غالب کے وسیع مشرب، انسان دوستی اور آزاد خیالی کو ان کے کلام کا بنیادی آھنگ قرار دیتے ھیں اور اس وسعت اور ھمہ گیری میں وہ غالب کو بجنوری کے سے جوش و خروش کے ساتھ شیکسپیر کے پہلو بہ پہلو لا بٹھاتے ھیں - لیکن کیا حقیقتاً غالب کے بارے میں صحیح تنقیدی نقطۂ نظر یہی ھے کہ ھم ان کے کلام کے تنوع پر خراج تحسین پیش کریں اور مبسوط نظام فکر کی تلاش کو غیر ضروری مان لیں - یہی نہیں اکرام نے جس طرح غالب کی ساری ترقی اور کامیابی کو نفسیات کی اصطلاح میں جس احساس کم‌تری کا نتیجہ قرار دے دیا ھے کیا غالب کا کوئی سنجیدہ طالب علم اسے صحیح تجزیہ قرار دے سکتا ھے ؟

نفسیانی ژرف بینی اکرام کی اپنی اصطلاح ھے اور اس پردے میں وہ صرف ان کی آزاد خیالی ھی کو بیان نہیں کرتے بلکہ غالب کے ''فلسفہ تفاول و مسرت،، انسان دوستی، ظرافت، انسانی مجبوریوں پر رونے کی بجائے درد مندی کے ساتھ مسکرا دینے کی ادا ان سب خصوصیات تک رسائی حاصل کرتے ھیں اور اسی بنا پر وہ مرزا کے کلام کی مقبولیت کے اسباب تنوع، تجربہ اور طرز نو کو قرار دیتے ھیں - اکرام نے غالب کے مطالعے کے سلسلہ میں تاریخی کارنامہ سرانجام دیا ھے۔ وہ غالب کو نہ حالی کی طرح قدیم معیاروں میں گم کر دیتے ھیں نہ بجنوری کی طرح ان کے گرد گوئٹے اور الہامی کتابوں کا مقدس دائرہ بناتے ھیں اور نہ لطیف کی طرح انھیں معمولی دنیا دار انسان اور معمولی سے کچھ ھی اعلا شاعر

کے روپ میں دیکھتے ھیں ۔ اس کے باوجود کہ اکرام نے غالب کا ان کی اپنی سطح پر مطالعہ کیا ھے اکرام کی رسائی غالب کے فکری تجزیئے تک نہیں ھوئی ۔ آخر اس طرز نو اور طرفگی ادا، اس تنوع اور انسان دوستی کی بنیادیں کیا ھیں اس سوال کا جواب اکرام کے پاس نہیں ھے ۔

عہد جدید میں بھی غالب کا مطالعہ ھر مکتبۂ تنقید کے لکھنے والوں کے لئے دل کشش موضوع رھا ھے۔ ان میں فیض احمد فیض ھیں جنھوں نے غالب کے کلام میں ایک ''واضح اور نمایاں وحدت،، کی تلاش کی اور اس بنیادی کیفیت یا موڈ کو اداسی کا نام دیا ۔ یہ اداسی قنوطیت نہیں بلکہ ان کے الفاظ میں ''کچھ ماضی کی یاد اور اس کے کھو جانے کا غم، کچھ حال کی بے کیفی اور ویرانی کا احساس اور کچھ مستقبل میں ماضی کے لوٹ آنے کی حسرت، امید اور ناامیدی،، سے مل جل کر تشکیل پاتی ھے۔ اس اداسی کو فیض نے ایک فرد کی ذاتی کیفیت کے بجائے ایک نسل ایک دور کی اجتماعی کیفیت قرار دیا ھے اور یہ دور چونکہ ھمارے ماحول اور ھماری اجتماعی واردات سے بہت مختلف نہیں ھے لہذا غالب کا جادو آج بھی چلتا جادو ھے ۔

ھمارے اپنے عہد کے نقادوں میں ڈاکٹر سید محمود اور قاضی عبدالغفار ھیں جنھوں نے غالب کے جسم پر کم و بیش ایک انقلابی قبا آراستہ کر دی اور غالب کے آرٹ کو محض آرٹ کی بجائے ایک ایسے وجدان سے تعبیر کیا ''جو انھیں زندگی کے اس خار زار کی طرف لئے جا رھا تھا جہاں ھر کانٹے کی نوک ھماری قومی زندگی کے خون سے رنگین تھی،، ۔ اس دور کے نقادوں میں احتشام حسین اور آل احمد سرور کا نام بھی آتا ھے ۔

احتشام حسین کا مقالہ ''غالب کا تفکر،، غالبیات میں ایک نیا باب کھولتا ھے۔ احتشام حسین در اصل غالب کے کلام میں طرفگیٔ مضامین اور جدت ادا کی مادی بنیادوں کی تلاش کرتے ھیں ان کا استفہامیہ یہ

ہے کہ غالب کے کلام میں جس ندرت کا احساس حالی کے دور سے لے کر آج تک برابر کیا جاتا رہا ہے اس کے سماجی عوامل کیا تھے - جہاں وہ غالب کے ذہنی پس منظر اور اس دور کی فلسفیانہ روایت کا تجزیہ کرتے ہیں وہاں اس جدید عنصر کو کم و بیش غالب کے سفر کلکتہ کا اثر قرار دیتے ہیں کیونکہ کلکتہ سرمایہ دارانہ تصورات کا منبع تھا - اور کلکتے کے باہر بنگال کے دوسرے علاقوں میں وہ عوامی طبقاتی کشمکش بھی بہت غیر واضح شکل میں شروع ہو چکی تھی جو کبھی وہابی تحریک کی صورت میں، کبھی فرائضی تحریک کی شکل میں اور کبھی ڈاکوؤں، سنیاسیوں اور ٹھگوں کی شکل میں رونما ہوتی تھی -

کلکتے کا سفر کیا حقیقتاً غالب کی زندگی اور فن میں اس قدر عہد آفرین رہا ہے؟ کیا واقعی ان کے کلام میں طرفگی اور خیالات میں بانکپن کلکتے کی سرمایہ دارانہ تہذیب کے زیر اثر ہی آیا ہے؟ یہ سوالات اس وقت تک پوری طرح حل نہیں ہو سکتے جب تک غزلیات کی صحیح تاریخ تصنیف اور غالب کی فکر کے مختلف ادوار کا صحیح تعین نہ کیا جائے - آل احمد سرور نے ''صحت مند تشکیک،، کو غالب کا سرمایہ قرار دیا - یقیناً غالب صوفی نہ تھے وہ فلسفی بھی نہ تھے لیکن ان کے پاس ایک ایسے ہوش مند کا دل و دماغ ضرور تھا جو پرانے تصورات سے نہیں بہلتا اور روایات کے آئینہ خانے میں گم ہو جانے کے لئے بھی تیار نہیں ہوتا - یہ صحت مند تشکیک پسند ذہن نشاط و عیش میں بھی زندگی کی سنگین حقیقتوں کا عکس دیکھ لیتا ہے اور اداسی، ناکامی اور نامرادی کے طوفان میں بھی تشکیک کے بل بوتے پر کبھی بے دلی اور کبھی رندی و قلندری اور کبھی فلسفیانہ سپردگی کی مدد سے زندگی بسر کرنے کا سلیقہ سیکھ لیتا ہے -

یہ چند اشعار شاید غالب کی ان مختلف پناہ گاھوں کی طرف اشارہ کرسکیں گے:

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش ازیک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

ہرزہ ہے نغمۂ زیرو بم ہستی و عدم
لغو ہے آئینۂ فرق جنوں و تمکیں

سراپا رہن عشق و ناگزیر فرصت ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

اور پھر وہ معر کے کے شعر :

دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا واماندگیٔ شوق تراشے ہے پنا ہیں

لیکن آل احمد سرور بھی اس صحت مند تشکیک اور اس ذہنی رجحان کے اجزائے ترکیبی تک جانے کی کوشش نہیں کرتے - یہ وہ سوال جن کے

جوابات عصری تنقید نے ہنوز نہیں دئے ہیں ان کے یہاں بھی تشنہ ہی رہ جاتے ہیں ۔

بہر حال غالب کی فکر کے نقش و نگار گلستان درگلستان تنقید کی نظروں کے سامنے جلوہ فروش ہوتے آئے ہیں ۔ شیفتہ اور حالی سے لے کر آج تک گو اس کے اسرار و رموز، اس کے دل نواز گوشے اور دل کش پہلو بے نقاب ہوتے رہتے ہیں پھر بھی غالب کی فکر کا مکمل تصور ہنوز اپنے کو لمبس کے انتظار میں ہے اور یہ عظیم دریافت اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک علوم متعلقہ کی مدد سے غالب کے عہد اور ان کے فن کے ارتقاء کا ایک مربوط خاکہ تیار نہ ہو جائے ۔

غالب نے کہا تھا ۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

پھر دوسری جگہ پیشین گوئی کی تھی :

تا ز دیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن
این مے از قحط خریداری کہن خواہد شدن
کوکبم را در عدم اوج قبولے بودہ است
شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

یہ دونوں دعوے قدیم اور جدید دونوں زمانوں میں پورے ہوئے ہیں ۔ غالب کے نقاد کب گنجینۂ معنی کے اس طلسم کی طلسم کشائی پر قادر ہو سکیں گے اور کبھی غالب کے ''شہرت شعر،، کی مکمل توجیہہ ممکن ہوگی بھی یا نہیں یقین سے نہیں کہا جا سکتا ۔ البتہ کسی شاعر کے لئے یہ شرف معمولی نہیں ہے کہ اس نے عمرانی اور سیاسی انقلابات سے بے پروا ہو کر اپنی آواز سے کئی نسلوں کو متاثر کیا ہے اور اس درجہ متاثر کیا ہے کہ آج بھی وہ نوجوان کے لئے نشاط و الم، تنہائی اور سرمستی کی ہر منزل میں غالب مونس ہمراز اور جلیس کا مرتبہ رکھتے ہیں ۔ سچ مچ ان کے منہ پر یہ دعوی پھبتا ہے ۔

دبیرم شاعرم رندم ندیم شیوہ ھا دارم

اور ان کے تقریباً ہر نقاد نے کسی نہ کسی حیثیت سے اس کا اعتراف کیا ھے کہ

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ھے میرا
غالب کو برا کیوں کہو اچھا میرے آگے

احوالِ غالب کی گُم شدہ کڑیاں

خاندان دہلی سے آگرہ کیوں کر پہنچا

مرزا غالب کے احوال و سوانح اور شعرو ادب پر اتنی کتابیں ترتیب پا چکی ہیں کہ اگر انہیں یک جا رکھا جائے تو ایک چھوٹا سا کتب خانہ بن جائے ۔ شعرا کو تو چھوڑ دیجئے ۔ اس سر زمین کے شاید ہی کسی ممتاز و مشہور فرد کو تحریر و نگارش اور تحقیق و کاوش میں اعتناو توجہ کا وہ مقام حاصل ہوا ہو جو مرزا غالب کے حصے میں آیا ۔ شاید اقبال اس باب میں مرزا سے ہمسری کا دم بھر سکتا ہے ۔ تاہم مرزا کی زندگی کے بعض گوشے ایسے بھی ہیں جو اب تک پوری طرح روشنی میں نہیں آ سکے ۔ ان میں سے ایک گوشہ یہ بھی ہے کہ مرزا کا خاندان دہلی سے آگرہ کیوں کر پہنچا ۔

مسئلے کی حیثیت

نظر بظاہر یہ مسئلہ چنداں اہمیت نہیں رکھتا ۔ ہم سمجھتے ہیں کہ مرزا کے جدامجد والد ماجد اور عم محترم طالع آزما سپاہی تھے ۔ جب وہ سمر قند سے لاہور ہوتے ہوئے دہلی پہنچ گئے تو وہاں سے آگے چلے جانا ہرگز مشکل نہ تھا ۔ لیکن اگر ہم دوسرے گوشوں میں چھان بین اور کرید کو ایک اہم علمی کام سمجھتے ہیں تو اس معاملے پر کیوں غور و فکر نہ کریں جس کے صحیح حل پر ایک سے زیادہ پیچید گیوں کا سلجھاؤ موقوف ہے ۔ ممکن ہے اس طرح مرزا کے سوانح کی بعض اور کڑیوں کا سراغ مل جائے جو ہماری معلومات میں خاصے قابل قدر اضافے کا باعث بن جائے ۔

دادا کی ملازمت

معلوم ھے کہ شاہ عالم ثانی کی سرکار میں مرزا کے دادا کی ملازمت کا وسیلہ ذوا الفقار الدولہ نجف خاں تھا ۔ خواجہ حالی مرحوم نے ''یاد گار،، میں لکھا ھے ۔

''ذوا الفقار الدولہ مرزا نجف خاں شاہ عالم کے دربار میں دخل کلی رکھتے تھے ۔ نجف خاں نے مرزا کے دادا کو سلطنت کی حیثیت کے موافق ایک عمدہ منصب دلوا دیا اور پہاسو کا سیر حاصل پرگنہ ذات اور رسالے کی تنخواہ میں مقرر کرا دیا۔،،

میرزا کے دادا قوقان بیگ خاں کے متعلق تمام سوانح نگاروں کا بیان یہی ھے بلکہ یہ تصریح بھی موجود ھے کہ میرزا قوقان بیگ خاں پچاس گھوڑے اور نقارہ و نشان سے ملازم ہوئے تھے ۔

نقل مکان اور متعلقہ سوالات

اب پہلا سوال یہ ھے کہ جب وہ شاہ عالم کی سرکار میں ملازم تھے اور پہاسو کا تعلقہ ان کی ذات اور رسالے کی تنخواہ کے لئے مقرر تھا جو ضلع بلند شہر میں واقع ھے تو وہ دھلی سے آگرہ کیوں منتقل ہوئے ؟ دوسرا سوال یہ ھے کہ اگر وہ دھلی سے آگرہ منتقل نہ ہوئے تو انہوں نے اپنے بڑے بیٹے میرزا عبداللہ بیگ خاں کی شادی آگرہ میں کیوں کی ۔ میرزا کے نانا خواجہ غلام حسین خاں کمیدان آگرہ کے ممتاز رؤسا میں سے تھے اور بہ ظاھر میرزا قوقان بیگ کی حیثیت زیادہ بلند نہ تھی ۔ خواجہ غلام حسین خاں کیوں کر اپنی بیٹی کی شادی دھلی کے غیر معروف اور اجنبی رسالدار کے بیٹے سے کر دینے پر راضی ھو سکتے تھے ۔ جس کے ساتھ بعد مکانی کے باعث تعارف کی بھی کوئی شکل نہ تھی ۔ میرے محدود علم کے مطابق کسی بھی سوانح نگار نے ان امور پر توجہ نہیں کی بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ کسی کی طبیعت ان سوالات پر اٹکی ھی نہیں اور اٹکے بغیر تحقیق و کاوش کا احساس کیوں کر پیدا ھو سکتا تھا ؟

''انتخاب یادگار،، کا بیان

امیر مینائی مرحوم نے ''انتخاب یادگار،، میں فرمایا ہے ۔ ''جداعلا ان کے (میرزا غالب کے) ماورالنہر سے ہندوستان میں آئے اور نواب نجف خاں کے عہد میں منصب دار شاہی رہے ۔ جب ریاست مغلیہ برہم ہو گئی ملازم مہاراجہ جے پور ہوئے اور بودوباش شہر آگرہ میں اختیار کی ۔،،

اس سے واضح ہوتا ہے کہ ذوالفقارالدولہ نجف خاں کی وفات کے بعد نہ شاہی ملازمت باقی رہی نہ پہاسو کا پرگنہ قبضہ میں رہ سکتا تھا لہذا جے پور میں ملازمت کی ضرورت پیش آئی اور اس سلسلے میں دھلی کو چھوڑ کر آگرہ میں قیام اختیار کیا جو جے پور سے قریب تھا ۔ گویا دھلی سے نقل مکان میرزا کے دادا نے کیا تھا ۔

یہ بیان ''انتخاب یادگار،، کے سوا کہیں نہیں ملتا ۔ خود میرزا نے بھی اپنی تحریرات میں کہیں اس کی طرف اشارہ نہیں کیا ۔ حالانکہ وہ ذاتی اور خاندانی حالات کے جزیات حسب ضرورت بیان کرتے رہے ۔ میرا خیال ہے کہ امیر مینائی مرحوم نے خود میرزا سے یہ واقعہ سنا ہوگا ۔ اغلب اِس بارے میں سوال کیا ہو تو میرزا کو تفصیل بتانے کی ضرورت پیش آئی ہو ۔

ذوالفقارالدولہ نجف خاں

اب ہمیں اس امر پر غور کرنا چاہئے کہ کب ملازمت شاہی کے ترک کرنے کی ضرورت پیش آئی ۔ ہمارے سامنے کوئی مستند بیان نہیں لیکن ذوالفقار الدولہ نجف خاں کی وفات کے بعد جو حالات پیش آئے انہیں سامنے رکھکر زیادہ سے زیادہ قرین قیاس نقشہ تیار کر سکتے ھیں ۔ اگر اس کی روشنی میں تحقیق کی جائے تو اغلب ہے زیادہ مستند و موثق شہادتیں میسر آسکیں ۔

ذوالفقار الدولہ نجف خاں نے ۲۶ اپریل ۱۷۸۲ء کو وفات پائی

وہ سلطنت مغلیہ کے دور زوال میں ایک غیر معمولی شخصیت کا مالک تھا ۔ شجاعت و مردانگی میں فرد، نظم و نسق میں یگانہ، ھجوم مصائب میں الوالعزم، فتح وکامرانی میں شفیق و رحمدل، سیرت پاکیزہ، کردار اجلا اور سلطنت کی شان قدیم کو ازسر نو بحال کرنے میں سرگرم ۔ مرزا غالب کی شاعری کی طرح ذوالفقارالدولہ نجف خاں کی ملک داری و سپہ گری بھی اکبر، جہانگیر اور شاھجہان کی بادشاھی کے لئے زیبا تھی ۔

وارثوں میں کشمکش

اس کے نرینہ اولاد نہ تھی ۔ دو شخص اس کی جائداد اور مناصب کے وارث سمجھے جاتے تھے ۔ ایک اس کا بھتیجا مرزا شفیق دوسرا افراسیاب خاں جسے نجف خاں کی ھمشیر نے بیٹا بنا لیا تھا اور ایک روایت کے مطابق نجف خاں بھی اس کو بیٹا سمجھتا تھا ۔

مرزا شفیق کے پاس فوج بھی زیادہ تھی اور امیری کا سازو سامان بھی باافراط موجود تھا ۔ اگر ان دونوں میں مفاھمت ھو جاتی تو نجف خاں کے درست کردہ نظام میں کوئی خرابی پیدا نہ ھوتی لیکن نجف خاں کی ھمشیر نے اتحاد و اتفاق کی مصلحت سے بالکل بے پروا ھو کر اپنے متبنی کو آگے بڑھانے پر کمر باندھ لی ۔ سوءِ اتفاق سے مرزا شفیق اس وقت دھلی میں موجود نہ تھا ۔ چنانچہ افراسیاب خاں کو امیرالامرائی کا منصب دے دیا ۔ اس طرح کشمکش کا آغاز ھو گیا ۔

دربار کی حالت عجیب تھی ۔ بڑے امرا میں سے کوئی شخص کسی مہم پر دھلی سے باھر جاتا تو اس کی غیر حاضری میں نئے جوڑ توڑ شروع ھو جاتے ۔ وہ ابھی کوئی کام نہ کرنے پاتا کہ اپنے بچاؤ کے لئے اسے دھلی کا رخ کرنا پڑتا ۔ ایک ایسے ھی موقع پر مرزا شفیق ستمبر ۱۷۸۳ء میں مارا گیا ۔ مشہور ہے کہ اس پر گولی چلانے کا ذمہ‌دار یا تو محمد بیگ خاں ھمدانی تھا یا اس کا بھتیجا اسماعیل بیگ خاں ۔ لیکن اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ قتل افراسیاب خاں کے ایما و اشارے سے ھوا ۔ چنانچہ وہ بے خلش امیرالامرا بن گیا ۔

اب افراسیاب خاں اور محمد بیگ ہمدانی میں اختلافات شروع ہو گئے ۔ ہمدانی نے بطور خود قلعہ آگرہ پر قبضہ کر لیا ۔ افراسیاب خاں فوج لے کر آگرہ پہنچ گیا اور مادھوجی سندھیا والیٔ گوالیار کو بھی اپنی مدد کے لئے بلا لیا ۔ یہ اکتوبر ۱۷۸۴ء کا واقعہ ہے ۔ ابھی ہمدانی کے خلاف کوئی کاروائی شروع نہ ہوئی تھی کہ میرزا شفیق کا بھائی میرزا زین العابدین ایک روز سندھیا کی لشکر گاہ سے افراسیاب کے خیمے میں پہنچا اور اسے خنجر مار کر ہلاک کر ڈالا ۔ کہنے کو یہ بھائی کے خون کا انتقام تھا ۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ اس باب میں انگیخت کا ذمہ دار سندھیا تھا اور افراسیاب خاں کے قتل کے بعد خود سندھیا کے لئے دربار میں مختاری کا درجہ حاصل کر لینے کا اچھا موقع پیدا ہو گیا تھا ۔

سندھیا کی مختاری

چنانچہ سندھیا آگرے کا محاصرہ چھوڑ کر دھلی پہنچا اور اس نے شاہ عالم ثانی سے دو فرمان حاصل کئے ایک فرمان کے مطابق پیشوا کو نائب السلطنت بنایا گیا تھا اور دوسرے فرمان کے مطابق سندھیا کو پیشوا کے نائب کی حیثیت میں فوج اور نظم و نسق کا مختار قرار دیا گیا تھا ۔ پہلے فرمان کی غرض محض یہ تھی کہ سندھیا کے خلاف دوسرے مرہٹہ سرداروں یا خود پیشوا کے لئے اعتراض کی گنجائش نہ رہے ۔ حقیقتاً اس کی کوئی حیثیت نہ تھی ۔

افراسیاب خاں کے اہل و عیال علی گڑھ کے قلعے میں رہتے تھے ۔ او نجف خاں کے عہد کی ساری دولت بھی اسی قلعے میں محفوظ تھی ۔ سندھیا نے مختاری کا درجہ حاصل کرتے ہی علی گڑھ پر بھی قبضہ کر لیا اور تمام مال و اسباب بھی لے لیا ۔

سندھیا کی اصلاحات ۔

اب سندھیا کو ضرورت پیش آئی کہ فوج نئے اصول پر مرتب کرے اور پرانا جاگیر دارانہ نظام توڑ دے ۔ اس طرح ان تمام امیروں اور

سالاروں کی جاگیریں یکے بعد دیگرے واپس ہونے لگیں جنہیں فوجی خدمات کے صلے میں یہ دی گئی تھیں - یہ لوگ مسلمان اور زیادہ تر مغل تھے - ممکن ہے سندھیا کے پیش نظر یہ مصلحت بھی ہو کہ جب تک کہ ان فوجیوں کو بے دست و پا نہ کیا جائے گا یا ان کے جیش توڑے نہ جائیں گے یہ مختاری کا سلسلہ بے خلش جا ری نہ رہ سکے گا - یہ اندیشہ بھی ہوگا کہ ممکن ہے بعض رسالدار کسی موقع پر افراسیاب خاں کی اولاد میں سے کسی کے طرفدار بن جائیں یا کسی اور امیر و رئیس کے زیر علم ہو جائیں اور اس طرح سندھیا کی مختاری پر ضرب لگے - اس انتظام نے ہندو و مسلم کا سوال بھی پیدا کر دیا تھا - مسلمان مغلوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ سلطنت ان کی ہے لیکن ایک مرہٹے کی مختاری نے انہیں ہر شے سے بے دخل کر دیا ہے - غلام قادر خاں روہیلے نے ابتدا میں کامیابی حاصل کی تھی اس کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ وہ مسلمان امیروں اور رسالداروں کی حمایت و ہمدردی کا مدعی بن گیا تھا -

لال سوت کی لڑائی

سندھیا کی مصلحت یہ تھی کہ وہ دکن کے ساتھ اپنا سلسلہ، ربط و ضبط قائم رکھتا جہاں مرہٹوں کا مرکز تھا - اس ضمن میں اسے راجپوتانے کے مشہور قلعے رگھو گڑھ کی تسخیر ضروری معلوم ہوئی - چنانچہ اس نے محمد بیگ ہمدانی کو رگھو گڑھ بھیج دیا - ہمدانی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا - راجپوتانے کے بڑے بڑے راجاؤں مثلاً جے پور، 'جودھ پور، میواڑ وغیرہ نے ایکا کرکے ایک لاکھ فوج تیار کر لی اور سندھیا کے مقابلے پر آمادہ ہو گئے - سندھیا کو بھی فوج لے کر نکلنا پڑا - لال سوت کے مقام پر مئی ۱۷۸۷ء میں خون ریز لڑائی ہوئی - یہ مقام جے پور سے تینتالیس میل مشرق میں واقع ہے - محمد بیگ ہمدانی کے بھتیجے اسماعیل بیگ نے تین سو سواروں کے ساتھ راجپوتوں پر حملہ کیا اور ان کے چھکے چھڑا دئے لیکن مرہٹوں نے اس کی اعانت نہ کی اور حملہ بے نتیجہ رہا - فریقین کی طرف سے گولہ باری ہوتی رہتی

تھی ۔ دوسرے یا تیسرے دن سخت آندھی چلی اس میں ایک گولہ محمد بیگ ہمدانی کے لگا اور وہ ہاتھی سے نیچے گر گیا ۔ افراتفری میں ہاتھی کا پاؤں محمد بیگ کی کنپٹی پر پڑا اور وہ جان بحق ہو گیا ۔ اسماعیل بیگ نے اسی موقع پر پکار کر کہا کہ اب چچا کی جگہ میں فوج کا سپہ سالار ہوں ۔

مغلوں کی بغاوت

عین اسی حالت میں چودہ ہزار مغلوں نے سندھیا کے خیمے کو گھیر لیا اور تنخواہ کا مطالبہ پیش کر دیا ۔ میرا خیال ہے کہ ان میں بہت سے وہ لوگ بھی شامل تھے جن سے جاگیریں واپس لے لی گئی تھیں ۔ ان مغلوں نے ساتھ ہی مہاراجہ جے پور کے پاس پیغام بھیج دیا کہ اگر دو لاکھ روپیے فوراً ادا کر دو تو ہم سندھیا کو چھوڑ کر تمہارے ساتھ ہو جائیں گے ۔ مہاراجہ جے پور نے بے تامل روپیہ دے دیا یا دینے کا وعدہ کر لیا ۔ سندھیا نے یہ حالت دیکھی تو میدان چھوڑ کوگوالیار چلا گیا اور عارضی طور پر اس کی مختاری بھی ختم ہو گئی ۔ یہی حالات تھے جن سے فائدہ اٹھا کر غلام قادر خاں روھیلے اور اسماعیل بیگ ہمدانی نے دھلی پر یورش کی اور شاہ عالم ثانی کو نور بینائی سے محروم کیا گیا ۔ یہ واقعات پیش نظر موضوع سے خارج ہیں ۔

لال سوت کے میدان میں چودہ ہزار مغلوں کی بغاوت ۳۱ مئی یا یکم جون ۱۷۸۷ء کا واقعہ ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسی موقع پر میرزا قوقان بیگ خاں نے جے پور کی ملازمت اختیار کی اور سکونت کے لئے دھلی کے بجائے آگرہ کو منتخب کیا ۔ آگرہ ھی کے قیام میں خواجہ غلام حسین خاں سے تعارف کا موقع بہم پہنچا اور میرزا عبداللہ بیگ خاں کی شادی خواجہ کی صاحبزادی عزت النسا بیگم سے ہوئی ۔ میرے اندازے کے مطابق یہ ۱۷۹۰ء کے بعد کا واقعہ ہے ۔

مجھے اس اعتراف میں تامل نہ ہونا چاہئے کہ یہ نقشہ قیاس پر مبنی ہے - تا ہم ہندوستان کے ارباب علم و نظر مزید تحقیق و کاوش کی زحمت اٹھائیں تو کیا عجب ہے زیادہ محکم معلومات حاصل ہو جائیں مثلاً آگرہ کے قدیم خاندانوں سے کچھ نہ کچھ سراغ مل جانے کا امکان ہے - یہ بھی ممکن ہے کہ دربار جے پور کے پرانے کاغذات سے میرزا قوقان بیگ کی ملازمت اور اس کی نوعیت و حیثیت کے متعلق پتہ چل جائے - اس طرح میرزا غالب کے سوانح حیات کی ایک گم شدہ کڑی هاتھ آ جائے گی اور هم زیادہ وثوق و اعتماد سے سوانح کے اس حصے کو مکمل کر سکیں گے -

اس طرح بعض دوسرے پہلوؤں کے متعلق میرے سامنے چند غور طلب امور ھیں - جنھیں بہ شرط حیات پیش کرتا رھوں گا - انشا ٔ اللہ تعالی -

غالب کا ایک شعر

بقدر شوق نہیں ظرف تنگ نائے غزل
کچھ اور چاہئیے وسعت میرے بیاں کے لئے

ادھر جب سے ہمارے بعض شاعروں اور نقادوں نے غزل کے خلاف جہاد شروع کیا ہے یہ شعر عام طور پر اس بات کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے کہ اور تو اور غالب بھی غزل کی محدود صلاحیتوں کے شاکی تھے اور کاش کہ انھیں اپنے خیالات کے اظہار کے لئے اس سے زیادہ امکانات کی کوئی صنف شعر مل سکتی ۔ اور ان معترضوں کے خیال میں یہ نظم ہی ہو سکتی ہے ۔

یہ استدلال غلط ہے ۔ نہ غالب کا یہاں یہ مطلب ہے اور نہ وہ غزل ہی کے خلاف تھے ۔

سب سے پہلے ہمیں اس شعر کا شان نزول دیکھنا چاہئیے ۔ یہ شعر متداول دیوان کی آخری غزل میں ہے جس کا مطلع ہے

نوید امن ہے بیداد دوست جاں کے لئے
رہی نہ طرز ستم کوئی آسماں کے لئے

مولانا حالی فرماتے ہیں :—

''اس غزل کے آخیر میں چند شعر نواب فرخ آباد کی مدح میں لکھے ہیں ۔ انھوں نے مرزا کو نہایت اشتیاق کے ساتھ فرخ آباد بلایا تھا مگر غالباً مرزا کا وہاں جانا نہیں ہوا ۔''

(یاد گار غالب ص ۱۴۹)

اس میں کا یہ بیت الغزل بہت مشہور ہے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

اس کے بعد زیر بحث شعر ہے اور آخر میں نواب تجمل حسین خاں والیٔ فرخ آباد کی مدح میں یہ قطعہ ہے :

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے
زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میری نطق نے بوسے مری زباں کے لئے
نصیر دولت و دیں اور معین ملت و ملک
بنا ہے چرخ بریں جس کے آستاں کے لئے
زمانہ عہد میں اس کے ہے محوآرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسمان کے لئے
ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہئیے اس بحر بیکراں کے لئے

اور مقطع ہے :

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

میرزا دراصل غزل لکھنے بیٹھے تھے ۔ ان کا ارادہ کوئی قصیدہ لکھنے کا نہیں تھا لیکن بقول حالی فرخ آباد کی دعوت بھی موصول ہو چکی تھی ۔ گویا نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن ۔ فرخ آباد جا نہیں سکتے ۔ قصیدہ کے لئے طبیعت حاضر نہیں ۔ لیکن فتوح کا جو خفیف سا امکان پیدا ہو گیا ہے اس سے کیوں نہ فائدہ اٹھایا جائے اور یہ موقع کیوں ہاتھ سے گنوایا جائے ۔ اس لئے انھوں نے سوچا کہ لاؤ لگے ہاتھوں ان سے بھی نپٹ لو ۔ لیکن اب یہ مشکل پیش آئی کہ غزل میں مدح کی

گنجائش کہاں۔ بے شک لوگ قصیدے میں غزل لکھتے آئے تھے مگر غزل میں قصیدہ ۔ کسی قاعدے قانون یا دستور سے یہ بدعت جائز نہیں سمجھی جا سکتی تھی ۔ لیکن انھوں نے اس سے پہلے کون سے قاعدوں اور قانونوں کی پروا کی تھی کہ اب انہیں اس کے توڑنے میں کوئی باک ہوتا ۔ چنانچہ گریز کا شعر لکھا

بقدر شوق نہیں ظرف تنگ نائے غزل
کچھ اور چاهئیے وسعت مرے بیاں کے لئے

یہ ''شوق،، نواب تجمل حسین خاں کی مدح کا تھا جو ''تنگ نائے غزل،، میں سما نہیں سکتی اور جس کے لئے ''کچھ اور وسعت،، کی صنف شعر یعنی قصیدہ ھی موزوں اور مناسب ھے ۔ ممکن ھے اسے نواب فرخ آباد کو یہ بتانا بھی مقصود ہو کہ یہ خیال نہ فرمائیے گا کہ مرا شوق مدح بس اتنے ھی پر قانع ھو گیا ھے ۔ یہ تو پہلی قسط ھے ۔ اگر یہ کامیاب رہی تو پھر قصیدہ بھی لکھوں گا ۔ اس کے بعد مدحیہ اشعار کا مندرجہ صدر قطعہ لکھا ۔ ظاهر ھے کہ یہ غزل تھی قصیدہ تو تھا ھی نہیں اس لئے جلد ھی اسے ختم کرکے لکھنا پڑا

ورق تمام ھوا اور مدح باقی ھے
سفینہ چاهئیے اس بحر بیکراں کے لئے

اور اپنی اس ''ادائے خاص،، یعنی غزل میں قصیدہ گوئی کی بدعت پر فخر کرکے کہا !

صلائے عام ھے یاران نکتہ داں کے لئے

غرض کہ اس شعر میں انھوں نے ،،تنگ نائے غزل'' کی شکایت اس لئے کی ھے کہ اس میں مدح پورے طور پر لکھی نہیں جا سکتی ۔ اگر وہ صنف غزل کے خلاف تھے تو ساری عمر کیوں غزلیں لکھتے اور ان پر فخر کرتے رہے۔

یہ تجمل حسین خاں کون تھے ؟

فرخ آباد کی ریاست کا بانی نواب محمد خاں بنگش ہوا ہے ۔ محمد خان کا باپ ملک عین خاں اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں افغانستان سے ہندوستان آیا اور مئورشید آباد میں مقیم اور ملازم ہوا ۔ محمد خاں بھی اوائل میں مئورشید آباد ہی کے رئیس محمد یاسین خاں کے سواروں میں ملازم رہا ۔ یہ اس کے عروج کی پہلی سیڑھی تھی ۔ وہ طوائف الملوکی کا زمانہ تھا ۔ ان دنوں حوصلہ مند اور بہادر آدمی کے لئے ترقی کے بہت مواقع تھے ۔ محمد خاں اپنے ساتھ کے سواروں میں بہت ہر دلعزیز تھا ۔ انھوں نے بے دریغ اپنی قسمت اس سے وابستہ کر دی ۔ محمد خاں نے سب سے پہلے ریاست دتیا کے راجہ کی وفات پر متنازع فریقین میں سے ایک کا ساتھ دے کر دوسرے کو شکست دی اور اس طرح کامیاب فریق سے انعام و اکرام میں خاصی بڑی رقم حاصل کی ۔ اور اس رقم سے اس نے اپنے جتھے کو اور وسیع اور مضبوط کر لیا ۔ اس کے بعد جب فرخ سیر، جہاندار شاہ سے اپنے باپ عظیم الشان کی موت کا بدلہ لینے کو دھلی آیا تو سادات بارھہ (سید عبداللہ خاں اور سید حسین علی خاں) اس کے ساتھ مل گئے ۔ ان دونوں بھائیوں نے محمد خاں کو اپنی مدد کے لئے بلایا ۔ یہ بارہ ہزار کی جمعیت لے کر حاضر ہو گئے ۔ جہاندار شاہ کو شکست ہوئی اور فرخ سیر تخت دھلی کا مالک ہو گیا (۱۷۱۳ء) ۔ اس نے محمد خاں کو چہار ہزاری منصب اور وسیع جاگیر عطا کی ۔ بعد میں جب فرخ سیر کے جا نشین محمد شاہ نے ان دونوں "بادشاہ گروں" کا زور توڑنے کا فیصلہ کیا تو انھوں (سید برادران) نے پھر محمد خاں کو بادشاہ دھلی کے خلاف لڑنے کے لئے طلب کیا ۔ اب محمد خاں نے انکار کر دیا کیوں کہ اس پر شاہی خاندان کے اتنے احسانات تھے کہ بادشاہ وقت سے لڑنا یا باغیوں کی امداد کرنا نمک حرامی کے مترادف تھا ۔ اس لئے اس نے نہ صرف سیدوں کی امداد سے انکار کر دیا بلکہ وہ پندرہ ہزار کی جمعیت لے کر محمد شاہ کی طرف سے لڑا ۔ جب سید بھائیوں کا

قلع قمع ہو گیا تو بادشاہ نے اس کے منصب میں اضافہ کرکے اسے ہفت ہزاری کر دیا اور خطاب غضنفر جنگ عطا کیا ۔ پھر یکے بعد دیگرے اسے اجمیر اور مالوہ اور الہ آباد کی صوبہ داری مرحمت فرمائی ۔ فرخ آباد شہر بھی محمد خاں ہی نے بادشاہ فرخ سیر کے نام پر بسایا تھا ۔ اس کے علاوہ اس نے دو اور شہر بھی بسائے ۔ محمد آباد اپنے نام پر اور قائم گنج اپنے بڑے بیٹے قائم خاں کے نام پر ۔

محمد خاں نے اسی برس کی عمر میں پنج شنبہ ۔ ۸ دسمبر ۱۷۴۳ء (۲ ذیعقدہ ۱۱۵۶ ھ) کو انتقال کیا اور اپنے پیچھے ۲۲ بیٹے چھوڑے۔ ان میں سب سے بڑا قائم خاں باپ کا جانشین اور قائم جنگ کے خطاب سے مشہور ہوا وہ رام پور کے نواب سید اللہ خاں اور حافظ رحمت خاں سے لڑتا ہوا ۲۲ نومبر ۱۷۴۸ء (۱۰۔ ذی الحجہ ۱۱۶۱ ھ) کو میدان جنگ میں کام آیا اور اس کے بعد اس کا چھوٹا بھائی امام خاں مسند نشین ہوا ۔ لیکن احمد شاہ بادشاہ دھلی اور وزیر ممالک صفدر جنگ نے اس پر صاد نہ کیا اور رد و قدح کے بعد اس کا دوسرا بھائی احمد خاں غالب جنگ رئیس مقرر ہوا ۔ ریاست فرخ آباد کا استحکام اور باقاعدہ نظم و نسق غالب جنگ ہی کی مساعی اور دور اندیشی کا نتیجہ ہے ۔ اس کی وفات ۱۱ جولائی ۱۷۷۱ء (۲۸ ربیع الاول ۱۱۸۵ ھ) کو ہوئی اور اس کے بعد اس کا چودہ سالہ بیٹا دلیر ہمت خاں مظفر جنگ گدی پر بیٹھا ۔

اس کی موت اپنے بڑے بیٹے رستم علی خاں کے ہاتھوں زہر خورانی سے ۲۲ اکتوبر ۱۷۹۶ء (۸۔ ربیع الثانی ۱۲۱۱ ھ) کو ہوئی ۔ نواب آصف الدولہ شاہ اودھ نے اس جرم کی پاداش میں رستم علی خاں کو قید کر دیا اور اس کا چھوٹا بھائی امداد حسین خاں ناصر جنگ تارک ریاست قرار پایا ۔ ناصر جنگ نے لارڈ ولزلی گورنر جنرل کے عہد میں ۴ جون ۱۸۰۲ء کو انگریزوں سے معاہدہ کر لیا ۔ اس کی رو سے فرخ آباد کا سارا علاقہ سرکار انگریزی کی تحویل میں آ گیا اس کی عوض میں نواب ناصر جنگ کے لئے نو ہزار روپیہ ماہانہ وظیفہ نسلاً بعد نسل منظور کیا گیا ۔ اس کے علاوہ خاندان کے بعض دوسرے افراد کے سابقہ وظیفے

اور جائداد بھی انھیں کے تصرف میں رہنا منظور ہوئی - نواب ناصر جنگ شاعر بھی تھے - اردو کلام موجود ہے -

(تزکرہ شعرائے فرخ آباد مندرج اردو ادب جلد ۴ نمبر ۱ص ۵۵-۵۶)

ناصر جنگ کی وفات (۳۱ جنوری ۱۸۱۳ء - محرم ۱۲۲۸ ھ) کے بعد اس کا بڑا بیٹا خادم حسین خاں شوکت جنگ مسند نشین ہوا - یہ بھی شاعر تھے - اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے اور شوکت تخلص کرتے تھے (ایضاً ص ۵۹) جب شوکت جنگ کا بھی چیچک کے عارضے سے ۹ جولائی ۱۸۲۳ء (۲۹ شوال ۱۲۳۸ ھ) کو دھلی میں انتقال ہو گیا تو ان کا صغر سن بیٹا تجمل حسین خاں گدی کا وارث قرار پایا - یہی غالب کے ممدوح ہیں -

مسند نشینی کے وقت نواب تجمل حسین خاں کی عمر دو برس سے بھی کم تھی - ان کی والدہ کا نام ممتاز محل تھا - اروین نے تاریخ فرخ آباد میں ان کی ولادت کی تاریخ ۳۱- جنوری ۱۸۲۳ء (یکم جمادی الاخر ۱۲۳۸ھ) درج کی ہے - چونکہ مفتی صاحب موصوف اس وقت موجود تھے اور انھوں نے ان کا تاریخی نام ''سعادت آثار،، بھی لکھا ہے جس سے (۱۲۳۷ھ) برآمد ہوتے ھیں - اس لئے تسلیم کرنا پڑے گا کہ اروین کو غلط اطلاع ملی اور صحیح تاریخ وھی ہے جو مفتی ولی اللہ کی کتاب میں مندرج ہے یعنی یکم جمادی الاخر ۱۲۳۷ھ مطابق ۲۴ جنوری ۱۸۲۲ء اس سے معلوم ہوا کہ مسند نشینی (۲۳ جولائی ۱۸۲۳ء) کے وقت ان کی عمر اٹھارہ ماہ کی تھی - ان کی نابالغی کے زمانے میں ریاست کوٹ آف وارڈس میں رہی - پہلے ممتاز العلماء قاضی سعید الدین خاں سربراہ رہے- تین برس بعد مفتی ابوالحسن خاں ان کی جگہ مقرر ہوئے - سب سے آخیر نواب احمد یار خاں کا تعین ہوا تھا جن سے انھوں نے بالغ ہونے پر ریاست کی باگ ڈور اپنے ھاتھ میں لے لی -

نواب تجمل حسین خاں کا خطاب نصیر الدولہ معین الملک ظفر

جنگ تھا ۔ اس کی طرف غالب کے مدحیہ قطعہ کے اس شعر میں تلمیح ہے ۔

نصیر دولت و دیں اور معین ملت و ملک
بنا ہے چرخ بریں جس کے آستاں کے لئے

موسیقی میں بھی اچھا دخل تھا ۔ شعر بھی کہتے تھے ۔ ظفر تخلص تھا ۔ منیر شکوہ آبادی ان کی سرکار سے بھی چندے وابستہ رہے تھے ۔ ان کے علاوہ اپنے چچیرے بھائی نواب سخاوت حسین خاں (ابن نواب عنایت خاں ابن نواب خادم حسین خاں) سے بھی مشورہ کیا ۔ خم خانۂ جاوید (۴۷۸-۴۷۷) میں ان کے یہ دو شعر درج ھیں :

اشک سے تر میرا گریباں ہے
سلک گوھر مرا گریباں ہے۔

اچھا نہیں ہے دامن محشر کا پھیلنا
چھوڑو نہ پائنچے دم رفتار ھاتھ سے

مولوی عبدالحی صفا بدایونی نے تذکرہ شمیم سخن (ص ۱۶۲) میں دوسرے شعر کا پہلا مصرع یوں لکھا ہے ۔ع

اچھا نہیں دامن محشر کا چھوڑنا

ان کا انتقال عین جوانی میں ۸ نومبر ۱۸۴۶ء (۱۸ ذیعقدہ ۱۲۶۲ ھ) کو ھوا ۔ ۲۵ برس سے کم کی عمر پائی (اروین نے سنہ وفات ۱۸۴۸ء بھی غلط لکھا ہے)

(یہاں ضمناً ایک اور بات کا ذکر بھی دل چسپی سے خالی نہ ھوگا ۔ جس غزل میں یہ مدحیہ قطعہ ہے یہ دیوان غالب کی طبع اول ۱۸۴۱ء میں شامل نہیں اور طبع ثانی ۱۸۴۷ء میں ہے ۔ نواب صاحب کا انتقال ۱۸۴۶ء میں ھوا ظاھر ہے کہ یہ غزل ۱۸۳۱ء اور ۱۸۴۶ء کے درمیانی زمانے میں لکھی گئی تھی)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں ایک غلطی کا بھی ازالہ کر دیا جائے ۔ نواب علی حسن خاں مرحوم نے اپنے والد ماجد جناب سید محمد صدیق حسن خاں والاجاہ (بھوپال) کی سوانح عمری چار جلدوں میں مآثر صدیقی کے نام سے لکھی ہے ۔ اس میں (جلد دوم ص ۷۸-۷۹) انھوں نے نواب صدیق حسن خاں کی سفر حج کے دوران میں نواب تجمل حسین خاں سے ملاقات کا حال ان الفاظ میں لکھا ہے ۔

''(مدینہ میں) ایک روز راستہ میں نواب تجمل حسین مرحوم رئیس فرخ آباد سے ملاقات ہوئی ۔ نواب صاحب ممدوح ایک نہایت اعلا مرتبہ رئیس تھے ۔ والا جاہ نے ان کی دولت و عزت و عروج و اقبال کا زمانہ فرخ آباد میں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا ۔ ان کے در دولت پر ارباب حاجت کا ہجوم رہا کرتا تھا اور ان کے آستانۂ اقبال پر ہاتھی جھوما کرتے تھے ۔ انھیں کی شان میں نواب اسداللہ خاں غالب مرحوم نے یہ اشعار لکھے تھے ۔

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے
زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے
نصیر دولت و دیں اور معین ملت و ملک
بنا ہے چرخ بریں جس کے آستاں کے لئے
زمانہ عہد میں اس کے ہے محو آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

نواب صاحب باوجود امیر کبیر اور صاحب جاہ چشم ہونے کے فضایل اخلاق اسلامی اور اوصاف غیرت و حمیت دینی کے ایک جوہر فرد تھے ۔ زمانہ غدر ۱۸۵۷ء میں جب انھوں نے ہر طرف نصاریٰ کا تسلط اور استیلائے اسلام کی بربادی کا عبرت انگیز ہنگامہ دیکھا اور

ایک پاک باز موحد خدا پرست کے لئے فتنہ ھائے روزگار سے کہیں ہندوستان میں مامن نہ پایا اور حکام وقت کے تیور بدلے ہوئے پائے تو انھوں نے ہندوستان کو خیر باد کہہ کر خانۂ خدا کے زیر سایہ پناہ لی —الخ ،،

نواب والا جاہ صدیق حسن خان نے یہ حج ۱۸۶۹ ؁ میں کیا تھا۔ نواب تجمل حسین خان کا انتقال اس سے بہت پہلے ۱۸۴۶ ؁ میں ہو چکا تھا۔ اس لئے ظاہر ھے کہ مدینہ میں دونوں کی ملاقات کا کوئی امکان ھی نہیں تھا۔ ماٰثر صدیقی کے مولف کے تتبع میں پہلی غلطی ''تراجم علمائے اھل حدیث ،، کے مولف ابویحیی امام خان نو شہروی کو بھی ہوئی ھے اور انھوں نے بھی نواب صدیق حسن خان کے ترجمے میں اس ملاقات کا ذکر کیا ھے۔

در اصل نواب تجمل حسین خان نہیں بلکہ ان کے جانشین نواب تفضل حسین خان حجاز چلے گئے تھے۔ ان کے والد نواب خادم حسین خان شوکت جنگ کے بھائی اور والدہ سلطان عالیہ بیگم تھیں۔ یہ ۲۶ اکتوبر ۱۸۲۷ ؁ (۵- ربیع الثانی ۱۲۲۳ ھ) کو پیدا ہوئے تھے۔ ۱۸۵۷ ؁ کی مشہور تحریک انھیں کے زمانے میں ہوئی اور جب ہنگامہ فرو ہوا تو انگریزوں نے ان پر بھی بغاوت کے الزام میں مقدمہ قائم کیا تھا۔ جب عدالت نے انھیں پھانسی کی سزا دی تو انھوں نے کہا کہ میں نے جب جنوری ۱۸۵۹ ؁ میں اپنے آپ کو میجر بارو (Barrow) کے حوالے کیا ھے تو اس وعدے پر کہ اگر میں نے ذاتی طور پر کسی انگریز یا یورپی کے قتل میں حصہ نہیں لیا تو مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اب یہ پھانسی کی سزا کیسی۔ بہت ردو کد کے بعد یہ عذر تسلیم کر لیا گیا۔ لیکن گورنر جنرل نے حکم دیا کہ بہر حال انھیں انگریزی علاقے سے فوراً نکال دیا جائے۔ انھوں نے جزیرۃالعرب جانے کو ترجیح دی۔ چنانچہ انھیں جہاز میں سوار کر کے عدن لے گئے اور وھاں خشکی پر اتار دیا۔ یہ وھاں سے سرحد پار کرکے حجاز چلے گئے اور زندگی

کے بقیہ ایام وهیں بسر کئے - ممکن هے نواب والا جاہ کی ملاقات ان سے وهاں هوئی هو -

غالب نے بھی اپنے ایک خط میں ان کی طرف اشارہ کیا هے - نواب علاؤالدین احمد کو لکھتے هیں -

''مجھ کو رشک هے جزیرہ نشینوں کے حال پر عموماً اور رئیس فرخ آباد پر خصوصاً کہ جهاز سے اتار کر سر زمین عرب میں چھوڑ دیا - اها - هاها ''

(اردوی معلی ص ۴۰۳- خطوط غالب (۱) ص- ۳۴)

یہاں ''جزیرہ'' سے مراد انڈمان هے - ''جزیرہ نشینوں'' سے مراد مولوی فضل حق خیر آبادی اور ان کے رفیق هیں جنهیں ۱۸۵۷ء کے هنگامے میں حصہ لینے کی پاداش میں کالا پانی کی سزا ملی تھی - اور رئیس فرخ آباد سے نواب تفضل حسین خاں مراد هیں -

ان کا ۱۸۸۳ء میں حجاز هی میں انتقال هوا - انا للہ و انا الیہ راجعون

غالب کے اُردو دیوان کی اشاعتیں

(خود غالب کی زندگی میں)

پرانے شعرا میں غالب ہی ایک ایسا خوش نصیب اردو شاعر ہے جس کا دیوان کئی بار خود اس کی زندگی میں طبع ہوا ۔ ذوق تو یہ حسرت دل میں لیتے گئے ۔ البتہ مومن کا دیوان کریم الدین نے ان کی زندگی ہی میں شائع کیا ۔ مگر یہ دیوان بہت ناقص چھپا اور اس کا چھپنا نہ چھپنا برابر ہوا ۔ اس مضمون کے ذریعے ناظرین کو غالب کے مطبوعہ دیوان کی ایسی اشاعت سے روشناس کرانا ہے جو غالباً اب تک ''غالبیات،، کے ماہرین سے پوشیدہ ہے ۔ مالک رام، مہر اور زور نے غالب کے دیوان کی اشاعت صرف چار بتائی ہے ۔ اس نادانی پر شوکت سبزواری نے ایک حد تک ان کو ملامت کی ہے اور اپنے ایک مضمون (ماہ نو، فروری ۵۴ء) میں شان تبختر کے ساتھ ایک مزید اشاعت کی اطلاع دی ہے اور قطعیت کے ساتھ یہ حکم لگایا ہے کہ غالب کی زندگی میں ان کے اردو دیوان کی پانچ اور صرف پانچ اشاعتیں ظہور پزیر ہوئی ہیں ۔ غالب پر ریسرچ کا کام ابھی ہو ہی رہا ہے اور حقیقت یہ کہ ابھی شروع ہوا ہے اس لئے قطعیت کے ساتھ کسی چیز کے بارے میں حکم لگانا بڑی جسارت ہے ۔ اس نئی دریافت کا سہرا بھی شوکت سبزواری کے سر نہیں رہتا جب کہ ان کے مضمون کی اشاعت سے بہت پہلے دسمبر ۵۲ء کے 'آج کل، میں خواجہ احمد فاروقی ان پانچوں اشاعتوں پر سیر حاصل تبصرہ کر چکے ہیں ۔ شوکت صاحب کو اس کی اطلاع نہ ہوئی حیرت انگیز ہے ۔ مگر میری حیرت میں خفیف کمی اس لئے ہو جاتی ہے کہ گمان ہوتا ہے کہ شوکت صاحب نے یہ مضمون قبل ہی لکھا ہو اور 'ماہ نو، کے دفتر میں اشاعت کا منتظر رہا ہو اور اسی وقفے میں خواجہ صاحب نے ان کا طرۂ امتیاز چھین

لیا ھو - ایسی حالت میں کیا یہ مناسب نہیں کہ مضمون نگار اپنے ہر مضمون کے بعد تاریخ کتابت بھی دے دیا کریں - اس کی اشاعت جب بھی ھو اس سے بحث نہیں - اس سے بہت سی غلط فہمیاں دور ھو سکتی ھیں - بہر کیف اب ان پانچوں اشاعتوں کا سرسری جائزہ لینے کے بعد نئی اشاعت پر روشنی ڈالی جائے گی -

(۱) غالب کے دیوان کا پہلا ایڈیشن سید محمد خاں بہادر کے پریس میں شہر شعبان ۱۲۵۷ ھ مطابق اکتوبر ۱۸۴۱ء میں چھپا -

(۲) اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۲۶۳ ھ مطابق ۱۸۴۷ء مطبع دارالسلام حوض قاضی، دھلی سے شائع ھوا -

(۳) تیسرا ایڈیشن مطبع احمدی شاھدرہ سے ۲۰ - محرم ۱۲۷۸ ھ مطابق جولائی ۱۸۶۱ء میں چھپا - یہ اشاعت بہت غلط تھی اس لئے غالب نے اس کی تصحیح کی اور مطبع کے مہتمم محمد حسین خاں کو واپس بھیجی تا کہ اس کو دوبارہ کسی دوسرے مطبع میں شائع کرائیں اور یہ نسخہ انہوں نے مطبع نظامی کانپور کو بھیج دیا -

(۴) چوتھی اشاعت مطبع نظامی کانپور سے ھوئی اس کی طباعت ذی الحجہ ۱۲۷۸ ھ مطابق جون ۱۸۶۲ء ھے (شوکت صاحب مئی بتاتے ھیں صحیح جون ھے) مہتمم مطبع محمد عبدالرحمن نے خاتمہ میں لکھا .

''محمد حسین خاں نے ——— درستی کمال سے چھاپا -،،

ان دونوں اشاعتوں کے متعلق چند باتیں وضاحت طلب ھیں -

(۱) 'غدر، سے کچھ پہلے غالب نے اپنے دیوان کا ایک نسخہ خوش خط لکھوا کر نواب رام پور کو بھیجا - جب غالب ۱۸۶۰ء میں رام پور گئے تو اس نسخے کی ایک نقل لے کر ضیاء الدین

احمد خاں کے پاس دھلی بھیجی - اس سے ثابت ھوا کہ
غالب کے پاس کوئی اور نسخہ نہ تھا -

(۴) یہ رام پور ھی میں تھے کہ میرٹھ کے ایک کتب فروش نے
ان کا دیوان چھاپنا چاھا - شیفتہ نے سفارش کی اور تصحیح
کا ذمہ لیا تو غالب راضی ھوگئے - دھلی آ کر ضیاء الدین
احمد خاں والا نسخہ لے کر انھوں نے میرٹھ روانہ کر
دیا - ابھی چھپنے کی نوبت ھی نہ آئی تھی کہ منشی
شو نارائن بیچ میں ٹپک پڑے اور غالب سے بہ اصرار وہ
نسخہ میرٹھ سے طلب کروایا - ۲۵ جون ۱۸۶۰ء کو یہ
نسخہ آگرہ روانہ ھو گیا - اب یہ سوال ھے کہ تیسری
اور چوتھی اشاعت کس نسخے کی بنا پر ھوئی -

(۵) غالب نے جو ضیاء الدین والا نسخہ آگرے بھیجا تھا اس کی
اشاعت تین سال کے بعد ۱۲۸۰ ھ م ۱۸۶۳ء میں ھوئی
اگرچہ اس کی کتابت ۱۸۶۱ء ھی میں شروع ھو چکی
تھی - اسی عرصے میں اشاعت سوم اور چہارم کی نوبت
آئی -

(۶) میرے ذاتی کتب خانے میں ایک کتاب ''نگارستان سخن''
ھے - اس کے اوراق میں تین تین کالم ھیں - ھر کالم میں
تین ھم عصر شعرائے اردو ذوق ، مومن اور غالب کے
اردو کلام کا انتخاب ھے - یہ کتاب ۱۷۶ صفحات کو
محیط ھے اور مطبع احمدی واقع شاھدرہ باھتمام عمو جان
(کہیں اموجان بھی ھے) طبع ھوئی ھے - اس کی تاریخ
طباعت صفحہ ۱۶۴ پر اس طرح مندرج ھے -

''حسب فرمائش لالہ جی نراین صاحب تاجر کتب در مطبع احمدی
واقع شاھدرہ دلھائی (دھلی) بحسن اھتمام میرزا اموجان حلیئہ انطباع پوشیدہ
بتاریخ بست و ھفتم صفر ۱۲۷۹ ھ تمام شد ''

صفحہ ۱۶۵ سے ۱۷۲ تک مومن، غالب اور ظہیر کے قصیدوں کا انتخاب ہے۔ ظہیر کی ایک غزل بھی ہے۔ جہاں تک ذوق اور مومن کے کلام کا تعلق ہے یہ ظاہر ہے کہ ''نگارستان سخن،، میں ان کا انتخاب ہے مگر غالب کا کلام متداول نسخوں کی طرح از ابتدائے ''نقش فریادی،، تا انتہائے ''یاران نکتہ داں کے لئے،، مکمل ہے۔ اس لئے بہ اطمینان تمام یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالب کی زندگی میں ان کا ایک اور دیوان ۲۷ صفر ۱۲۷۹ ھ مطابق اگست ۱۸۶۲ء اس مطبع سے شائع ہوا جہاں سے ان کے دیوان کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوا تھا۔ اس لئے یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ اب یہ نسخہ پانچویں اشاعت کا دعویدار ہے اور آگرے سے جو دیوان شائع ہوا اس کا نمبر اب بجائے پانچویں کے چھٹا ہو گیا۔ 'نگار ستان سخن، سے ذوق کے کلام کے باب میں بھی بہت ھی حیرت کن باتوں کا انکشاف ہوتا ہے جس کو میں کسی دوسرے موقع کے لئے اٹھا رکھتا ہوں یہاں ایک اور ضروری بات کی طرف اشارہ ناگزیز ہے۔

خواجہ احمد فاروقی نے اپنے مضمون (آج کل، دسمبر ۵۲ء) میں بتایا ہے کہ دیوان غالب کے تیسرے ایڈیشن میں ان کا وہ قطعہ بھی ہے جس کی ابتداء ہے ''ہے چار شنبہ آخر ماہ صفر چلو،، اور یہ بھی لکھا ہے کہ اس قطعہ کا چوتھا شعر ''سونے روپے کے چھلے،، والا اس نسخہ میں ہے۔ مگر ان کو یہ یاد نہیں کہ اور نسخوں میں بھی ہے یا نہیں اور اطلاع دی ہے کہ جوش ملسیانی والے نسخے میں یہ شعر نہیں۔ 'نگارستان سخن، میں بھی یہ شعر موجود ہے اور نہیں کیسے ہوتا۔ اس لئے کہ پانچویں شعر ''یوں سمجھئے،، کا تعلق چوتھے شعر سے ہے۔ تعجب ہے کہ جوش ملسیانی والے نسخے میں یہ شعر کیوں نہیں۔ میں نے یہ نسخہ نہیں دیکھا۔ فاروقی صاحب نے چوتھے شعر کی ابتدا یوں لکھی ہے۔ بنتے ہیں ——— الخ،،۔ حالانکہ صحیح ہے ''بٹتے ہیں۔،،

عبادت بریلوی

غالب کے تغزل کا سماجی پہلو

غالب نے اپنے آپ کو خود اپنی شکست کی آواز کہا ہے وہ گل نغمہ اور پردۂ ساز نہیں تھے حالانکہ انہیں اس بات کی تمنا تھی۔ وہ اس کی آرزو کرتے رہے۔ ان کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی۔ اس آرزو کو تکمیل سے ہم کنار ہونا نصیب نہ ہوا اور وہ ہمیشہ مرنے کی آرزو میں مرتے رہے۔ ساری زندگی انہیں ماتم یک شہر آرزو ہی رہا۔ اور ایک آرزو کا کیا ذکر ہے خموشی میں لاکھوں خوں گشتہ آرزوئیں انہیں نہاں نظر آئیں۔ ان خوں گشتہ آرزوؤں نے انہیں گور غریباں کا ایک چراغ مردہ بنا دیا۔ وہ در خور محفل نہ رہے۔ اس غم کے ہاتھوں ان کی شخصیت نے ایک شمع کشتہ کی حیثیت اختیار کر لی۔ وہ زندگی میں کئی بار مرے بلکہ بار بار مرتے رہے لیکن انہیں موت نہ آئی۔ داغ حسرت ہستی ان کی زندگی کا جزو بن گیا۔ جس شخص کی زندگی میں حسرت ہستی کے سوا اور کچھ باقی نہ رہے اور جس کی زندگی موت کی راہ دیکھتے ہوئے گزر جائے لیکن پھر بھی اسے موت نہ آئے اس کے غم کا بھلا کیا ٹھکانہ ہے۔

یہ شدت غم جو غالب کے یہاں ملتی ہے وہ محض ذاتی غم کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔ اس کی تہہ میں تو زمانے کا غم کار فرما نظر آتا ہے۔ غالب اپنے ذاتی اور انفرادی غم کا سلسلہ اسی زمانے کے غم سے ملاتے ہیں۔ زمانے کا غم ہی ان کے نزدیک اس انفرادی غم کا محرک ہوا کرتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ فرد کو خلا میں معلق نہیں سمجھتے۔ ان کے خیال میں فرد سماج سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ سماجی حالات اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی اثر سے اس کی شخصیت بنتی اور بگڑتی ہے۔ اسی اثر کے ہاتھوں مرتبہ متعین ہوتا ہے۔ اسکے توسط سے وہ ایک مخصوص

شکل اختیار کرتی ھے ۔ غالب اس حقیقت کا شعور رکھتے تھے ۔ انہوں نے اپنے آپ کو، اپنے حالات کو، اپنے مسائل کو، اپنے آس پاس اور گردو پیش کے واقعات سے الگ نہیں کیا ھے ۔ ان کا خمیر اپنے زمانے کی زندگی سے اٹھا تھا ۔ انہوں نے اپنے آپ کو اسی زندگی کا ایک فرد سمجھا ھے کیونکہ زندگی کے حالات ان پر برابر اثر انداز ہوتے رہتے ھیں ۔ ان حالات کے نشیب و فراز ھی نے ان کی زندگی کو متزلزل کیا ھے ۔ انہیں خاصے ھچکوے کھانے پڑے ھیں ۔ زندہ رھنے اور زیست کرنے کے لئے انہیں خاصی جدوجہد کرنی پڑی ھے ۔ جو کچھ وہ کرنا نہیں چاھتے تھے وہ بھی انہیں طوعاً کرھاً کرنا پڑا ھے ۔ جس کام کو ان کا جی نہیں چاھتا تھا اس کو بھی وہ کرنے کے لئے مجبور ھوئے ھیں ۔ انہوں نے جگہ جگہ کی خاک چھانی ھے ۔ نہ جانے کہاں کہاں مارے مارے پھرے ھیں ۔ لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا ۔ جس چیز کی انہیں تمنا تھی تھی وہ حاصل نہیں ھو سکی ھے ۔ جب زندگی کی سماجی بنیاد متزلزل ھو گئی ھو تو یہی ھوتا ھے ۔ جب نظام اقدار میں ھمواری نہ رھی ھو تو یہی حالات پیدا ھوتے ھیں ۔ جب کوئی نصب العین نہ رھے تو ھر شخص کو انہیں حالات سے دو چار ھونا پڑتا ھے ۔ جب کوئی نظریۂ حیات نہ رھے تو ھر ایک کے سر سے موج خون کچھ اسی طرح گزرتی ھے ۔

غالب کو اپنے زمانے کی زندگی میں برپا ھونے والے حشر کا بخوبی علم تھا ۔ وہ اس عرصۂ محشر کا سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رھے تھے ۔ بلکہ یہ سب کچھ تو ان پر بیت رھی تھی ۔ اس لئے وہ ان حالات کے محض خاموش تماشائی ھی نہیں تھے ۔ وہ تو ان حالات کے سمندر میں پڑے ھاتھ پاؤں مار رھے تھے ۔ ان کا دل تو سیلئی خارا سے لالہ رنگ تھا لیکن وہ جینے کی کوشش کر رھے تھے ۔ ان حالات کو معمول پر لانا ان کے بس کی بات نہیں تھی ۔ ان کا سدھارنا ان کے قابو میں نہیں تھا ۔ اس لئے وہ عملی طور پر اپنی ذات کی طرف زیادہ متوجہ نظر آتے ھیں ۔ اپنی شخصیت کو برقرار رکھنے کا خیال ان کے پیش نظر زیادہ

رهتا ہے ۔ اور بادی النظر میں دیکھنے والے یہی محسوس کرتے ہیں کہ
اپنی ذات انہیں بہت عزیز تھی ۔ اپنا مفاد ہی ان کے نزدیک سب
کچھ تھا ۔ اس دائرے سے باہر نکل کر وہ دیکھتے اور سوچتے ہی نہیں
تھے ۔ اور یہ بات ایسی کچھ غلط نہیں ہے ۔ لیکن اس کو تسلیم کر لینے
کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غالب جو کچھ
اپنی ذات کے لئے کر رہے تھے اس میں در حقیقت اپنے طبقے کی روایت
کو زندہ رکھنے کی کوشش بھی شامل تھی ۔ اپنی خاندانی وجاہت کو
برقرار رکھنے کا خیال تھا ۔ اپنی معاشرت کی آن اور تہذیب کی شان
کو نمایاں کرنے کی خواہش بھی کارفرما تھی ۔ غالب اپنی ذاتی زبوں حالی
پر کڑھتے ضرور تھے ۔ اس پر خون کے آنسو ضرور بہاتے تھے ۔ لیکن ان
سب کی تہہ میں یہ خیال ضرور ہوتا تھا کہ اس زبوں حالی کے ھاتھوں ان
کی خاندانی وجاہت اور نسلی برتری پر حرف آ رہا ہے ان کے طبقے کی رسوائی
ہو رہی ہے ۔ ان کی معاشرت پر نزع کا سا عالم ہے ۔ اور ان کی تہذیب
کا دم نکل رہا ہے ۔ اس کی گونج غالب کی شخصیت اور ان کے فن میں
جگہ جگہ سنائی دیتی ہے ۔ بعض اوقات ان آوازوں کا پہچاننا ذرا مشکل ضرور
ہوتا ہے ۔ لیکن غالب کے مزاج سے واقفیت اور ان کے فن کی روح سے
تھوڑا سا لگاؤ بھی ان باتوں کو بہت واضح کر دیتا ہے ۔ اور ان
کے سننے اور سن کر سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی بلکہ اگر
ایسا کیا جائے تو یہ آوازیں ذہن و شعور پر چھا جاتی ہیں اور روح کے
تہہ در تہہ گوشوں میں بھی ان کا آھنگ اپنی جگہ بنا لیتا ہے ۔

وہ ماحول جس میں غالب نے آنکھ کھولی سیاسی ، تہذیبی اور سماجی
اعتبار سے ایک ایسا ماحول تھا جس میں انتشار اور بد نظمی تھی ۔
ایک سیاسی نظام دم توڑ رہا تھا ۔ ایک معاشرت کی بنیادیں ھل چکی تھیں
ایک تہذیب نے جو چراغ روشن کئے تھے وہ آندھیوں کے زور پر تھے ۔
مغلوں کے اقبال کا آفتاب گہنا چکا تھا ۔ اب وہ صرف نام کے حکمراں
رہ گئے تھے ۔ طاقت ختم ہو چکی تھی ۔ اور اس کی وجہ سے صدیوں کی
بنی بنائی حکومت کا وجود خاک میں مل گیا تھا ۔ حکومت کی کمزوری

سے جو انتشار پیدا ہو سکتا ہے وہ اس ماحول میں عام تھا ۔ افراد زندگی سے بے زار تھے ۔ انہیں اپنے مستقبل کا علم نہیں تھا ۔ وہ اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتے تھے ۔ ان کی زندگیوں میں کوئی استواری نہیں تھی ۔ وہ کچھ اکھڑے اکھڑے تھے ۔ اس سیاسی انتشار نے سماجی زندگی کو کھو کھلا کر دیا تھا ۔ اس میں ایک خلا کی سی کیفیت تھی ۔ البتہ تغیر کا عمل جاری تھا ، نئے سماجی حالات پیدا ہو رہے تھے ۔ نئی قدریں وجود میں آ رہی تھیں ۔ لیکن ان حالات اور ان قدروں سے بہت سے لوگوں نے مطابقت پیدا نہیں کی تھی ۔ ان کے لئے یہ تغیر عجیب و غریب تھا ۔ اس لئے وہ اپنی سماجی روایات کو سینے سے لگائے رکھنا چاہتے تھے ۔ انہیں ان روایات کے دم توڑنے اور ختم ہو جانے کا بڑا غم تھا ۔ وہ اس پر آنسو بہاتے تھے ۔ اس کا رونا روتے تھے ۔ سیاسی اور سماجی انتشار کا اثر تہذیبی معاملات پر یہ ہوا تھا کہ لوگ اس کو حسرت سے دیکھتے تھے ۔ تہذیب کی جو عظیم روایت مغلوں نے قایم کی تھی اس کا ارتقاء جیسے رک گیا تھا ۔ اس کے آگے بڑھنے کی توقع بھی نہیں تھی ۔ کیوں کہ ناسازگار حالات راہ کا روڑہ بنے ہوئے تھے ۔ ظاہر ہے کہ یہ تہذیب سب کو عزیز تھی ۔ اس لئے اس کی ارتقائی کیفیت کے رک جانے کا سب کو غم تھا ۔ سب کے سب سوگوار تھے ۔ سب کی آنکھیں پرنم تھیں ۔ نئی زندگی کا آفتاب طلوع ضرور ہو چکا تھا ۔ لیکن ابھی دھند اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھی ۔ زندگی کو بدلنے اور اس میں نئے حالات پیدا کرنے کے خیالات بھی کسی نہ کسی صورت میں پیدا ہونے لگے تھے ۔ اور ان خیالات نے نیم مذہبی اور نیم سیاسی تحریکوں کی صورت اختیار کر لی تھی ۔ لیکن تحریکوں کے سامنے بھی کوئی بہت واضح نصب العین نہیں تھا ۔ اسی لئے ان کی کامیابی کی توقع کم تھی ۔ معاشی اور اقتصادی زبوں حالی تو ان حالات میں پیدا ہونی ہی چاہیے ۔ پرانے جاگیر دارانہ نظام کی بنیادیں ہل چکی تھیں ۔ لیکن اس کی جگہ ابھی کوئی مستقل نظام نہیں لے سکا تھا ۔ نئی جاگیرداری کے پیدا ہونے کے آثار نظر آتے تھے ۔ لیکن ابھی تک اس کا ہیولا تیار نہیں ہوا تھا ۔ اور کوئی خاص شکل نہیں بنی تھی ۔ اس لئے ہر شخص مادی اور ذہنی دونوں اعتبار سے پریشانی اور زبوں حالی

کا شکار تھا ۔ کسی کو کچھ خبر نہیں تھی کہ کیا ہونے والا ہے ۔ زندگی کون سی کروٹ لینے والی ہے اور حالات کون سا رخ اختیار کرنے والے ہیں ۔ ان حالات نے احساس شکست کو عام کیا ۔ شکست خوردگی افراد کی طبیعتوں میں داخل ہو گئی ۔ رنج والم ان پر چھا گئے ۔ چنانچہ حالت اس وقت یہ تھی کہ رونا زندگی میں داخل ہو گیا تھا ۔ زندگی مر مر کر جئے جانے کا نام بن گئی تھی ۔ اور لوگ غالب کی طرح مرنے کی آرزو میں مرنے لگے تھے ۔ ظاہر ہے ان حالات میں جذباتیت کو تو ختم ہونا ہی چاہیے تھا ۔ چنانچہ نری جذباتیت زندگی میں کم ہو گئی تھی ۔ اور زندگی کے حقائق کا شعور بڑھنے لگا تھا ۔ حقائق کی تلاش و جستجو کی طرف توجہ عام ہونے لگی تھی ۔ لوگ سوچنے اور غور کرنے لگے تھے ۔ حالات نے انہیں زیادہ حساس بنا دیا تھا اور وہ ایسی باتوں کے بارے میں بھی اظہار کرنے لگے تھے جن پر اب تک کوئی توجہ نہیں کی گئی تھی ۔

غالب اسی ماحول کی پیداوار ہیں اور ان کی شخصیت اس کی آئینہ داری کرتی ہے اور ان کا فن بھی اس کا ترجمان ہے ۔ ان کے خیالات و نظریات بھی اسی ماحول کی عکاسی کرتے ہیں ۔ اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ غالب صرف اپنی انفرادیت ہی میں گم نہیں تھے ۔ ان کی آنکھیں صرف اندر ہی کی طرف نہیں کھلتی تھیں ۔ وہ اپنی ذات سے باہر نکل کر بھی دیکھتے تھے ۔ اس زمانے کی اجتماعی زندگی کا سارا نقشہ ان کی آنکھوں کے سامنے تھا ۔ اس کے سارے نشیب و فراز ان کی نظر میں تھے ۔ ان حالات نے انہیں متاثر کیا اور اس حد تک متاثر کیا کہ اپنی غزلوں میں ان حالات کی ترجمانی کے لئے مجبور ہوئے ۔ کہیں براہ راست اور کہیں بالواسطہ ۔ لیکن اس حالات کی ترجمانی انہوں نے کی ضرور ہے ۔ وہ مشاہدۂ حق کی گفتگو بادہ و ساغر میں اور نازو غمزہ کی بات دشنہ و خنجر میں کرتے تھے ۔ اسی لئے ان کی غزلوں میں ان حالات کے جو مختلف روپ اور اس ماحول کے جو مختلف پہلو ہیں ان کا پتہ لگانا ذرا مشکل ہو جاتا ہے ۔ لیکن جس کے پاس غزل کا صحیح مذاق اور اس کے مزاج کا صحیح شعور ہے ۔ جو اس فن کے آداب کو جانتا اور سمجھتا ہے اس کو غالب

کی غزلوں کے ایسے اشعار میں معانی کی دنیائیں نظر آتی هیں جو خاص
تغزل سے تعلق رکھتی هیں - غزل کا شاعر حسن و غزل کے پردے میں نه
جانے کیا کیا کچھ کہه جاتا هے نه جانے کتنے تاثرات هوتے هیں جن سے غزل
کا ایک شعر پیدا هوتا هے - نه جانے کتنا وسیع پس منظر هوتا هے جس میں کسی
ایک خیال کی تصویر بنتی هے - نه جانے کتنے محرکات هوتے هیں جن
سے کسی ایک موضوع کا وجود هوتا هے - غالب کے یہاں بظاهر جو
حسن و عشق اور اس کے متعلقات کی باتیں هیں وہ ان کے ماحول اور مخصوص
حالات کے کسی نہایت هی اهم پہلو کی طرف اشارہ کرتی هیں - ان
کے خالص داخلی اور انفرادی خیالات میں بھی ایک سماجی اور اجتماعی
خیالات کی گونج سنائی دیتی هے - غالب کی غزلوں کے اشعار کو ان کے
اجتماعی شعور سے الگ کر کے دیکھنا ان کے ساتھ زیادتی هے -

بات یه هے که غالب جذباتی معاملات تک کی ترجمانی میں اس
اجتماعی شعور کا اظہار کرتے هیں - زندگی کے خالص انفرادی اور جذباتی
معاملات کو بھی غالب نے ایک سماجی اور اجتماعی زاویہ نظر سے دیکھا
هے - وہ ان دونوں کو الگ کرکے دیکھنے کے قائل نہیں رهے هیں -
انهوں نے حسن و عشق اور اس کے مختلف پہلوؤں کی نقاب کشائی کی
هے - لیکن ان سب کو صرف جذبات کی حدود میں هی نہیں رهنے دیا بلکه
همیشه انکی یه باتیں جذباتی حدود کو توڑ کر باهر نکل جاتی هیں - اور
وہ ان باتوں کو پیش کرتے هوئے زندگی کی نہایت هی سنگین اور تلخ
حقیقتوں کی تفصیل پیش کرنے لگتے هیں - حسن انکے یہاں ایک کیفیت
هے ایک حسن نظر هے - انسان کا حسن سے دلچسپی لینا فطری بات هے -
اسمیں بڑا لطف هے ، بڑا هی کیف هے لیکن اس حسن سے دلچسپی لینے
کے بھی کچھ آداب هیں - ان آداب کے بغیر صحیح حسن پرستی ممکن
نہیں - بوالہوسی اگر حسن پرستی شعار کرے تو آبروئے شیوہ اهل نظر جاتی
رهتی هے -

هر بو الهوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اهل نظر گئی

گویا غالب کے خیال میں حسن پرستی کے کچھ معیار ھیں - اور یہ معیار حالات کے پابند ھیں - سماجی زندگی میں بو الھوس کی کوئی حیثیت نہیں - کیونکہ وہ کسی اخلاقی معیار کا پابند نہیں ھوتا - اس کے پیش نظر بلند قدریں نہیں ھوتیں - اعلا معیار نہیں ھوتے - اور اس لئے اس کے ھاتھوں بنیادی سماجی اقدار کی نفی ھوتی ھے - غالب کے یہاں حسن پرستی نیاز عشق کے بغیر کوئی حیثیت نہیں رکھتی - عشق زندگی میں اپنا ایک نظام رکھتا ھے - وہ زندگی کا ایک بہت ھی اھم پہلو ھے- جس کو سماجی اور اجتماعی زندگی سے الگ نہیں کیا جا سکتا - وہ سماجی زندگی کو متاثر کرتا ھے - سماجی زندگی خود اس سے متاثر ھوتی ھے - انکا آپس میں ایک ربط ھے - اس لئے ان دونوں کو الگ کرکے نہیں دیکھا جا سکتا - غالب کے یہ اشعار اس حقیقت کو پوری طرح واضح کرتے ھیں :

گو میں رھا رھین ستم ھائے روزگار لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رھا

تیری وفا سے کیا ھو تلافی کہ دھر میں تیرے سوا بھی ھم پہ بہت سے ستم ھوئے

غم گرچہ جاں گسل ھے پہ کہاں بچیں کہ دل ھے
غم عشق گر نہ ھوتا غم روزگار ھوتا

کم جانتے تھے ھم بھی غم عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ھوئے پہ غم روزگار تھا

یہاں غالب نے جس عشق کا بیان کیا ھے وہ صرف ایک جذباتی اور رومانی کیفیت ھی نہیں بلکہ وہ سماجی زندگی سے ایک گہرا تعلق رکھتا ھے - اس لئے غم عشق اور غم روزگار ساتھ ساتھ چلتے ھیں - محبت کرنے والا رھین ستم ھائے روزگار رھتا ھے لیکن اس کے باوجود محبوب کے خیال سے غافل نہیں رھتا - اور بعض اوقات تو زمانہ اس پر ایسے ستم ڈھاتا ھے کہ محبوب کی وفا سے بھی اسکی تلافی نہیں ھو سکتی - عشق کے ساتھ غم روزگار کا یہ تصور اس حقیقت کو واضح کرتا ھے کہ غالب عشق کو سماجی زندگی سے الگ کرکے نہیں دیکھتے تھے - ان دونوں کا خیال انکے

یہاں ساتھ ساتھ پیدا ہوتا تھا ۔ وہ ان دونوں کو خانوں میں نہیں بانٹتے تھے ۔ ان کے یہاں تو عشق زندگی ہے اور زندگی عشق ۔ غالب کے زمانے میں عشق کرنا آسان نہیں تھا ۔ اس کے لئے پتھر کے کلیجے کی ضرورت تھی ۔ سماجی حالات کی ناھمواری نے اس وقت افراد کو غم عشق سے زیادہ غم روزگار کا شکار کر دیا تھا ۔ غالب نے اپنی غزلوں میں اسی صورت حال کی ترجمانی کی ہے ۔ اور اس ترجمانی میں ان کے سماجی شعور کو بڑا دخل ہے ۔

اور یہ سماجی شعور غالب کے یہاں اس قدر بڑھا ہے کہ وہ اپنی غزلوں میں اس زمانے کی زندگی کا اچھا خاصہ مرثیہ لکھنے لگے ھیں ۔ اسلوب غزل کا ہے زبان تغزل کی ہے ۔ مضامین بظاھر عشقیہ ھیں لیکن ایسے اشعار کی تہہ میں بھی اس زمانے کے سماجی حالات اور اس کی زبوں حالی کے مختلف پہلوؤں کی جھلک صاف نظر آتی ہے ۔ اور اس زبوں حالی نے جو اثرات چھوڑے ھیں اس کا نقشہ صاف دکھائی دیتا ہے ۔ بظاھر تو غالب کے ان اشعار میں غم جاناں اور غم عشق کی باتیں ھیں لیکن درحقیقت ان کی غم عشق اور غم روزگار کا تذکرہ ہے ۔ ان پر پردے ضرور پڑے ہوئے ھیں ۔ لیکن ان پردوں کو ذرا اٹھا کر دیکھا جائے تو ان کے پیچھے اس زمانے کی زندگی کی عام سماجی حالت ، اس کے بنیادی معاملات ، اس کے اساسی مسائل اور افراد پر ان سب کے رد عمل کے مختلف پہلو بے نقاب نظر آتے ھیں ۔ اور اس بات کا پوری طرح اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے کی سماجی اور اجتماعی زندگی کا کیا حال تھا ۔ افراد پر کیا بیت رہی تھی ۔ اور وہ اس کے بارے میں کیا سوچ رہے تھے ۔

غالب کو اپنی تہذیبی عظمت کا احساس تھا ۔ وہ یہ جانتے تھے کہ ان کی تہذیب نے جو روایت قائم کی ہے اسپر یقیناً فخر کیا جا سکتا ہے ۔ اس نے جو کارھائے نمایاں انجام دئے ھیں ان کی حیثیت اپنی جگہ مسلم ہے ۔ لیکن اس کے باوجود اس سے مطمئن نہیں ہوتے ۔ انکا جی چاھتا ہے کہ انکی تہذیبی روایت میں اس سے بھی زیادہ اضافہ ہوتا اور وہ اس سے کہیں زیادہ ترقی کرتی ۔ یہ خیال غالب کے یہاں اس

لئے پیدا ہوتا ہے کہ وہ اس تہذیبی روایت کو آگے بڑھتے ہوئے نہیں دیکھتے - جب انہیں اس کا قافلہ رکتا ہوا نظر آتا ہے۔ جب انہیں اس میں تھکن کے آثار دکھائی دیتے ہیں تو انہیں اس خیال کا اظہار کرنا پڑتا ہے - اور وہ یہ شعر کہنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں -

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

بہ ظاہر تو یہ شعر ایک انفرادی جذبے کا ترجمان معلوم ہوتا ہے لیکن اس کی تہہ میں درحقیقت ایک سماجی اور اجتماعی شعور کی کارفرمائی ہے - غالب نے اس سماجی اور تہذیبی حقیقت کو شدت سے محسوس کیا ہے اور وہ اس کا اظہار کرنے کے لئے مجبور ہوئے ہیں - درحقیقت اس خیال کی ترجمانی ان سے اس ماحول ھی نے کرائی ہے - جس میں سماجی انتشار تہذیبی ارتقاکی راہ میں حائل ہو گیا تھا - اور اس کے آگے بڑھنے کی کوئی صورت نظر ھی نہیں آتی تھی - اس غزل میں ایک اور شعر ہے جسمیں اسی بنیادی خیال کو غالب نے کچھ اور بھی وضاحت سے پیش کیا ہے - غالب کو مغلوں کی تہذیبی بساط کے اٹھ جانے کا بڑا غم تھا - ہندوستان کی تاریخ میں وہ اس کو ایک بہت بڑا سانحہ سمجھتے تھے - ان کے خیال میں یہ صورت حال پوری قوم کے لئے افسوس ناک تھی - ظاہر ہے کہ مغلوں کی طاقت کا ختم ہونا ہندوستان کی تاریخ کا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا - اس نے تو افراد کی قسمتیں بدل دی تھیں - سماجی زندگی کے دھارے کے رخ کو موڑ دیا تھا - اسکے نتیجے میں ھنگامے ہوئے ، انتشار پیدا ہوا - اس انتشار اور ھنگامے کے اثرات افراد پر ہوئے - ان کے ناموس پر آنچ آئی، ان کی عزت اور وقعت جو سب سے بڑی دولت تھی خاک میں مل گئی - ان حالات میں افراد اپنے آپ کو بے آبرو محسوس کرنے لگے - غالب نے جب یہ شعر کہا تو اس کی تہہ میں درحقیقت یہی خیال تھا -

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

یہاں آدم کے خلد سے نکلنے کی تلمیح کا سہارا لے کر نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ دیا گیا ھے ۔ خلد سے آدم کا نکلنا انسانیت کے لئے ایک بہت بڑا سانحہ تھا ۔ غالب اپنے تہذیبی انحطاط کو اس سانحے سے کم نہیں سمجھتے تھے ۔ کیونکہ اس سے اس زندگی پر آنچ آئی جو اپنے تہذیبی کارناموں کے باعث انسانیت کے لئے ایک بہت بڑی دولت تھی ۔ اس معاشرت میں انتشار پیدا ھوا جو اپنی اعلا اقدار کے باعث دنیا جہاں میں مشہور تھی ۔

اور اس صورت حال کے اثرات بڑے ھی دور رس ھوئے ۔ کساد بازاری کا دور دورا ھوا ۔ معیار باقی نہ رھے ۔ قدریں منتشر ھو گئیں ۔ اصول ڈانوا ڈول ھو گئے ۔ ھر شخص کو ان کا شکار ھونا پڑا ۔ اس ھنگامے اور انتشار میں کسی ایک کو بھی طمانیت نصیب نہ ھوئی ۔ نفسی نفسی کا عالم پیدا ھوا ۔ ایک دوسرے سے توقعات اٹھ گئیں ۔ خستگی کی کوئی داد دینے والا نہ رھا ۔ کیونکہ خستگی تو زندگی کا عام انداز بن گئی ۔ غالب نے اس شعر میں اسی بنیادی خیال کی ترجمانی کی ھے :

ھوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ھم سے بھی زیادہ خستۂ تیغ ستم نکلے

صاف ظاھر ھے کہ سماجی زندگی کے انحطاط و زوال کے باعث پیدا ھونے والی زبوں حالی اس شعر کی بنیاد ھے ۔ اس شعر میں تو انفرادی اور داخلی آھنگ کا شائبہ بھی نہیں ۔ اس میں تو اجتماعی زندگی کے عام انتشار کا نقشہ ایک عام خستگی کی صورت میں پیش کیا گیا ھے ۔ اس نقشے میں وہ صورت حال بہت واضح ھے جس کا غالب کو بڑا غم تھا اور جس پر وہ ساری زندگی خون کے آنسو روتے رھے ۔

غالب کی ایک اور غزل ھے ۔ جس کے بیشتر اشعار میں سوز نہاں سے دل کے بے محابا جلنے ، اس میں ذوق وصل اور یاد یار تک کے باقی نہ رھنے، گھر کو آگ لگنے اور اس کے نتیجے میں سب کچھ جل جانے، اپنے عدم سے پرے ھونے اور اس کی وجہ سے آہ آتشیں تک کے بے اثر ھو جانے کا تزکرہ

ھے ۔ اس میں غالب نے افسردگی کی آرزو بھی کی ھے ۔ کیونکہ طرز تپاک اھل دنیا نے انہیں ایسا کرنے کے لئے مجبور کیا ھے ۔ اس کی تفصیل خود غالب ھی کی زبانی سنئے ۔

دل میرا سوز نہاں سے بے محابا جل گیا
آتش خاموش کی مانند گویا جل گیا

دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

میں عدم سے بھی پرے ھوں ورنہ غافل بارھا
میری آہ آتشیں سے بال عنقا جل گیا

دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

میں ھوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرز تپاک اھل دنیا جل گیا

ان اشعار میں شخصی اور انفرادی باتیں ضرور ھیں ۔ لیکن ان باتوں کو صرف انفرادی جذباتی زندگی کے معاملات تک محدود نہیں کیا جا سکتا ۔ کیوں کہ ان اشعار کا مجموعی تاثر زندگی کے کسی اور ھی تاثر کی تصویر دکھاتا ھے۔ غالب یہاں یہی کہنا چاھتے ھیں کہ اس معاشرے میں ھر شخص کا دل سوز بے محاباسے جل رھا ھے۔ ساری سماجی زندگی میں بس ایک سلگنے والی کیفیت ھے ۔ پوری تہذیب میں ایک آگ سی اندر ھی اندر پھیل رھی ھے اور اس زندگی، معاشرت اور تہزیب پر ایک اداسی اور سوگواری کا عالم ھے ۔ دلوں کی بستیاں ویران ھیں ۔ ان میں امنگ نہیں، ولولہ نہیں، حوصلہ نہیں ، ان سب پر اوس پڑ گئی ھے ۔ اب پیچھے مڑ کر دیکھنے کا خیال ھے نہ آگے بڑھنے کی تمنا ۔ بس ایک حسرت اور مایوسی کا عالم ھے اور یوں معلوم ھوتا ھے جیسے آگ نے گھر کی ایک ایک چیز کو جلا کر رکھ دیا ھے ۔ اس لئے معاشرتی اور تہذیبی زندگی میں کوئی گرمی اور گرم بازاری نظر نہیں آتی ۔ کسی قسم کی امنگ اور جو لانی

کا پتہ نہیں چلتا - کیونکہ زندگی کو حالات نے کچھ ایسا بنا دیا ہے کہ وہ عدم سے بھی پرے معلوم ہوتی ہے - اس پر مردنی چھائی ہوئی ہے - اور اس کو دیکھ کر اس بات کا احساس ہوتا ہے جیسے وہ موت سے بھی کچھ آگے ہے - اس عالم میں بے دلی تو عام ہونی ہی چاہئیے - چنانچہ یہ بے دلی ساری زندگی پر چھائی ہوئی ہے - اور اس بے دلی کا یہ اثر ہے کہ ہر شخص افسردگی کی آرزو کر رہا ہے - کیونکہ زندگی سے جو توقعات وہ رکھتا ہے ان کے پورے ہونے کا ان حالات میں کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا - غالب یہاں اسی صورت حال پر ماتم کر رہے ہیں -

جب زندگی اس منزل پر آ جائے تو ظاہر ہے اس میں کوئی دلکشی باقی نہیں رہ سکتی - ان حالات میں تو اس کا خود اپنے سے بیگانہ ہو جانا یقینی ہے ایسے ہی عالم میں بے دماغی کا وجود ہوتا ہے جو موج بوئے گل کو اس کے سحر سے محروم کر دیتی ہے - اس کا اثر الٹا ہونے لگتا ہے - کیونکہ ہر چیز سے طبعیت بے زار ہو جاتی ہے - موج بوئے گل سے بھی دم ناک میں آنے لگتا ہے - سیر گل کو جی نہیں چاہتا - کیوں کہ گلوں کے خندہ ہائے بے جا برداشت نہیں ہوتے -

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موج بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

غم فراق میں تکلیف سیر گل مت دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا

یہ اشعار شکست خوردگی اور احساس شکست کی کیفیت کو پوری طرح ظاہر کرتے ہیں - جب اجتماعی زندگی میں مایوسیوں کا بسیرا ہو تو افراد اپنے آس پاس اور گردو پیش سے بے زار ہو جاتے ہیں - کوئی بات بھی انہیں اچھی نہیں لگتی - کسی چیز سے بھی ان کا جی نہیں بہلتا - انہیں زندگی میں کسی قسم کی کوئی دل کشی نظر نہیں آتی - وہ دنیا سے منہ موڑ لیتے ہیں اور ان کی زندگی ایک مستقل کرب کے عالم میں بسر ہوتی ہے - غالب نے یہاں اسی صورت حال کی عکاسی کی ہے - ان کے زمانے میں

زندگی کا کچھ یہی حال ہو گیا تھا - کوئی منزل سامنے نہیں تھی - کوئی نصب العین پیش نظر نہیں تھا - اس لئے لوگ زندگی سے دور بھاگتے تھے - انہیں ان کی مسرتوں اور دل آویزیوں سے جیسے کوئی تعلق ھی نہیں رہ گیا تھا - اور یہ بات ایسی کچھ عجیب نہیں تھی - جب اجتماعی زندگی کے افق پر انحطاط و زوال کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہوں تو افراد کو کچھ اسی صورت حال سے دو چار ہونا پڑتا ھے - اور ان کی ذھنی کیفیت کچھ اسی طرح کی ہو جاتی ھے -

اس سماجی انحطاط اور تہذیبی زوال کے ھاتھوں پیدا ہونے والی تباھی اور ویرانی کا بیان غالب نے اپنی غزلوں میں جگہ جگہ کیا ھے ان کے یہاں ان خیالات کی ایک لہر دوڑی ہوئی ھے - مختلف پہلوؤں سے اس کا بیان ان کے یہاں ہوتا ھے - مختلف زاویوں سے وہ اس پر روشنی ڈالتے ھیں اور اس طرح انحطاط و زوال کی پوری تصویر ان کے کلام میں سے ابھرتی ھے - اس کی تفصیل بے شک ان کے یہاں نہیں ھے کیونکہ اس سلسلے میں غالب کا زاویہ نظر تمام تر خارجی نہیں تھا - البتہ جو مجموعی فضا وہ قائم کرتے ھیں اس سے اس زمانے کی افراد کی اس ذھنی کیفیت کا سارا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ھے جو انحطاط و زوال نے پیدا کی تھی - اس موضوع پر تاثر سے کیسے بھر پور شعر انہوں نے نکالے ھیں -

گریہ چاھے ھے خرابی مرے کاشانے کی درو دیوار سے ٹپکے ھے بیاباں ہونا

کوئی ویرانی سی ویرانی ھے دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اس شمع کی طرح سے جسکو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغ ناتمامی

ہوئے گل نالۂ دل دود چراغ محفل
جو تیری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے

نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتئی چشم و گوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
داماں باغباں وکف گلفروش ہے
لطف خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ
یہ جنت نگاہ و فردوس گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھئے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے
داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے
خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ
ہتھکنڈے ہیں چرخ نیلی فام کے

گر یوں ہی روتا رہا غالب تو اے اہل جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

یہ سب کچھ انحطاط و زوال ہی کا اثر ہے کہ غالب کی نظریں کاشانے کی خرابی دیکھتی ہیں ۔ اور دور دیوار سے انہیں جنگل بیابان کی سی کیفیت ٹپکتی ہوئی نظر آتی ہے ۔ دور دور تک ویرانی کا بسیرا دکھائی دیتا ہے ۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہر طرف ہو کا عالم ہے حد نظر تک دهشت ہی دهشت ہے ۔ تہذیب اور تہذیب کے

علم برداروں کا حال ایسا ہے جیسے کوئی شمع کو بجھا دے ۔ محفلیں سونی پڑی ہیں ۔ زندگی کی محفل سے بوئے گل، نالۂ دل ، دود چراغ محفل، ہر ایک پریشان نکلتا ہے ۔ ساری زندگی ایک ظلمت کدہ بن گئی ہے ۔ اس ظلمت کدے میں شب غم کا جوش ہے ۔ دلیل سحر ایک شمع ہو سکتی تھی سو وہ بھی خاموش پڑی ہے ۔ ایسے میں مژدۂ وصال اور نظارۂ جمال کا خیال بے معنی بات ہے ۔ لیکن اس عالم میں بیتی ہوئی بہار کا خیال آنا لازمی ہے ۔ غالب کو یہ خیال آتا ہے اور وہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب ہر گوشۂ بساط دامان باغبان و کف گلفروش تھا ۔ لطف خرام ساقی جنت نگاہ اور ذوق صدائے چنگ فردوس گوش بنے ہوئے تھے ۔ لیکن زمانے نے یہ بساط الٹ دی ۔ سرور و شور اور جوش و خروش باقی نہ رہا ۔ داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی اک شمع رہ گئی سو اسنے بھی خاموشی اختیار کر لی ۔ اس کے ساتھ ہی غالب کو اپنی معاشرت اور تہذیب کی محرومی کا بھی خیال آتا ہے ۔ اور وہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ جو اس تہذیب کے علم بردار ہیں وہ پیغام کے تشنہ لب ہیں ۔ ان کے پاس کامیابی و کامرانی کا کوئی پیغام نہیں آتا اور ان کے سامنے غیر بھری محفل میں جام کے بوسے لے رہے ہیں ۔ لیکن وہ اس صورت حال کا شکوہ نہیں کرتے کیونکہ ان کے نزدیک یہ تو سب چرخ نیلی فام کے ہتھکنڈے ہیں ۔ غالب کو اس صورت حال کی نزاکت کا احساس ہے کیونکہ انہیں اسکی وجہ سے ہر شخص گریہ و زاری کرتا ہوا نظر آتا ہے ۔ اور یہ آثار کچھ اچھے نہیں کیونکہ گریہ و زاری اچھا شگون نہیں ۔ اس سے تو بستیاں ویران ہو جاتی ہیں ۔ یہ منظر غالب کے سامنے ہے ۔

ان اشعار میں بنیادی طور پر ذاتی اور انفرادی آہنگ موجود ہے ۔ لیکن چونکہ یہ سب کے سب اس ذہنی کیفیت کے ترجمان ہیں جو اس وقت ہر شخص پر طاری تھی اس لئے یہاں اس انفرادیت میں بھی ایک اجتماعی آہنگ کا احساس ہوتا ہے ۔ اور سماجی شعور کی جھلک نظر آتی ہے ۔ بہر حال یہ اشعار پوری طرح اس زمانے کی اجتماعی زندگی کے

ترجمان معلوم ہوتے ہیں - اس زمانے کے عام حالت کا ان سے پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے - غالب نے یہ محسوس کیا ہے کہ یہ سماجی حالت اور اجتماعی زندگی کی یہ کیفیت افراد کے لئے خاصی پریشان کن رہی ہے - یہ اس پر کڑھتے رہے ہیں - لیکن انہیں کچھ کرنے کا موقع نہیں ملا ہے - انہیں نہ جانے کس بات کی حسرت رہی ہے - وہ ایسے شب و روز اور ماہ و سال کا خیال کرتے ہیں جو اب موجود نہیں ہیں - کاروبار شوق کو انہوں نے ختم ہوتے ہوئے دیکھا ہے - ذوق نظارۂ جمال انہیں خاک میں ملتا ہوا نظر آیا ہے - اور وہ اس پر لہو روئے ہیں لیکن دل کھول کر لہو رونے کی بھی انہیں فرصت نہیں ملی ہے - فکر دنیا میں انہیں فرصت نہیں ملی ہے - فکر دنیا میں انہیں سر کھپانا پڑا ہے - حالانکہ اس کے بارے میں انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا - وہ تو اسے ہمیشہ جان کا وبال ہی سمجھتے رہے تھے - غالب نے کس خوبی سے اس صورت حال کی ترجمانی کی ہے -

وہ فراق اور وہ وصال کہاں   وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصت کاروبار شوق کسے   ذوق نظارۂ جمال کہاں
ایسا آساں نہیں لہو رونا   دل میں طاقت گرہ میں مال کہاں
فکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں   میں کہاں اور یہ وبال کہاں

در حقیقت غالب نے یہاں اس طبقے کی ترجمانی کی ہے جس پر اس انحطاط و زوال اور افراتفری و انتشار کا اثر سب سے زیادہ تھا - جس کے افراد اپنے آپ کو ایک عظیم تہذیبی روایت کا علم بردار سمجھتے تھے - جب وہ پیچھے مڑ کر دیکھتے تو انہیں اپنی ایک عظیم تہذیبی روایت کی تاریخ دور دور تک پھیلی ہوئی نظر آتی تھی - اور وہ جس تہذیبی روایت میں کاروبار عشق کے ہنگامے دیکھتے تھے نظارۂ جمال میں انہیں اس کی پوری خصوصیت نظر آتی تھی - یہ تو گویا اس کی گھٹی میں پڑی تھی - حسن کے درمیان زندگی بسر کرنا اور خود حسن کو تخلیق کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا - لیکن اب ان افراد کی نظریں یہ دیکھتی تھیں کہ یہ سارا کاروبار ختم ہو چکا ہے - اب نہ حسن ہے نہ حسن کی تخلیق -

اب تو بس فکر دنیا میں سر کھپانا رہ گیا ہے ۔ غالب کے ان اشعار میں انہیں خیالات کی گونج اور انہیں احساسات کا آہنگ سنائی دیتا ہے ۔

یہ حالات ظاہر ہے کہ طاقت ختم ہو جانے کے نتیجے میں پیدا ہوئے ۔ لوگوں نے طاقت کو ختم ہوتے ہوئے دیکھا لیکن وہ کچھ کر نہ سکے کیونکہ ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی ۔ وہ خود طاقت نہیں رکھتے تھے۔ اس موقعہ سے نئی طاقتوں نے فائدہ اٹھایا اور وہ حکمران ہو گئیں ۔ ان کے ہتھکنڈوں کو اس زمانے کے لوگ نہ سمجھ سکے ۔ انہوں نے بڑے بڑے سبز باغ دکھائے ۔ کچھ لوگوں پر اسکا اثر بھی ہوا ۔ اور وہ انکے دام میں پھنس کر انکی الفت کا دم بھرنے لگے ۔ لیکن اس کے باوجود انہیں اپنے پابہ زنجیر ہونے کا احساس بہر صورت رہا ۔ کون جانے کہ غالب نے اپنے اس شعر میں اس صورت حال کی ترجمانی کی ہو ۔

ہوں گرفتار الفت صیاد ورنہ باقی ہے طاقت پرواز

اس زمانے کے ہندوستان اور خصوصاً دلی کے سیاسی حالات کو سامنے رکھا جائے تو اس شعر میں بڑی معنوی وسعت پیدا ہو جاتی ہے ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سیاست افرنگ نے اپنا کھیل کھیلنا شروع کر دیا تھا ۔ اور اس سر زمین پر دام بچھا دئے گئے تھے لیکن بھوے بھالے لوگوں نے نے انہیں دام نہیں سمجھا تھا ان میں پرواز کی طاقت موجود تھی لیکن وہ اڑ نہیں سکتے تھے ۔ الفت صید انکا راستہ روکتی تھی ۔ اس زمانے کی تاریخ میں اس کی تفصیل موجود ہے ۔

غالب نے یہاں طاقت پرواز کا ذکر کیا ہے ۔ جس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی اجتماعی زندگی کی صلاحیتوں سے بے خبر نہیں تھے ۔ ان کے خیال میں تو اس وقت بھی بہت کچھ ہو سکتا تھا ۔ لیکن حالات اس کی اجازت نہیں دیتے تھے ۔ کشا کش غم پنہاں سے فرصت ہی کہاں تھی کہ کوئی اقدام کیا جاتا ۔

تم کو بھی ہم بتائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشا کش غم پنہاں سے گر ملے

یہاں مجنوں کی تلمیح کو پیش کرکے غالب نے اسی صورت حال کی وضاحت کی ھے -

اس وقت عمل کا ماحول نہیں تھا - لیکن دلوں میں اس عمل کی خواهش ضرور تھی - حوصلہ اور ولولہ ضرور تھا - لوگ تعمیر چاھتے تھے - لیکن تعمیر صرف آرزو اور تمنا ھی تک محدود تھی - غالب نے اس کیفیت کی ترجمانی بڑی خوبی سے کی ھے -

منظر اک بلندی پر اور هم بنا سکتے
عرش سے ادھر ھوتا کاش کہ مکاں اپنا

اس شعر میں منظر، بلندی، عرش اور مکان سب علامتی حیثیت رکھتے ھیں - اور اس زمانے کی عملی زندگی کا جو حال تھا لوگ جو کچھ سوچ رھے تھے جس چیز کی انھیں آرزو اور تمنا تھی اسکو پوری طرح واضح کر دیتے ھیں -

یہ خیال غالب کے یہاں پیدا نہ ھوتا اگر ان کے پاس اپنے زمانے کی اجتماعی زندگی کے حالات کا شعور نہ ھوتا - وہ ان حالات کا پورا شعور رکھتے تھے - انھوں نے ان حالات کو پوری طرح سمجھا تھا - اس لئے انھوں نے آرزو کے چراغوں کو جلائے رکھنے ، عمل کی راہ پر گامزن ھونے اور نئی زندگی سے مطابقت پیدا کرنے کا ایک پیام بھی دیا ھے - وہ بادۂ شبانہ کی سر مستیوں میں کھو جانے کے قائل نہیں - یہ سرمستیاں انکے خیال میں اب واپس بھی نہیں آ سکتیں - اسی لئے وہ لذت خواب سحر سے اٹھنے کی طرف توجہ دلاتے ھیں -

وہ بادۂ شبانہ کی سر مستیاں کہاں
اٹھئے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

اس شعر میں حالات کے بدلنے ، پرانی زندگی کے ختم ھونے اور ایک نئی زندگی کے پیدا ھونے کی طرف واضح اشارے موجود ھیں - غالب نے یہاں صورت حال کو سمجھنے ، اس سے مطابقت پیدا کرنے اور عمل کی راہ

پر آگے بڑھنے کی طرف توجہ دلائی ھے جو اس بات کا ثبوت ھے کہ غالب کے پاس ایک واضح پیام موجود تھا ۔

یہ افکار و خیالات اس حقیقت کو واضح کرتے ھیں کہ غالب صرف اپنی ھی شکست کی آواز نہیں تھے ۔ ایک معاشرت ایک تہذیب ایک نظام کی آواز شکست بھی ان کی آواز میں شامل تھی ۔ یہ آوازیں آپس میں کچھ اس طرح ملی جلی تھیں کہ بعض اوقات انکا پہچاننا بھی مشکل ھو جاتا ھے ۔ لیکن غالب کی شخصیت اور ماحول سے دلچسپی لینے والے کو ان کی اس مخصوص آواز اور لے میں ایک اور ھی دنیا دکھائی دیتی ھے ۔

امتیاز علی عرشی

غالب اور برہان

مرزا غالب کی ادبی زندگی کا سب سے زیادہ دل چسپ ہنگامہ برہان قاطع پر تنقید ہے ۔ جو پہلے قاطع برہان اور بعد ازان 'درفش کاویانی' کے نام سے شائع ہوئی تھی ۔

اس سلسلے میں خواجہ حالی لکھتے ہیں ۔

"غدر کے زمانے میں مرزا دلی سے بلکہ گھر سے بھی باہر نہیں نکلے ۔ جونہی بغاوت کا فتنہ اٹھا انہوں نے گھر کا دروازہ بند کر لیا ۔ گوشہ تنہائی میں غدر کے حالات لکھنے شروع کئے (۱)"

جب مرزا 'دستنبو' ختم کر چکے اور اب بھی تنہائی اور سناٹے کا وہی عالم رہا اس وقت سوا اسکے اور کیا چارہ تھا کہ دوات اور قلم کو مونس اور رفیق سمجھیں اور کچھ لکھ پڑھ کر اپنا غم غلط کریں اور دل بہلائیں ۔ مرزا کے پاس اسوقت سوائے برہان قاطع اور 'دستنبو' کے کوئی کتاب موجود نہ تھی ۔ برہان قاطع کو اٹھا کر سرسری نظر سے دیکھنا شروع کیا پہلی ہی نگاہ میں کچھ بے ربطیاں سی معلوم ہوئیں ۔ پھر زیادہ غور سے دیکھا تو اکثر لغات کی تعریف غلط پائی ۔ ایک ایک لفظ متعدد فصلوں میں مختلف صورتوں سے لکھا دیکھا ۔ شعرا نے جو الفاظ بطور مجاز و کنایہ کے استعمال کئے ہیں انکا ذکر بطور مستقل لغات کے دیکھا ۔ طریقہ بیان اکثر بھونڈا اور اصول لغت کے خلاف پایا ۔ بہت سے لغات کی ایسی تفسیر بھی دیکھی جسکے معنی بالکل سمجھ میں نہ آئے ۔ مرزا نے یاد داشت کے طور پر جو مقام

---

(۱) یادگار غالب ۔ نامی پریس کان پور صفحہ ۳۷

قابل اعتراض نظر آئے ان کو ضبط کرنا شروع کیا۔ شدہ شدہ وہ ایک کتاب بن گئی۔ جسکا نام قاطع برہان رکھا گیا۔ اور سنہ ۱۲۷۶ھ میں چھپ کر شائع ہو گئی۔ پھر مرزا نے ۱۲۷۷ھ میں باضافہٗ دیگر مضامین و فوائد اسکو دوسری بار چھپوایا۔ اور اس کا نام درفش کاویانی رکھا (۱)۔''

آگے بڑھ کر فرماتے ھیں۔

''جس وقت مرزا نے قاطع برہان لکھی ھے انکے پاس اسوقت ایک قلمی برہان کے سوا کوئی فرہنگ لغات نہ تھی اور نہ کوئی اور ایسا سامان موجود تھا جسپر تخلیق لغت کی بنیاد رکھی جاتی۔ پس جو کچھ انہوں نے لکھا یا محض اپنی یادداشت کے بھروسے پر یا ذوق و وجدان کی شہادت سے لکھا (۲)۔''

مولانا مہر نے اور مالک رام صاحب نے خواجہ صاحب کے بیان کو دھراتے ھوئے سب سے پہلے یہ بتایا ھے کہ برہان قاطع کا جو نسخہ مرزا صاحب کے سامنے موجود تھا وہ چھاپے کا تھا جیسا کہ خود میرزا ھی نے صاحب عالم مارھروی کو لکھا تھا۔ نیز یہ بھی اطلاع دی تھی کہ وہ نسخہ نواب صاحب لوھارو کے ذاتی کتب خانے میں موجود (۳) ھے۔ اور اسکے حاشیوں پر مرزا صاحب کے لکھے ھوئے اشارات بھی موجود ھیں۔

پچھلے سال نواب صاحب لوھارو بالقابہ نے اپنا سارا ذخیرہ رضا لائبریری رامپور میں منتقل فرما دیا۔ تو اس میں مذکورہ بالا برہان قاطع بھی ھمارے مطالعے میں آئی۔

---

(۱) یادگار غالب نامی پریس کان پور صفحہ ۴۲ (۲) ایضاً صفحہ ۴۴

(۳) میرزا غالب نے علائی کے نام ۲ جولائی سنہ ۱۸۶۰ء کو ایک خط لکھا ھے اس میں فرماتے ھیں کہ ''برہان قاطع تم کو دے چکا ھوں،، خطوط غالب ج ۱ صفحہ ۳۲۱ - اس سے واقعے کی مزید تصدیق ھو جاتی ھے۔

یہ نسخہ سرورق کے مطابق افضل المطابع کلکتہ میں سنہ ۱۲۵۱ھ مطابق سنہ ۱۸۳۶ء میں بڑے سائز کے ۹۲۴ صفحات پر چھپا تھا - ہر صفحے میں دو کالم رکھے گئے تھے - اور کلکتیا ٹائپ میں طباعت ہوئی تھی - سرورق کا دوسرا اور اصل کتاب کا پہلا صفحہ یہ دونوں سادہ ہیں - کتاب کے شروع میں بسم اللہ کے نیچے تحریر ہے -

''محمد اسفند یار بیگ خرید نمود در سنہ ۱۲۵۱ ھجری مقام کلکتہ بقیمت بیست دو روپیہ ''

کتاب کے پہلے سادے صفحے پر بخط انگریزی لکھا ہے -

Presented to Alaooddin Khan by
Mirza Asadoollah Khan Bahadur, 1st August 1958, Loharoo.

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب نے یکم اگست سنہ ۱۸۵۸ء کو یا اس سے کچھ پہلے یہ نسخہ نواب علائی کو تحفے میں دے دیا تھا -

دوسرے صفحے پر اسفند یار بیگ کی تحریر کے دائیں طرف کے حاشیے پر لکھا ہے -

''وصول دولت فرہنگ معنوی ارتنگ مانی روز اول از محرم نخست از اگست بہ جنگ آمد سنہ ۱۲۷۶ ھجری ۱۸۵۹ ع''

میرا خیا ل ہے کہ یہ تحریر نواب امین الدین احمد خاں بہادر والی لوہارو کی ہے - وجہ یہ کہ اسفند یار بیگ کی تحریر پر چیپی لگا کر علائی نے لکھا تھا :

''بخشایندہ و بخشندہ راستایم کہ این نادرہ بہ ارمغان پدر نامور میرود، یارب چون آرزوی ہوا خواہ خیر سگال پز رفتہ باد- نامہ نگار از گنہ پیش خداوند شرمسار علاؑ والدین آمرزش خواستار''

میری دانست میں اس تحریر کی توثیق کے لئے ان کے والد ماجد نے مذکورہ بالا عبارت اپنے قلم سے حاشیے پر لکھی تھی -

اس نسخے کے حاشیوں پر اور کبھی کبھی متن کے اندر سطر کے خاتمے پر بھی مرزا صاحب نے اپنے اعتراضات یا توضیحات یا شکوک وغیرہ اپنے قلم سے لکھے ھیں - ان کی تخمینی تعداد ۳۶۱ ھے - ان میں سے تقریباً ۳۱۲ الفاظ پر لکھی ھوئی یاد داشتوں کو پہلے برہان قاطع اور پھر درفش کاویانی کے ناموں سے مرتب کرکے چھاپا تھا - صاحب عالم مارھروی کو ایک خط میں لکھتے ھیں -

''اس درماندگی کے دنوں میں چھاپے کی برہان قاطع میرے پاس تھی اس کو میں دیکھا کرتا تھا - ھزارھا لغت غلط، ھزارھا بیان لغو، عبارت پوچ، اشارات پا در ھوا -

میں نے سو دو سو لغت کے اغلاط لکھ کر ایک مجموعہ بنایا ھے اور قاطع برہان اس کا نام رکھا ھے ،،

تقریباً یہی انکا بیان ھے قاطع برہان کے دیباچے میں - مگر شاعرانہ مبالغے کو حذف کرنے کے بعد حقیقت لگ بھگ وھی ھے جو اوپر ذکر کی گئی ھے - بھر حال مرزا صاحب کے ان ابتدائی اشارات کا پڑھنا قاطع برہان کی عبارتوں کے مقابلے میں زیادہ دل چسپ نظر آیا - کیونکہ یہ قلم برداشتہ لکھتے ھوئے ھونے کے باعث ان کے جذبات کے اچھے مظہر ھیں - اس لئے آج کی صحبت میں برہان کے آخری باب پر لکھے ھوئے اعتراضات کو پیش کیا جا رھا ھے - آخری باب کو ترجیح دینے کا باعث یہ ھے کہ جیسا خود مرزا صاحب نے قاطع برہان (صفحہ ۷۸) میں لکھا ھے، برہان کے آخری باب کے بیشتر اعتراضات انھوں نے تضیع اوقات کے خیال سے چھوڑ دئے تھے -

اب آپ برہان قاطع اور قاطع برہان کی عبارتوں کو ملاحظہ فرمائیے، میں نے سہولت کی غرض سے برہان کے لئے (ب) اور غالب کے بجائے (غ) کی علامت اختیار کی ھے -

(۱) ب - (آبای علوی) کنایہ از ھفت کوکب الخ

(غ)—آبای علوی افلاک کو کہتے ھیں نہ کواکب کو۔ آبا افلاک اور امہات ، عناصر (۱)

(م) ب—(آبای گلوگیر) کنایہ از سرور و عیش جہان و کنایہ از غم دنیا و شادی کہ بجہت فوت دشمن کنند

غ— تمام جملہ مہمل ۱۲ (۲)

(م) ب—(آب خورشید) بمعنی آب زندگیست بایں اعتبار کہ آفتاب مؤثر است بجہت حیات حیوانات و او تجلی روحست برای ظہور نفس۔

غ —تمام بیان لغو (۳)

(م) ب—(آب دردل شدن) کنایہ از سرور و انتعاش در دل پیدا شدن باشد

غ—لغو

(م) ب— (آب دید جام) کنا یہ از شراب وجرعۂ شراب باشد

---

(۱)—شرفنانہ (۵۲ ب) موید الفضلاء ۱/۱۰۵ اور تحفتہ السعادہ (ص ۴۷) میں آبای علوی سے کواکب سبعہ (سات سیارے) ھی مراد لئے ھیں ۔ اور کشف اللغات (۱/۶) میں لکھا ھے کہ ''در اصطلاح حکما آبا افلاک وانجم را گویند،،

۲—موید الفضلاء (۱/۳۳) میں ھے :— ''آبائی گلوگیر، کنایت از سرور جہانست، تنعم بران است، کزال القنیہ وفیہ ایضاً، آبائی گلوگیر، نعیم دنیاوی و شادی کنندہ کہ در فوت حیات دشمن کنند و درادات الفضلا آوردہ است ۔ آبائی گلوگیر ۔ نعیم دنیاوی و آں شادی کہ بر فوت شدن و نعمت دشمن و حیات او کنند۔،، مگر تحفتہ السعادہ (ص ۶۲) میں لکھا ھے :— ''آب گلوگیر، ھر دو کاف فارسی نعمت ھائے دنیاوی و شادی کہ از مرگ خصم حاصل شود،، میری دانست میں آبا کی جگہ 'آب، ھی درست ھے اور یہ غلطی کسی کاتب کی نادانی کا نتیجہ معلوم ھوتی ھے ۔

(۳) ملاحظہ ھو موید الفضلا (۱/۳۴)

غ—لغو (۱)

(م) ب—(آبذان) باذال نقطه دار بمعنی مستحق و سزاوار و در خور باشد و خاندان را نیز گویند۔

غ—غلط (۲)۔

(م) ب—(آب رو) بکسر ثالث کنایه از تری و تازگی و روشنائی باشد و بسکون ثالث شخصی که پیش بزرگان قدری و اعتباری داشته باشد۔

غ—شخص کو آبرو نه کهیں گے ۔ قدر و اعتبار کو آبرو کهیں گے ۔ (۳)

(م) ب—(آب ریخت) یعنی خجل شدو شرمنده گردید ۔

غ—و منزل شد۱۲

(م) ب—(آب عرق) کنایه از گلاب است ۔

غ—دروغ (۴)

(د) ب— (آب گردش) کنایه از چاروائی تیز رو و خوش رفتار باشد (۵) (جی)

---

(۱)—موید الفضلا (۱/۶۳) میں آب دیدهٔ جام ہے ۔ میرا خیال ہے که یہاں بھی کاتبوں نے ''دیده،، کو ''دید،، لکھ کر اصطلاح کے گلے پر چھری چلائی تھی ۔

(۲)—موید الفضلا (۱/۶۸ اور ۷۰) میں اس لفظ کو دیکھا جا سکتا ہے ۔

(۳)—موید الفضلا (۱/۸۸) میں فرهنگ علمی کے حوالے سے یه لغت لکھا گیا ہے ۔

(۴)—ملاحظه هو موید الفضلا (۱/۹۴)

(۵)—یه فرهنگ جهانگیری کا لغت ہے ۔ رشیدی (ص ۳۱) نے بھی اسے دهرایا ہے ۔

غ—آب گردش عبارت از تبدیل مکان بهر آب و هوا -۱۲

(م) ب — (آب ماه) کنا یه از روشنی ماه باشد

غ—دروغ (۱)—

(م) ب —(آب درنگ) بمعنی شراب انگوری و اشک خونی کنایه از طراوت و تازگی باشد -

غ—صرف طراوت و تازگی کو کہیں گے شراب انگوری و اشک خونی کو نہ کہیں گے -

(م) ب—(آتش نیستان)——کنایه از رونق بہار باشد

غ—دروغ (۲)

(م) ب—(آتشین داغ) بمعنی داغ آتشیں -

غ—سبحان اللہ کیا لغت ہے (۳)

(م) ب — (آتشین یا فتن) کنایه از رونق و رواج بہم رسانیدن باشد

غ—دروغ و لغو ۱۲

(م) ب—(آراک) بروزن چالاک، جزیره، یعنی خشکی میان دریا را گویند

غ — آداک بدال است نه به را -۱۲

(م) ب—(آرامیدن) بمعنی آرام گرفتن و ساکن شدن و قرار گرفتن و نجسپیدن و گردانیدن ودادن باشد

---

(۱)—ملاحظه هو موید الفضلا (۱ | ۹۵) اور تحفته السعاده (ص ۱۷) جہاں اس کے معنی روشنی ماہ ہی لکھے ہیں (۲)- کشف اللغات (۱/ ۱۰۰) موید الفضلا (۹۱) اور تحفته السعاده (ص/ ۶۲) میں یہی لکھا ہے - (۳)—ملاحظہ ہو موید الفضلا (۱/ ۴۷)

غ—سبحان اللہ کیا لغت ہے(۱) ۱۲

(م) ب—(آرد بیز) غربال را گویند

غ—لذت مصنوعی(۲) ۱۲

(م) ب—(آرزو) کشش خاطر باشد ۔ و بعربی شہوت گویند ۔

غ—سبحان اللہ کیا لغت ہے (۳) ۱۲

(م) ب—(آریدن) بروزن باریدن بمعنی آرائش کردن و آراستن باشد

غ—محض غلط

(م) ب—(آزا) بمعنی برابر ست ۔ چنانکہ گویند در آزای فلاں کار یعنی در برابر فلاں کار ویکسر اول در عربی ھمیں معنی دارد ۔

غ— ازا لفظ عربی ہے فارسی میں آزا ان معنوں میں ہرگز نہیں (۴) ۱۲

(د) ب — (آزادگان) جمع آزادہ است بمعنی اصرار و جوانمردان و اولیا و حلال زادگان ۔

غ — سبحان اللہ کیا لغت ہے (۵) ۔

ب — (آزردن) بفتح ثالث بروزن وا کردن مخفف آزاریدن است یعنی دیگری را آزاردادن و خود آزردہ شدن ۔

---

(۱)—ملاخط ہو موید الفضلا (۱/۷۱) (۲)—ملاحظہ ہو موید الفضلا (۱/۳۹) (۳)—ملاحظہ ہو شرف نامہ (۴۸ الف) موید الفضلا (۱/۸۸) اور تحفتہ السعادہ (ص ۴۶) موید سے معلوم ہوتا ہے کہ اداۃ الفضلا میں بھی اس کا مذکور ہے(۴) —یہ لغت تحفتہ السعادہ (ص ۴۵) میں مذکور ہے(۵)—ملاحظہ ہو شرف نامہ (۴۱ب) کشف اللغات (۱/۴۰۱) اور موید الفضلا (۱/۷۷)۔

غ—سبحان اللہ (۱) ۱۲

(م) ب—(آزرده) بمعنی تنگ آمد و تند شده باشد. و بمعنی رنجیده هم آمده است

غ—یہ لغت سوائے جامع کے کسی کو کاہے کو معلوم ہوگا (۲) ۱۲

(م) ب— آزمائش بمعنی تجربه باشد

غ—سبحان اللہ کیا لغت غیر مشہور ہے (۳) ۱۲

(م) ب—(آستانه) پیش در و چوب پیش درخانه و مدفن اولیا اللہ باشد

غ—کیا عمدہ لغت ہے (۴) ۱۲

(م) ب—(آسودن) بروزن آلودن بمعنی راحت رسانیدن وراحت گرفتن باشد و کنایه از مردن هم هست

غ—صاحب یہ تو میں جانتا ہوں کہ کوئی نہ جانتا ہوگا (۵) ۱۲

(م) ب—(آشتی) ترجمهٔ صلح است

غ—واہ وا کیا نیا لغت ہے (۶) ۱۲

(م) ب—(آشفتن) بمعنی شوریدن و شورانیدن و شوریده شدن جنبا نیده شدن باشد

---

(۱)—ملاحظہ ہو شرف نامہ (۴۲ الف) کشف الغات (۱/۴۰۱) اور موید الفضلا (۱/۷۱) (۲)— یہ لغت موید الفضلا (۱/۹۲) میں القنیہ سے نقل کیا گیا ہے (۳)— یہ لغت موید الفضلا (۱|۴۳) میں شرف نامہ سے نقل کیا گیا ہے ۔ نمبر (۴)— موید الفضلا (۱|۹۲) میں القنیہ سے نقل کیا گیا ہے ۔ موید الفضلا (۱/۷۲) میں اس کا ذکر ہے (۱/۴۳،۹۶) بحوالہ اداۃ الفضلا و شرف نامہ ۔

۶— — موید الفضلا (۱/۱۰۶) تحفتہ السعادہ (صف-۵۲) اور فرہنگ رشیدی (ص ۶۰) ملاحظہ ہوں

غ—یہ لغت کسکو معلوم ہوگا (۱) ۱۲

(م) ب —(آغشتن) بمعنی تر کردن و تر شدن و آلودہ کردن و آلودہ شدن باشد

غ— نہ صاحب یہ لغت تو کسی نے سنا بھی نہ ہوگا (۲)

(م) ب—(آفتاب زرد) بکسر بای ابجد ـ کنایہ از خربزہ و شراب زعفرانی باشد

غ—لا حول ولا قوۃ الا باللہ (۳)

(م) ب—(آفتاب سادہ) کنایہ از سلیمانست

غ—معاذ اللہ (۴)

(م) ب—(آفرید گار) باکاف فارسی پیدا کنندہ موجودات از عدم باشد

غ—اس لغت کو کون جانتا ہوگا (۵)

(م) ب—آگاہ با کاف فارسی بروزن ناگاہ بمعنی خبردار و با خبر شد و بمعنی دانش ہم ہست و آ گاہی خبرداری و باخبر بودن باشد

---

(۱)—کشف اللغات (۱ / ۱۰۵) موید الفضلا (۱ / ۲۷) اور رشیدی (ص - ۶۰) دیکھئے -

(۲)—یہ لغت شرف نامہ (۲۴ الف) موید الفضلا (۱ / ۹۷) کشف اللغات (۱ / ۱۰۶) اور رشیدی (ص ۶۳) میں بھی مذکور ہے -

(۳)— موید الفضلا (۱ / ۲۵) بحوالہ اداۃ الفضلا و(۱ / ۸۸) برون حوالہ و تحفۃ السعادہ (ص ۱۷) - یہ بھی عرض کردوں کہ یہ میرزا صاحب نے عربی املا کے خلاف قوۃ کو قوت اور باللہ کو با اللہ لکھا ہے -

(۴)— موید الفضلا (۱ / ۹۷) سے معلوم ہوتا ہے کہ لغت آفتاب ساوہ (بواو) ہے اور ساوہ ایک مقام کا نام ہے سادہ (بالدال) سہو کتابت ہے -

(۵)—شرف نامہ (۴۲ الف) موید الفضلا (۱ / ۳۲)

غ—اس سے کون آگاہ ہوگا (۱)

(د) ب—(آگرہ) بروزن باکرہ نام شہریست کہ بعد از دھلی پائی تخت ہندوستانست ۔

غ—یہ لغت ہے کام کا ۔۱۲

(ر) ب —(آلودن) ۔ بروزن پالودن بمعنی آلودہ و ملوث شدن و کردن باشد

غ—نہ صاحب یہ مصدر کسی کو معلوم نہ ہوگا۔۱۲

(م) ب—(آلو سیہ) میوہ است ترش مزہ و سیاہ رنگ در ہند و بہ ہندی جامن گویند و درخت آن رانیز گفتہ اند ۔

غ—آلوسیہ ۔ جامن ولایت میں کاہے کو ہے جو اس کا نام ہو ۔ ہاں الوی سیاہ بطریق ظرافت کبھی کسی نے کہا ہو تو کہا ہو (۲)

(م) ب—(آمدہ گیر) یعنی آمدن او راتصور کن و آمدن او قبول کن و ازدل بپذیر، برسبیل دعا ۔

غ—واہ، واہ، واہ، واہ (۳) - ۱۲

(م) ب—(آمیختن) مخلوط شدن و مخلوط کردن دو چیز یا زیادہ باشد بہم (آمیختہ) بروزن او یختہ ترجمہ' مخلوط و ملحق است ۔ (آمیزش) بمعنی الحاق باشد

غ—یہ تین لغت کہاں سے لایا ۔ آفرین (۴) ۱۲

نمبر (۱) تحفتہ السعادہ (ص ۹۴ و ۹۵)

نمبر (۲) موید الفضلا (۱/ ۹۷) نمبر (۳) ایضاً (۱/ ۳۳)

نمبر (۴) ایضاً (۱/ ۷۴ و ۹۸)

(م) ب—(آن که را) یعنی، آن که اورا - هم چنانکه هر کرا یعنی هر که اورا -

غ—یہ تو صاحب بغیر شرح کے کبھی کوئی نہ سمجھتا -۱۲

(م) ب—(آهن سنجر نخورد) یعنی زخم و شکنجه سنجر نخورد- وبسیاست او نه پیوست و زحمت او رانکشید -

غ—واہ کیا کہنا ہے (۱)-

(م) ب—(آهو گان) باکاف فارسی بروزن خالو جان بمعنی آهو بچگان باشد

غ—لاحول ولا قوت (۲) ۱۲

(م) ب—(آهوی نر بفتح نون کنایه از ابری بسپیدی و سیاهی مایل شد)

غ—خبط جنون -۱۲

(م) ب—(آی) بسکون تحتانی امر بامدن باشد - یعنی بیا و ترکان ماده را گویند

غ—ترکان ماده را آی نگویند - ماه را می گویند (۳)

(م) ب—(آیندگان) موجود شوندگان - و کسانی که بایں عالم می آیند

غ—نیا لغت ہے - ۱۲

نمبر (۱) موید الفضلا (۱/ ۲۵) میں بحوالۂ اداۃ الفضلا نقل کیا تھا -
نمبر (۲) ملاحظہ ہو کشف اللغات (۱/ ۱۲) اور موید (۱/ ۵۷) یہاں ہی مرزا صاحب نے قوۃ کو قوت لکھ دیا ہے -
نمبر (۳) یہ کاتب کی غلطی ہے کہ اس نے ماہ کو مادہ کر دیا - ورنہ ہمارے نسخہ برہان کے حاشیہ پر ''ماہ،، ہی لکھا ہے -

(م)ب— (آئینه مقصود) اشاره بآیهٔ - اطیعوا اللہ و اطیعو الرسول و اولی الامر منکم -

غ—ادعای محض - (۱)

(م) ب—(آئینه یوسفاں منش) کنایه از آفتا بست

غ—غلط در غلط - (۲)

(م) ب—(ابلق چشم) کنایه از چشم سیاه و سفید باشد

غ—کون سی آنکھ ہے جو سیاہ و سفید نہیں ہے (۳) - ۱۲

(م) ب—(ابنای دهر و ابنای روزگار) مرد عالم را گویند

غ—صاحب، یہ تو کسی کو معلوم نہ تھا (۴)-۱۲

(م) ب—(ازرق) بمعنی آسمانست و آنرا چرخ ازرق هم میگویند

غ—ازرق - بمعنی آسمان غلط - البته صفت آسمانست -۱۲

(م) ب—(افراز) بمعنی افزار است که کفش و پاپوش و ماند ان باشد -

---

نمبر (۱) موید الفضلا (۱ ۲۵) سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لغت آئینہ نہیں ہے بلکہ آیت مقصود ہے -

نمبر (۲) ملاحظہ ہو موید الفضلا (۱/۳۴) اور تحفتہ السعادہ (ص ۶۴) مگر ''منش،، کے بجائے موید میں ''وش،، اور تحفے میں ''بینش،، ہے -

نمبر (۳) موید الفضلا (۱/۶۳) میں ہے- ابلق چشم مرکب چشم با ضافت صفت سوی موصوف بابلق بدهن که چشم سیاه و سفید است -

نمبر (۴) ملاحظہ ہو موید الفضلا (۱/۲۹ و ۳۳ بحوالہ اداۃ الفضلا) اور تحفتہ السعادہ (ص ۶۱) -

غ—افزار۔ افزار را هرگز افراز نگویند ۔ و تنها افزار اسم کفش نیست بلکه پا افزار است ۔ افزار بمعنی آله چنانکه در عوام اوزار مشهور است ۔ و این را منسوب به پا کرده ۔ پا افزار گویند ۔ و افراز صیغهٔ امر استاز افراشتن (۱) ۱۲

(م) ب—(اامان) دو امام اند که هر یک در هر قطب اند ۔ یکی رانام عبدالرب است و مسند وزارت او بردست راست قطب است ۔ داد ناظر ملکوت است ۔ و دیگری عبدالملک نام دارد ۔ و مسند وزارت اوبر دست چپ است ۔ داد ناظر است در ملک و نام قطب عبد اللہاست ۔

غ—اامان ۔ تثنیه نیست که حکیم دکنی اینقدر شرح کشاف آورده ۔ اامان جمع امام است و این را اطفال نیز میدا نند ۔ (۲) ۱۲

(م) ب—(امشاش) ترجمه قیاس است

غ— سند می خواهد

(م) ب—(امید) بضم اول۔ ترجمهٔ رجا باشد و چشم داشتن از کسی ۔

غ—یارو واسطے خدا کے یه کیا لغت ہے(۳) ۔

نمبر (۱) یه مرزا صاحب کے نسخے کے کمپوزیٹر کی غلطی ہے ۔ ورنه برهان کے ایک قلمی نسخے کے ملحقات میں اور کپتان راهک کے مطبوعه نسخے کے تتمے میں بھی لغت (افزار پا) لکھ کر اس کے معنی (افزار پا) ہی لکھے ہیں ۔

نمبر (۲) یه لغت کشف اللغات (۱/۱۰۹) سے ماخوذ ہے ہاں کاتب کی غلطی سے (هر یک وزیر قطب اند کی جگه (هر یک در هر قطب اند) چھپ گیا ہے ۔

نمبر (۳) موید الفضلا (۱/۲۷) بحوالهٔ اداة الفضلا ۔

(م) ب —(انجامیدن) تمام شدن و بانتها و بآخر رسیدن کار
ها باشد

غ—واه وا یہ لغت کون جانتا تھا (۱) ۱۲ -

(م) ب—(انگشت کہیں) بمعنی انگشت کو چک است کہ
بعربی خنصر گویند ۔

غ—لاحول ولا قوۃ الا باللہ ۱۲

(م) ب—(انگشت مہین) یعنی انگشت بزرگ کہ انگشت میانیز
باشد و بعربی وسطی گویند ۔

غ—استغفر اللہ -۱۲

(م) ب—(بیلاق) بکسر اول و سکون ثانی مجہول و لام الف
و قاف ساکن جا ی سرد کہ بجہت تابستان در زیر زمین کسنند ۔

غ—غلط در غلط ۔ یہ لفظ ترکی ہے بمعنی چھاونی کے ۔ مگر
جو گرمی کے موسم میں چھاؤنی بناتے ھیں اوسکو قشلاق کہتے ھیں -
اور جاڑوں کی چھاونی کو بیلاق کہتے ھیں ۔ دونوں تحتانی ۔ با ی
موحدہ کہاں سے آئی (۲) ۱۲ -

(م) ب—(بیلفخت) بکسر اول و فتح ثانی سکون لام و فای
مفتوح بخای نقطہ دار زدہ و تا ی قر شت ۔ ماضی الفختن است ۔ یعنی
بہم رسانید و جمع کرد ۔ و اندوخت و آورد ۔

نمبر (۱)—ملاحظہ ھو شرف نامہ (۶۴ ب) کشف اللغات (۱ / ۱۱۰)
مؤید الفضلا (۱ / ۸۳) اور رشیدی (ص ۷۷)

نمبر (۲)—ملاحظہ ھو مؤید الفضلا (۱ / ۹۴) مگر وھاں بای فارسی
ہے ۔

غ—(بیلفخت) لفظ اصلی نہیں ہے ۔ الفختن کا ماضی الفخت ہے ۔ بای زایدہ کو جوہر لفظ میں کیا دخل ہے ۔ لفظ اصلی رفت ہے نہ کہ برفت (۱) — ۱۲

(م) ب—(پاپوش) آنجہ بر پاپوشند و برہ روند

غ — کہو صاحب اس لغت کو دنیا میں کون نہ جانتا ہوگا (۲)

(م) ب—(پاختہ) بروزن باغچہ ۔ چھچۂ بلند و طناب استادان بنا را گویند ۔

غ — سند می خواہد (۳) -۱۲

(م) ب—(پاراج) ۔ بروزن تاراج ، آنجہ بجہت مہمان بعنوان پیشکش آورند ۔

غ—سند می خواہد -۱۲

(د) ب—(پاستان) بمعنی باستان ۔ بیای تازیست کہ متقدمین و اولین باشد ۔

غ—پھر بای فارسی میں کیوں لکھا -۱۲

ب۔(پالانیدن) بمعنی فشردن باشد ۔ (پالانندہ) بمعنی افزانیدہ و افزوں کنندہ باشد ۔

غ—یہ بھی پالودن ہے ۔نہ پالا ندن ۔ اور بمعنی صاف کرنے کے ہے ۔ نہ بمعنی فشر ۔ ۔۔۔۔ رے معنی فشردن لکھتا ہے اور فاعل کے معنی افزایندہ ۔ اے تیرا کھوج مٹے ۔

(م) ب—(پائی افزاہ) کنایہ از افزایندۂ مرتبہ باشد ۔

نمبر (۱) ملاحظہ ہو مویدالفضلا (۱/۱۱۸) جہاں بحوالہ زفان گویا اسے لکھا گیا ہے ۔

نمبر (۲) موید الفضلا (۱/۲۰۶) بحوالۂ القنیہ وشرف نامہ (۹۲ الف)

نمبر (۳) ملاحظہ ہو موید الفضلا (۱/۲۲۱) مگروہاں پاخسہ (باسین) ہے ۔ برہان کے ملحقات کے کاتب نے غلط لکھ دیا ہے ۔

غ—ہائے ہوز غلط - یا افزا - یا افزای - اور پھر ہای افزای
تمسخر محض - پایہ افزا اور پایہ افزای ہے - ۱۲

(م) ب—(پختن) بمعنی پختہ شدن و ساختن و مہیا کردن
باشد -

غ—ہر آمد نامہ پڑھنے والا جانتا ہے حکیم دکنی کا کیا
احسان (۱) -

(م) ب—(پائیر) بروزن جاگیر مدت بودن آفتاب در برج سرطان -
(پایر) بروزن سایر مدت ماندن آفتاب باشد در برج سرطان -

غ—پائیر بروزن جاگیر و پائر بروزن سائر - لفظ غلط معنی غلط -
اصل یہ ہے کہ پائیز بروزن کاریز اور پائز بروزن جائز - فصل خزاں
کو کہتے ہیں کہ جسکا برگریز بھی نام ہے - اور وہ تین مہینے یہ
ہیں - میزان، عقرب، قوس سرطان، اسد، سنبلہ، یہ تین مہینے تابستان کے
ہیں اور اس کو تموز بھی کہتے ہیں - زای نقطہ دار کی جگہ رای بے
نقط ے آیا اور ''مدت بودن آفتاب در برج سرطان،، اوس کے معنی لکھے -
سرطان کے آفتاب کے مہینے کو ''تیر ماہ،، کہتے ہیں - اور اسد
کے آفتاب کے مہینے کو ''مرداد،، اور سنبلہ کے آفتاب کے مہینے کو
''شہر یوز،، کہتے ہیں - میزان کے مہینے کو ''ماہ،، کہتے ہیں
عقرب کے مہینے کو آبان اور قوس کے مہینے کو آزر اور آزار کہتے
ہیں - پائیز اور پائز فصل کا نام ہے اور فصل تین مہینے کی ہوتی
ہے - پائیز اور پائز کو پائیر اور پایر لکھتا ہے اور ایک مہینے کا نام
بتایا ہے اور مہینا بھی وہ کہ جس مہینے میں آفتاب سرطان کا ہو -
فاعتبرو (۲) ۱۲

نمبر (۱) ملاحظہ ہو شرف نامہ (۹۴ الف) اور موید الفضلا (۱ / ۲۱۵)
نمبر (۲) یہ لغت کسی نے شرف نامہ (۸۸ الف) سے اخذ کیا ہے -
اس کے الفاظ یہ ہیں ''پایر وزن ایر، مدت ماندن آفتاب در برج سرطان کہ
فارسیان یک ماہ شمرند و تیر ماہ گویند،، یہاں یہ عرض کر دوں کہ میرزا

(د) ب—(لشکر) سپاه ـ و عسکر معرب آن (بم) (لشکر شکن) شکنندۂ لشکر ـ (لشکر گاه) جای لشکر باشد (لشکر کشیدن) بمقابله مستعد جنگ شدن ـ (لشکری) سپاهی ـ

غ — واسطے خدا کے یارو یه پانچ لغت لشکر و لشکر شکن و لشکر گاه و لشکر کشیدن و لشکری کس کی تعلیم کے واسطے لکھے ھیں ـ مردوں میں کوئی عامی کوئی بازاری نه ھوگا جو اوس کے معنی نه جانتا ھو گا ـ لشکر کو لغت ٹھہرانا اور عسکر کو اوسکا معرب جاننا ـعسکر و عساکر و معسکر لفظ معرب پر اتنے اشتقاقات عارض نہیں ھوتے(۱) یا رب یه کون شخص تھا اور پھر کیا خوش قسمت تھا که اس کے عیوب کو کوئی نہیں دیکھتا ـ

(د) ب—(مودادن) و موفرستادن ـ چون کسی برزنی عاشق شود و وصالش دست ندھد ـ موی در کاغذ پیچیده توی صندوق گذاشته پیش معشوقه می فرستد و غرض ازان اعلام ضعف و نحافت بود در محنت ھجر ـ اگر معشوقه ھم مشتاق او باشد ـ اوھم در جواب مو میفرستد۔بم ـ

صاحب نے ''ناعبترو،، عربی املا کے لحاظ سے لکھا ھے انھیں واو کے آخر میں ایک الف بھی لکھنا چاھئے تھا ـ

نمبر (۱) میرزا صاحب کا یه خیال بھی درست نہیں ھے که معرب پر زیادہ اشتقاقات عارض نہیں ھوتے ـ رھا عسکر کا معرب لشکر ھونا تو یه لغت ملحقات میں ' بہار عجم، سے اضافه کیا گیا ھے اور اس کے مخفف (بم) کو آخر میں لکھ بھی دیا گیا ھے۔ پھر بھی میرزا صاحب بے چارے دکنی ھی کو مورد الزام ٹھہرا رھے ھیں ـ باقی واقعه یہی ھے که عسکر معرب لشکر ھے۔ بعض کے نزدیک یه یونانی لفظ کا معرب ھے ـ ملاحظه ھوکتاب الالفاظ الفارسیه العربه ص۱۱۴

غ—واهیات (۱) ۱۲

(د) ب—(نالش) بروزن مالش بمعنی فریاد کردنست - مع

غ—نالش - یہ لغت تو میں قسم کھاتا ہوں کہ کسی کو معلوم نہ ہوگا (۲)

ب—(نالیدن) گریہ کردن باشد - مع

غ—محض غلط - محض جھوٹ - نالیدن فریاد کرنا ہے - گریہ کردن کیسا - ۱۲

(د) ب—(وطن) بالتحریک - جا ی بودن و اقامت کردن مردہ - بم - (وقت) ہنگام -

غ—وطن اور وقت کیا عمدہ دو لغت ہیں کہ کسی کو معلوم ہوں گے (۳) -

(د) ب—(وہم) بالفتح رفتن دل بسوی چیزی بی قصد آن و گمان بغلط بردن و صاحب این حالت راوہمناک گویند - بم -

غ—وہم اور وہمناک، یا رب، یہ دو لغت اس شخص نے کہاں سے بہم پہونچائے (۳) ۱۲

(د) ب—(ہمہ) بمعنی تمام -

غ—ہمہ بمعنی تمام یہ نہ سمجھاتا تو کون جانتا -۱۲

(د) ب—(ہیزم) چوب را گویند کہ برای سوختن بکار برند - و انرا ہیمہ ہم می گویند - می -

---

نمبر (۱) یہ لغت بھی بہار عجم کا ہے -

نمبر (۲) یہ لغات برہان کے نہیں ہیں اور نہ ملحقات کے ہیں جیسا کہ اشارۂ (مع) سے ظاہر کر دیا گیا ہے میرزا محمد شفیع شیرازی کے بتائے ہوئے ہیں -

نمبر (۳) یہ الفاظ مرتبین نے بہار عجم سے اخذ کئے ہیں جیسا کہ کہ اشارۂ (بم) سے واضح ہے -

غ—هیزم و هیمه خدا جانے یه شخص کتنی مدت پارس میں رہا ہے که یه لغت اس کو معلوم ہیں (۱)

(د) ب—(یاستن) بمعنی طاقت و توانای - ری -

غ—یاستن غلط یارستن ہے - به فتحهٔ رای قرشت (۲) -

(د) ب—(یا قوت) در سکندری است بمعنی آه و ناله و بخاطر میرسد که تصحیف یارب خواهد بود - مل

غ—یا قوت کی تصحیف یا رب - سبحان الله (۳) ۱۲

ب—(یحیی برمکی) نام جوانمردی است معروف - مل -

غ—لاحول ولا قوت (۴)

ب—(فن) فضل مولی خان

غ—سبحان الله - میر فضل مولی که خود را در بنگاله فضل مولی خان گویانده بود با آنکه ریخته نمی دانست گفت - در زباندانان فارسی شمرده می شد - خرس در کوه بو علی سینا -۱۲

نمبر (۱)—یه لغت مرتبین نے مننسکی کی کتاب سے اخذ کیا ہے -

نمبر (۲)—یه لغت اشارهٔ (ری) کے مطابق فرہنگ رشیدی سے ماخوذ ہے - اور رشیدی میں "یارستن" ہی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے که یه کتابت کی غلطی سے یاستن بن گیا ہے -

نمبر (۳)—یہاں بھی میرزا صاحب سے چوک ہو گئی ہے- انہیں "یارب کی تصحیف یا قوت" لکھنا چاہئے تھا - نیز یه بالیقین "یا رب" ہی کا بگاڑ ہے - کیونکه اشارهٔ (مل) کے مطابق اس لغت کو مدارالافاضل سے لیا گیا ہے اور مدار (۳۹۹ ب) ہی میں نہیں شرف نامه (۴۰۱ الف) موید الفضلا (۲ / ۲۷۷) اور تحفته السعاده (ص ۴۴۶) میں بھی "یا رب" کے معنی آه و ناله بھی لکھے ہیں -

نمبر (۴)—یه لغت بھی مدار الافاضل سے ماخوذ ہے چناچه مدار (۴۰ ب) کے علاوه موید الفضلا (۲ / ۳۸۶) اور کشف اللغات (۱۲۶۴) میں بھی موجود ہے -

یہ تھے میرزا صاحب کے اعتراضات برہان قاطع کے آخری باب پر - مناسب ہے کہ میں بھی چند باتوں کا اظہار کر دوں -

(۱) برہان قاطع کو مولف نے ۲۹ گفتاروں پر مرتب کیا ہے اور ہر باب کے عنوان میں ان لغات کی تعداد لکھ دی ہے - جو اس گفتار میں مذکور ھیں - چنانچہ ۲۹ ویں گفتار کے عنوان میں بھی وہ کہتا ہے -

''گفتار بیست و نہم از کتاب برہان قاطع در لغات متفرقہ محتوی برھفتاد و یک لغت و کنایہ '' -

ملاحظہ ہوں اس کتاب کے قلمی نسخے - لیکن مطبوعہ نسخے میں مصحح نے اس عبارت کو بدل کر یوں لکھا ہے :

''تتمہ محتوی بر گفتار بیستم از کتاب برہان قاطع در لغات متفرقہ و مشتمل بر لغات و کنایات کہ بملحقات برہان قاطع شہرت دارد - مع بعضے لغات و کنایات کتب دیگر کہ احوالش در مقدمتہ الطبع مرقوم گشت (۱)''

مقدمہ طبع تو اس کتاب میں ہے نہیں البتہ سرورق میں ارشاد فرمایا ہے :

''برہان قاطع تالیف ابن خلف التبریزی محمد حسین المتخلص برہان ، مشتمل بر لغات فارسی ——— و دیگر فوائد کتب لغات دیگر با تتمہ' آن کہ بملحقات برہان قاطع شہرت دارد- اضعف العباد——— محمد اعلم لکھنوی آنرا بطرزی کہ کپتان روبک صاحب بعد تصحیح و ترمیم طبع نمودہ بودند - مگر گفتار بیست و نہم کہ متضمن لغات متفرقہ بترتیب علیحدہ مابین اصل کتاب و ملحقات بود- و بعدم اہتمام طابعین سابقین بمحل خود واقع نبود - و ازین سبب مردمان بلحاظ ترتیب از مضمونش بہرہ مند نبودند - لہذا آنرا بترتیب حروف در ملحقات مندرج نمودہ———''

---

(۱) برہان قاطع ص ۳۲

سرورق کی عبارت میں کپتان روبک صاحب کے اہتمام سے چھپے ہوئے جس نسخے کا حوالہ دیا گیا ہے وہ رضا لائبریری میں محفوظ ہے۔ یہ نسخہ مولوی کرم حسین بلگرامی میر منشی تفریق عربی و فارسی اور چند دیگر اہل علم کی مدد سے مرتب کرکے روبک نے سنہ ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۸ء) میں طبع خانہ ہندوستانی کلکتہ سے کلکتیا ٹائپ میں چھاپ کر شائع کیا

اس کے شروع میں چودہ صفحوں کا مقدمتہ الطبع مولوی کرم حسین کا لکھا ہوا ہے۔ جس میں برہان قاطع کی اہمیت اس کے عام نسخوں کا غلط ہونا، کپتان تامس روبک صاحب کا اس کے صحیح نسخے کی اشاعت کی طرف توجہ کرنا، اس کے لئے کئی اہل علم کو آمادہ کرنا، ۱۳ نسخوں سے مقابلہ کرکے ایک نسخہ تیار کرنا، ان نسخوں کی تفصیل اور ان کتابوں کی فہرست جن سے ملحقات کے سوا اور بہت سے لغات انتخاب کرکے تتمے میں درج کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد ان زباندانوں کے مجمل حالات جن سے ترتیب میں مدد لی گئی تھی اور سب کے آخر میں مخففات اسمای کتب کی فہرست مندرج ہے۔

اس نسخے میں برہان کی گفتار بیست و نہم اتنے ہی لغات پہ مشتمل ہے جتنے مولف نے درج کئے تھے۔ ملحقات کو جو برہان کے چار قلمی نسخون کے حاشیون پر مندرج ملے تھے دوسری متعدد کتابوں کے بہت سے کارآمد الفاظ کے ساتھ مولوی نظام الدین حیدر سے جمع اور مرتب کراکے آخر میں شامل کر دیا اور اس کا نام تتمہ رکھا۔

مولوی محمد اعلم لکھنوی نے اسے شائع کیا تو گفتار بیست و نہم اور تتمے کو ایک جگہ کر دیا۔ اور سرورق کی عبارت میں اسے ظاہر بھی کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس حصے کے لغات کی تعداد ۱۷ سے بڑھکر ۳۸۵۰ ہو گئی اور آئندہ کے لئے مولف برہان کے ذمے ان ہزارہا الفاظ کی صحت و عدم صحت کا بار بھی آ پڑا جو اسنے نہیں لکھے تھے۔ چنانچہ اس دھوکے میں آ کر میرزا صاحب نے بھی تتمے کے اعتراضوں کا رخ محمد حسین دکنی ہی کی طرف پھیرا ہے اور ان مدارج سے بخوبی واقف

نہ ہونے کی بنا پر اس کو ہدف ملامت بنایا ھے - حالانکہ ان میں سے ایک لفظ بھی اس کے ۱ے لغات میں نہیں ھے - میں نے سہولت کے پیش نظر ملحقات کے الفاظ سے پہلے (م) اور دوسری کتابوں سے ماخوذ الفاظ سے پہلے یہ نشان (د) لکھ دیا ھے -

(۲) گو یہ لغات برہان کے نہیں ھیں مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ سب جعلی اور ناقابل تسلیم ھیں - جیسا کہ میں نے حاشیوں میں تشریح کر دی ھے - ان میں سے اکثر دوسری مشہور کتابوں سے ماخوذ ھیں - جن کے حوالے مجھے سر دست نہیں مل سکے ھیں - وہ بھی یا تو کتابوں میں سے لئے گئے تھے اور یا سید علی شیرازی متخلص بہ نیاز اور حاجی میرزا محمد شفیع شیرازی جیسے اھل زبان کے بتانے پر درج ہوئے تھے - ان اعتراضوں کے لکھتے وقت مرزا صاحب گھر میں بند تھے اور ان کے پاس لغت کی کوئی بھی کتاب نہ تھی - اس لئے انہیں ایسے الفاظ کے شامل کرنے ہر معذور سمجھنے جو دوسری کتابوں کے اندر موجود ھیں - اور اپنی جگہ صحیح بھی ھیں - لیکن ان الفاظ پر دکنی کو برا بھلا کہنا جو ایسی کتابوں سے لئے گئے تھے جو اس کے بعد لکھی گئی ھیں جیسے بہار عجم وغیرہ قابل در گزر نہیں ھے - نیز جب انہوں نے ان ابتدائی اشاروں کو کتابی شکل میں مرتب کرکے شائع کیا تھا اس وقت تحقیق کے تمام ذرائع ان کی دسترس میں تھے یا آ سکتے تھے - لہذا انکا ایسے لفظوں پر صاحب برہان کو مطعون کرنا بھی یقیناً قابل اعتراض ھے جو اپنی جگہ صحیح اور دیگر کتب متقدمین میں بھی موجود ھیں-

(۳) میرزا صاحب کے ان اعتراضوں سے یہ مترشح ہوتا ھے کہ ان کی رائے میں لغت کے اندر مشہور الفاظ کو شامل نہیں کرنا چاھئے - شاید میں ھی نہیں مجھ سے زیادہ علم اور تجربہ رکھنے والے اصحاب بھی اس امر میں ان سے اختلاف کریں گے - چنانچہ ان کی یہ رائے عملاً کسی مرتب لغت نے بھی قبول نہیں کی ھے - آپ انگریزی ، عربی، فارسی، اردو، ھندی کسی بھی ایک زبان کی جدید ترین ڈکشنری اٹھا کر دیکھ لیجئے اس میں مشہور ترین الفاظ بھی غیر مشہور کے پہلو بہ پہلو نظر آئیں گے - اس کی

وجه بالکل ظاهر اور بدیہی ہے ۔ لغات علما اور خواص کے لئے نہیں طلبا اور عوام کے لئے لکھے جاتے ھیں اور کون کہ سکتا ہے کہ کس طالب علم کو کون سا لفظ دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی ۔ باقی رہا بعض مولفین کا صرف غیر مشہور الفاظ کو اختیار کر لینا تو یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی کسی خاص فن کے مصطلحات یا صرف محاورات پر مشتمل کوئی کتاب لکھ دے۔ مگر اس کا مطلب یہ کبھی نہیں کہ عام الفاظ پر مشتمل کتاب لغت قابل اعتراض قرار دے دی جائے گی ۔

(۴) اس میں شک نہیں کہ مرزا صاحب کے کچھ اعتراض درست بھی ھیں جنہیں صدق دل سے قبول کر لینا چاہئے ۔ مگر اسمیں بھی شبہ نہیں کہ ان کا لہجہ اعتراض معاندانہ اور توھین آمیز ہے ۔ جس کا نتیجہ انکی زندگی میں بھی اچھا نہیں نکلا ۔ اور آج بھی قاطع برہان کو پڑھکر قارئین کی ہمدردیاں ان کے ساتھ نہیں، اس دکنی کے ساتھ ہو جاتی ھیں جسکو یہ ھیچ و پوچ ماننے کو بھی تیار نظر نہیں آتے اور ان کے اس ارشاد کے باوجود کہ

''بیزوان دانش بخش داد پسند می پناہم ، و دانش از خدا و داد از خلق می خواہم، تا گرفتہ نز نند، و خردہ نگیرند کہ ہامردہ' دو صد سالہ دشمنی چوا می ورزد ۔ نہ مرا با محمد حسین دکنی بحث است و نہ بر شہرت برہان قاطع رشک ۱،،

اس عبارت سے محسوس ہونے لگتا ہے کہ دکنی سے دشمنی بھی ہے اور برہان قاطع کی شہرت پر رشک بھی ۔ کاش وہ اپنا لہجہ بالکل محققانہ اور مصلحانہ رکھتے ۔

---

(۱) از دیباچہ قاطع برہان و درفش کاویانی

غالب کے چند قلم زدہ اشعار

بلاشبہ دیوان غالب ہماری ایک انتہائی مقبول اور محترم کتاب ہے اور اس قدر شناسی میں روز بروز جو اضافہ ہوتا جا رہا ہے وہ کسی دعوے یا بحث کا محتاج نہیں ہے بلکہ خود غالب کے اس خواب کی جیتی جاگتی تعبیر ہے کہ ۔

کو کبم را در عدم اوج قبوے بودہ است
شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

بازار میں دیوان غالب کے بیسیوں اڈیشن ملتے ہیں لیکن بڑے تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ ان میں بیشتر اشعار اور مصرعوں کے جزوی رد و بدل سے قطع نظر بعض بہت اچھے اور معرکتہ آلارا اشعار نہیں ملتے ۔ مثال کے طور پر صرف چند بہت مشہور اشعار لکھتا ہوں جو سب کے سب مشکل سے کسی ایک مطبوعہ دیوان میں نظر آتے ہیں حالانکہ یہ سب غالب ہی کے نام سے موسوم ہیں اور ان کے دیوان کے مختلف اڈیشنوں میں بکھرے ہوئے ہیں ۔

(۱) شکوۂ یاراں غبار دل میں پنہاں کر دیا
غالب ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا

(۲) پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے
رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہوا داروں کا

(۳) اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

(۴) ہم بے خودئی شوق میں کر لیتے ہیں سجدے
یہ ہم سے نہ پوچھو کہ کہاں ناصیہ سا ہیں

(٥) ہوں گرمی نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

(٦) جان لب پہ آئی تو بھی نہ شیریں ہوا دہن
از بسکہ تلخئی غم ہجراں چشیدہ ہوں

(٧) اہل ورع کے حلقہ میں ہر چند ہوں ذلیل
پر عاصیوں کے فرقہ میں اک برگزیدہ ہوں

(٨) پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد
ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں

(٩) نہ پوچھ حال اس انداز اس عتاب کے ساتھ
لبوں پہ جان بھی آ جائے گی جواب کے ساتھ

(١٠) خدا کے واسطے پردہ نہ کعبے کا اٹھا واعظ
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

ان اختلافات کی ایک وجہ تو یہ سمجھ میں آ گئی ہے کہ دیوان غالب کا جو ابتدائی انتخاب کیا گیا تھا اس میں رفتہ رفتہ مختلف ناشرین اپنی پسند اور اطلاع کے بموجب غیر منتخب کلام سے بعض اشعار بڑھاتے رہے ہیں ۔ نظامی اور مولانا حسرت موہانی کے مرتب کردہ اڈیشنوں میں ایسے اضافے بہت ملتے ہیں ۔

دیوان کے انتخاب کے متعلق مولانا محمد حسین آزاد آب حیات میں یوں رقم طراز ہیں ۔ ''سن رسیدہ اور معتبر لوگوں سے معلوم ہوا ہے کہ حقیقت میں غالب کا دیوان بہت بڑا تھا ۔ موجودہ دیوان منتخب ہے ۔ مولوی فضل حق اور مرزا خان عرف مرزا خانی کوتوال شہر مرزا کے دلی دوست تھے ۔ ہمیشہ باہم دوستانہ جلسے او شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے ۔ انہوں نے اکثر غزلوں کو سنا اور دیوان کو دیکھا تو مرزا کو سمجھایا یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے ۔ مرزا نے کہا کہ اتنا کچھ کہہ چکا اب تدارک کیا ہو سکتا ہے ۔ انہوں نے کہا خیر ہوا سو ہوا انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو ۔ مرزا نے دیوان حوالہ کر دیا ۔ دونوں

صاحبوں نے دیکھ کر انتخاب کیا ۔ وہ یہی دیوان ہے جو کہ آج ہم عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں ۔ مولانا آزاد کی یہ بات نہ تو دل کو لگتی ہے اور نہ آسانی سے سمجھ میں آتی ہے ۔ غالب ایسی منفرد اور خود اعتماد شخصیت سے جو کہ ذوق اور مومن تک کو خاطر میں نہ لاتا تھا یہ توقع مشکل ہی سے کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنے حسن انتخاب پر بھروسہ نہ کرکے خود اپنے دیوان کے انتخاب کا کام کسی دوسرے شخص کو سپرد کر دے۔ غالب کا ایک شعر غلط شائع ہو جاتا تو مہینوں اور برسوں وہ ناشر اور کاتب کو معاف نہیں کرتے تھے ۔ پھر بھلا وہ کیسے برداشت کر سکتے کہ ان کا کوئی پسندیدہ شعر کوئی دوسرا شخص جو ان کا بہت بڑا دوست اور مخلص ہی کیوں نہ ہوتا قلم زد کر دیتا اور وہ خاموش دم بخود دیکھا کرتے ۔

خود مرزا غالب اپنے ایک خط میں یوں لکھتے ہیں ۔ ''قبلہ ابتدائے فکر سخن میں بیدل و اسیر و شوکت کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا چنانچہ ایک غزل کا مقطع تھا ۔

طرز بیدل میں ریختہ کہنا ۔ اسد اللہ خاں قیامت ہے

پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کئے ۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا ۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا اور یک قلم چاک کئے ۔ دس پندرہ اشعار واسطے نمونے کے دیوان حال میں رہنے دئے ۔''

مولانا حالی نے اس مسئلہ پر ایک بالکل دوسرے انداز سے روشنی ڈالی ہے ۔ ''غالب کے دیوان میں کچھ ایسے شعر رہ گئے ہیں کہ اگر نکل جاتے تو بہت اچھا ہوتا اور اگر یہ رائے بعد از وقت نہ ہوتی اور غالب کو اس پر عمل کرنے کا موقع مل جاتا تو غالب کا دیوان بے مثل اور بے نظیر ہوتا'' مولانا کا یہ مشورہ بہت پر خلوص اور مناسب تھا لیکن اس کو پیش کرتے وقت وہ غالب کے قلم زدہ اشعار کو بالکل ہی فراموش کر گئے ۔ چنانچہ یہ مشورہ صرف نصف صداقت کا حامل ہے ۔ یوں تو غالب کا دیوان اب

بھی بے مثل اور بے نظیر ہے - لیکن یقیناً اگر اس کے کچھ اشعار اور نکال دئے جاتے اور ساتھ ہی ساتھ اس میں سے نکالے ہوئے کچھ اشعار نہ نکالے جاتے تو اس کی لطافتوں اور بلندیوں میں اور بھی چار چاند لگ جاتے -

دیوان غالب جدید المعروف به " نسخه حمیدیه "، (جس میں غالب کے قلم زدہ اشعار بھی درج ہیں) کا عام مروجہ انتخاب دیوان غالب سے مقابلہ کرکے بڑی حیرت ہوئی کہ آخر الزکر میں بعض لا جواب اور نادر اشعار یک قلم متروک کر دئے گئے ہیں - غالب کے بیان کے بموجب "مضامین خیالی"، والے اشعار نکال دئے گئے تھے - آزاد کے قول کے مطابق صرف مشکل اور عوام کی سمجھ میں نہ آنے والے اشعار خارج کر دئے تھے - لیکن قلم زدہ اشعار کی فہرست دیکھ کر بعض مقامات پر تعجب اور افسوس ہوتا ہے کہ سنگ ریزوں کے ساتھ دو ایک نہیں بلکہ بہت کافی تعداد میں جواہر پارے بھی نکال کر باہر پھینک دئے گئے ہیں جس کو ایک انگریزی مثل کے تحت یوں کہا جا سکتا ہے کہ اکثر ٹب کے پانی کے ساتھ بچے بھی باہر پھینک دئے گئے ہیں -

انتخاب کسی نے بھی کیا ہو اس کے اولین مقاصد یہ رہے ہوں گے کہ عامیانہ، سست بندش، مشکل اور مغلق مطالب کے اشعار دیوان سے علیحدہ کر دئے جائیں - لیکن قلم زدہ اشعار کو سامنے رکھکر دیکھئے تو خود بقول غالب -

خامه انگشت بدنداں که اسے کیا لکھئے
ناطقه سر به گریباں که اسے کیا کہئے

مولانا حالی کی اس بہت معقول تجویز سے قطع نظر کہ معیار انتخاب کچھ زیادہ اونچا ہوتا اور کچھ اور اشعار نکل جاتے تو انتخاب اور نکھر جاتا انتخاب سے بعض بہت بلند اور بے پناہ اشعار جن پر نہ صرف خود انتخاب بلکہ اردو زبان فخر کر سکتی تھی محذوف کر دئے گئے ہیں - سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر کس جذبے کے تحت اس قسم کے اشعار جو انتخاب کے بہت سے دیگراشعار سے قطعاً کہیں زیادہ فصیح، چست، دلا ویز اور شاعرانہ نکتہ سنجیوں

کے حامل تھے گردن زدنی قرار دئے گئے ہیں - اور دیوان سے بارہ پتھر باہر کو دئے گئے ہیں - اگر نسخہ ٔ حمیدہ شائع نہ ہوتا (کیونکہ اس کی اشاعت بھی محض ایک اتفاقی بات تھی) تو یقیناً ادب عالیہ کے یہ بیش بہا موتی بحر گم نامی کی تہہ میں پڑے رہ جاتے - غالب نے ایک جگہ اپنے ایک خط میں کہا ہے کہ میں غلط زمانے میں پیدا ہوا ہوں اور ان کے کلام میں تو اس بات کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے - مثلاً ع - میں عندلیب گلشن نا آفریدو ہوں یا ع - کوکبم را در عدم اوج قبولے بودہ است وغیرہ - لہذا ان اشعار کو قلم زد کئے جانے کی کوئی ایک معقول وجہ سمجھ میں آتی ہے تو یہ کہ غالب نے اپنی پسند سے نہیں بلکہ اس خیال سے کہ ان کے زمانے کے عوام ان اشعار کے صحیح مطالب نہیں سمجھ سکیں گے کسی وقتی جذبے کے تحت ان کو خارج کر دیا تھا - لیکن سچ پوچھئے تو یہ بھی کوئی جچتی ہوئی سی بات نہیں معلوم ہوتی - بہر حال میں اس سلسلے میں نسخۂ حمیدیہ میں سے صرف چند مثالیں پیش کرکے ناظرین کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہوں :

شوخئی رنگ حنا، خون وفا سے کب تک آخر اے عہد شکن تو بھی پشیمان نکلا

بہت خوب کہا ہے - اسی صنف کا مولانا محمد علی کا ایک مشہور شعر ہے -

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے ولے
میرا لہو بھی خوب ہے میری حنا کے بعد

ربط یک شیرازہ وحشت ہیں اجزائے بہار
سبزہ بیگانہ ، صبا آوارہ گل ناآشنا

کارخانہ قدرت کی بے ترتیبی میں بھی بنیادی ربط کی طرف اشارہ کرنا بہت دور رس نگاہوں کا کام ہے - اس موضوع پر پچھلے چند سالوں میں دفتر کے دفتر سیاہ کر دئے گئے ہیں - سائنس دانوں کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ کارخانہ قدرت کے پیچھے ایک قادر مطلق طاقت اور دماغ کام کرتا نظر آتا ہے - دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے قدرت کے عناصر بنیادی طور

سے ایک دوسرے کے مخالف اور ضد ھیں اور ان کی ظاھری ترتیب محض اتفاقی اور صرف ایک عارضی بات ھے ۔

اسد ارباب فطرت قدردان لفظ و معنی ھیں
سخن کا بندہ ھوں لیکن نہیں مشتاق تحسیں کا

بصورت تکلم بمعنی تاسف اسد میں تبسم ھوں پژمردگاں کا

اپنی پریشان حالی کی کیا خوب مثال دی ھے جو تعریف سے مستغنی ھے۔

اے وائے غفلت نگہ' شوق ورنہ یاں ہر پارہ سنگ لخت دل کوہ طور تھا

وسعت رحمت حق دیکھ کہ بخشا جائے
مجھ سا کافر کہ جو ممنون معاصی نہ ھوا

اس شعر میں لطیف طنز بھی پنہاں ھے کہ اگر رحمت حق نے ایک ایسے شخص کو بخش دیا کہ جس نے کوئی گناہ ھی نہیں کیا تھا تو اس میں کون سی خاص بات ھوئی۔ ع ۔ بخیلی ھے رزاقی نہیں ھے ۔ دوسرے معنی یہ ھیں کہ میرا ممنون معاصی نہ ھونا منکر رحمت کے مترادف ھے جو کہ صریحاً کفر ھے ۔ رحمت حق کی وسعت ملاحظہ ھو کہ اس نے میرے ایسے کافر کو بھی بخش دیا ۔

اسد یہ عجز و بے سامانی فرعون توام ھے
جسے تو بندگی کہتا ھے دعوی ھے خدائی کا

فرعونیت اپنی انا کے ساتھ ساری دنیا کو ھیچ سمجھتی ھے اور کسی سماجی اور اخلاقی پابندی کو نظر میں نہیں لاتی ھے ۔ بالکل یہی کیفیت عجز و بے سامانی کی ھوتی ھے۔ وہ بھی ہر قید و بند سے آزاد ھوتی ھے ۔ نتیجہ یہ کہ فرعونیت اور بے سامانی اگرچہ متضاد نظر آتی ھیں لیکن در حقیقت مماثل ھوتی ھیں ۔ دونوں ھی کی بنیاد خود غرضی اور نفسانیت پر قائم ھوتی ھے۔ اور یہ ایک ھی جذبہ' انانیت یا ھم چومن دیگرے نیست کے دو پرتو ھیں ۔

علاوہ ازین بندگی کی ایک قسم نفسانیت پر بھی قائم ہوتی ہے - دیکھنے میں تو وہ بندگی ہوتی ہے لیکن اپنے پندار کی وجہ سے جذبہ عبودیت کے بجائے جذبہ فرعونیت کو تقویت پہنچاتی ہے -

عیب کا دریافت کرنا ہے ہنر مندی اسد
نقص پر اپنے ہوا جو مطلع کامل ہوا

بہت خوب کہا ہے حق گفتی ودر سفتی - عام لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ غالب نے اپنی عظمت کے زعم میں اپنے معترضین سے کچھ نہیں سیکھا - میں سمجھتا ہوں کہ غالب کا آسان ترین کلام جس پر ان کی مقبولیت کی اساس قائم ہے ان کی مشکل گوئی کے معترضین ہی کی دین ہے -

گل کھلے غنچے چٹکنے لگے اور صبح ہوئی
سر خوش خواب ہے وہ نرگس مخمور ہنوز

شاعر کے قلم پر مصور کے برش کو رشک آنے لگا - انتہائی پر کیف شعر ہے -

اے اسد خود ہم اسیر رنگ و بوئے باغ ہیں
ظاہرا صیاد ناداں ہے گرفتار ہوس

کتنی بڑی حقیقت بیان کی گئی ہے - شاعر کا مشاہدۂ زندگی کس قدر فلسفیانہ اور دور رس تھا -

رسیدن گل باغ وا ماندگی ہے عبث محفل آرائے رفتار ہیں ہم

انگریزی ضرب المثل ہے کہ سب راستے قبر ہی کی طرف جاتے ہیں - انسان اگر اپنی منزل کو صحیح طور سے سمجھ لے تو زندگی کے بیشتر تنازعات ختم ہو جائیں -

تماشائے گلشن تمنائے چیدن بہار آفرینا ! گنہگار ہیں ہم

بے پناہ شعر ہے ۔ انسانی زندگی کی تفسیر اس سے بہتر نہیں ہو سکتی کہ تماشائے گلشن تمنائے چیدن ! ہر پیدا ہونے والا دنیا کو بڑے استعجاب سے دیکھتا ہے اور پھر کچھ کر ڈالنے کی تمنا دل میں لئے چلا جاتا ہے، شاعر خدا سے فریاد کرتا ہے کہ بس اتنی سی بات پر ہم گنہگار ہو گئے !

نہ ذوق گریبان نہ پروائے داماں نگاہ آشنائے گل و خار ہیں ہم
اسد شکوۂ کفر دعا نا سپاسی ہجوم تمنا سے لاچار ہیں ہم

دعا کو ناسپاس کہنا بڑا لطیف طنز ہے ۔

نہیں معلوم کس جذبہ کے ماتحت یہ پوری غزل قلم زد کر دی گئی ۔ غالباً انتخاب کے وقت یہ غزل غالب کے پیش نظر نہ ہوگی ۔ ان کے لئے یہ بھی تو ایک مصیبت ہو گی کہ قدر دانوں کی کثرت کی وجہ سے ان کے پاس اپنی غزلوں کے مسودے بہت کم ہی رہا کرتے تھے ۔

میں چشم واکشادہ و گلشن نظر فریب
لیکن عبث کہ شبنم خورشید دیدہ ہوں

''شبنم خورشید دیدہ،، کی تعریف نہیں ہو سکتی ۔ کتنا بہت دیکھنا ہے اور کتنی کم فرصت ہے ۔

ہے طلسم دھر میں صد حشر پاداش عمل
آ گہی غافل کہ یک امروز بے فردا نہیں

پاداش عمل کو صد حشر کہنا کمال نکتہ سنجی ہے ۔ شاعر نے نفسیات کا جدید ترین اصول بیان کیا ہے کہ انسان کا ہر فعل بالنفسہ خود اپنی جزایا سزا کا حامل ہوتا ہے ۔

کوئی آگاہ نہیں باطن ہم دیگر سے
ہے ہر اک فرد جہاں میں ورق ناخواندہ

انسان کے باطن یا تحت الشعور کو ورق ناخواندہ یعنی لکھا ہوا تو ہے لیکن پڑھا نہیں جاتا کہنا اعجاز بیانی ہے ۔ شاعر نے باوجود اس کے کہ جدید علم نفسیات نے اس کے زمانہ میں اپنی موجودہ شکل اختیار نہیں کی تھی ۔ اس کا ایک بنیادی کلیہ بیان کیا ہے ۔

نظر بہ نقص گدایاں کمال بے ادبی ہے
کہ خار خشک کو بھی دعوی چمن نسبی ہے

اخلاقیات کا ایک زرین اصول بیان کیا گیا ہے ۔ اردو ادب کو اس قسم کے اشعار پر بجا طور سے ناز ہو سکتا ہے ۔

خوشا وہ دل کہ سراپا طلسم بے خبری ہو
جنون و یاس و الم رزق مدعا طلبی ہے

مدعا طلبی یعنی خود غرضی اور نفسانیت ہی تمام پریشانیوں کی جڑ ہے ۔

ہم نشینیٔ رقیباں گرچہ ہے سامان رشک
لیکن اس سے ناگوارا تر ہے بدنامی تری
برگ ریزی ہائے گل ہے وضع زر افشاندنی
باج لیتی ہے گلستاں سے گل اندامی تیری

نگہہ معمار حسرتہا چہ آبادی چہ ویرانی
کہ مژگاں جس طرف وا ہو کف داماں صحرا ہے

شاعر نے یہ حقیقت یوں بیان کی ہے کہ انسان کی خوشی خارجی اسباب پر نہیں بلکہ داخلی اسباب پر مبنی ہوتی ہے ۔ اگر نگہہ حسرت زدہ ہے تو وہ ہر طرف حسرت انگیز مناظر پیش کرے گی ۔ ایک انگریزی ضرب المثل بھی ہے ۔

رشک ہے آسائش ارباب غفلت پر اسد
پیچ و تاب دل نصیب خاطر آگاہ ہے

شاعر کی یہ تحقیق اب ایک انگریزی مقولہ بن چکی ہے۔ '' نا واقفیت ایک نعمت اور واقفیت ایک غلطی ہے ۔''

صبح سے معلوم آثار ظہور شام ہے غافلاں آغاز کار آئینہ انجام ہے

ھندی اردو اور انگریزی زبانوں میں تھوڑے سے تغیر کے ساتھ یہی بات ضرب المثل بن چکی ہے ۔

مستعد قتل یک عالم ہے جلاد فلک
کہکشاں موج شفق میں تیغ خون آشام ہے

شعر کیا ہے کڑی کمان کا تیر ہے ۔

عجز و نیاز سے تو نہ آمادہ راہ پر
دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچئے

کیا تیور ھیں ۔ اپنی نوعیت کا بے مثل شعر ہے ۔

نہ حیرت چشم ساقی کی نہ صحبت دور ساغر کی
مری محفل میں غالب گردش افلاک باقی ہے۔

اپنی اجڑی ہوئی محفل کی کیا تصویر کھنچی ہے۔

زندان تحمل ھیں مہمان تغافل ھیں
بے فائدہ یاروں کو فرق غم و شادی ہے۔

جن لوگوں نے زندگی کے بنیادی حقائق کو پا لیا ہے وہ جانتے ھیں کہ غم و شادی محض عقل و نظر کے دھوکے ھیں ۔

اوپر میں نے جو چند اشعار پیش کئے ھیں ان میں سے نہ تو کسی کو مہمل کہا جا سکتا ہے اور نہ مشکل اور کم و بیش ان میں سے ہر کوئی اپنی مستقل ادبی حیثیت رکھتا ہے ۔ یہ فہرست مکمل بھی نہیں ہے

ابھی ایسے اور بہت سے شعر پیش کئے جا سکتے ھیں - یہ اشعار موجودہ دیوان کے اشعار سے ھرگز پست نہیں بلکہ بعض تو ایسے لاجواب ھیں کہ ان کی ٹکر کے چند ھی اشعار منتخب دیوان میں بھی مل سکیں گے - پھر عقل کام نہیں کرتی کہ آخر یہ منتخب دیوان سے کیوں نکال دئے تھے - اور اس ناانصافی پر اب بھی کیوں عمل کیا جا رھا ھے - کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ ان اشعار کو منتخب دیوان میں ان کی جگہ دی جائے اور مولانا حالی کے مشورے کے بموجب بعض اشعار موجودہ دیوان سے کم کر دئے جائیں تا کہ موجودہ دیوان کا معیار بھی بلند ھو جائے اور اس کے اختصار کی نزاکت بھی ختم نہ ھونے پائے -

غالب اور عارف

سبھی جانتے ھیں کہ غالب کی زندگی کے آخری دن بڑی پریشانیوں اور الجھنوں میں بسر ہوئے اور نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ وہ اکثر زندگی ھی سے بیزار ہو گئے ۔ اس کے باوجود اگر ان کے کلام اور حالات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ھے کہ انہیں مجموعی طور پر زندگی سے محبت تھی ۔ وہ اس کی قدروں کو پہچانتے تھے اور اس سے لطف اٹھانا جانتے تھے ۔ ان کی فطرت کا خمیر عشق سے اٹھا تھا ۔ وہ محبت پر مجبور تھے اور زندگی کی ہر محفل میں ان کے لئے کوئی نہ کوئی محبوب ضروری تھا ۔ یہی وجہ تھی کہ جب ان کی کئی اولادیں یکے بعد دیگرے دنیا سے اٹھ گئیں تو انہوں نے اپنی بیوی کے بھانجے زین العابدین خاں کو گود لے لیا تا کہ قدرت نے ان کے دل میں اولاد کی محبت کے لئے جو گوشہ رکھا تھا وہ خالی نہ رہنے پائے ۔ اور وہ شفقت پدری کے مظاہروں کی لذت سے محروم نہ رہیں ۔

زین العابدین خاں عارف کے باپ شرف الدولہ نواب غلام حسین خاں بہادر تھے ۔ ان کا پہلا نکاح نواب الٰہی بخش خاں کی چھوٹی صاحبزادی بنیادی بیگم سے ہوا تھا ۔ جن کے بطن سے حیدر حسین خاں اور زین العابدین خاں عارف پیدا ہوئے ۔ بنیادی بیگم کی بڑی بہن امراؤ بیگم غالب کی منکوحہ تھیں اور غلام حسین خاں صاحب غالب کے ساڑھو تھے ۔ انہیں موسیقی سے دلچسپی تھی اور بیان کیا جاتا ھے کہ ستار اچھا بجاتے تھے ۔ اس زمانے کے امرا کی طرح شاعری کا بھی شوق تھا اور مسرور تخلص کرتے تھے ۔ موسیقی اور شاعری میں ان کا درجہ معین کرنا تو مشکل بھی ھے اور غیر ضروری بھی ھے لیکن شاید ان ہی دل چسپیوں کے نتیجہ میں ان کے تعلقات بیوی سے بہت خراب ہو گئے ۔ اور حالات نے ایسا رخ بدلا کہ میاں بیوی میں

جدائی ہو گئی - نواب غلام حسین خاں نے ایک مکان اپنی بیوی کے نام کر دیا - اور وہ اپنے بچوں کو لے کر علحدہ رہنے لگیں -

عارف ۱۸۱۷ء مطابق ۱۲۳۳ھ میں پیدا ہوئے - والدین کے باھمی تعلقات چونکہ اچھے نہیں تھے اس لئے تعلیم و تربیت پر ضروری توجہ نہ دی جا سکی - ساری ذمہ داری ماں کو سنبھالنی پڑی اور گھر پر ھی تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری رہا - ایسا معلوم ہوتا ھے کہ غالب کی طرح عارف کو بھی فطری طور پر حصول علم کا شوق تھا اور ابتدا ھی سے اپنے دور کے باکمالوں کی قدر پہچانتے تھے - چنانچہ جب انہوں نے خط نسخ سیکھنا چاھا تو ان کی نگاہ یا قوت رقم خاں ثانی میر جلال الدین پر پڑی جو اپنے فن میں یکتائے عصر تھے اور جنھیں بہادر شاہ ظفر کی استادی کا امتیاز بھی حاصل تھا - جب عارف نے میر صاحب سے خط نسخ سیکھنے کی خواھش کی تو انہوں نے یہ شرط رکھی کہ عارف ''معاوضہ،، کے طور پر ان کے دونوں لڑکوں کو شاعری سکھائیں - عارف نے یہ شرط منظور کر لی اور استادی شاگردی کا دو طرفہ سلسلہ شروع ہو گیا - اس واقعہ سے عارف کے شدید علمی ذوق کا پتہ چلتا ھے -

اردو کے شاعروں کی گھریلو زندگی اکثر و بیشتر پریشان حالی کا شکار رھی ھے - اور میر سے لے کر غالب تک سبھی یا تو ''مجبوریوں پر مختاری کی تہمت،، کا رونا روتے رہے ھیں یا ''نا کردہ گناھوں کی حسرت،، پر داد طلب نظر آتے ھیں - پھر عارف اس کلیہ سے کس طرح مستثنی رہ سکتے تھے - چنانچہ ان کے حالات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ھے کہ اپنے استاد اور رہنما غالب کے مانند وہ بھی گھر کی طرف سے کچھ زیادہ خوش نہ تھے - انہوں نے دو نکاح کئے اور دونوں بیویاں انہیں جوانی کے عالم میں تنہا چھوڑ کر موت کے آغوش میں چلی گئیں - پہلی بیوی کی جدائی کا صدمہ تو وہ برداشت کر گئے - چونکہ انہیں اپنی دوسری بیوی سے بہت محبت ہو گئی تھی اس لئے جب ۱۸۸۲ء میں موت کے زبردست ھاتھ نے ان کا یہ سرمایہ بھی چھین لیا تو وہ اس غم کو سہار نہ سکے یعنی اپنی محبوب

بیوی کی موت کے چار یا پانچ مہینہ بعد ہی ۳۰ سال کی عمر میں انتقال کر گئے اور بوڑھے غالب کو یہ کہنے کے لئے اکیلا چھوڑ دیا ۔

لازم تھا کہ دیکھو میرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

عارف نے دو اولادیں چھوڑیں باقر علی خاں اور حسین علی خاں ۔ غالب کو عارف سے بڑی محبت تھی اور وہ انہیں اپنی اولاد سے بڑھکر سمجھتے تھے ۔ جب عارف دنیا سے اٹھ گئے تو غالب کی محبت ان کے دونوں بچوں کی طرف منتقل ہو گئی اور غالب نے انہیں اپنے پاس بلا لیا ۔ وہ ان کی ہر ضد پوری کرتے تھے ۔ کبھی کبھی ان کی ضد سے مجبور ہو کر انہیں سفر میں بھی اپنے ساتھ لے جاتے تھے ۔ غالب کے حالات پر نظر رکھنے والے جانتے ھیں کہ انہوں نے کس ''تنگ دستی بلکہ فاقہ مستی،، میں اپنی عمر گذاری ۔ لیکن جہاں تک ان بچوں کا تعلق ھے غالب انہیں کوئی تکلیف نہ ہونے دیتے تھے ۔ ایک خط میں لکھتے ھیں ۔

''دونوں بچے فروری مہینہ کے دو دو روپیے لے گئے اور خرچ کر ڈالے ۔ اب ایک ایک روپیہ بطور قرض دیا ھے ۔،،

یہاں لفظ ''قرض،، کے استعمال کو غالب کے ظرافت بیان کے سوا اور کیا کہا جا سکتاھے ۔ غالب نے ۱۸ جون ۱۸۵۲ء کو عارف کے انتقال کا جو سنہ ھے ۔ مرزا تفتہ کو ایک خط میں لکھا ۔

'' تم جانتے ہو کہ زین العابدین خاں مرحوم میرا فرزند تھا اور اب اس کے دونوں بچے کہ وہ میرے پوتے ھیں میرے پاس آ رھے ھیں ۔ اور دمبدم مجھ کو ستاتے ھیں اور میں تحمل کرتا ہوں،،۔

اس چار حرفی لفظ ''تحمل،، میں محبت اور شفقت کی ایک دنیا آباد ھے ۔

ان دونوں لڑکوں کی تعلیم و تربیت اور ابتدائی حالات کا زیادہ پتہ نہیں چلتا، خمخانہ ٔ جاوید سے صرف اتنا معلوم ہوتا ھے کہ ایک زمانے

میں عارف کے بڑے بیٹے نواب باقر علی خاں کامل ریاست الور میں ایک اعلا عہدے پر فائز تھے اور چھوٹے بیٹے حسین علی خاں شادان دربار رام پور سے وابستہ ہو گئے تھے -

اس بات پر سب تذکرہ نگار متفق ہیں کہ عارف نے کم سنی ہی میں شاعری شروع کر دی تھی - اور یہ کوئی حیرت کی بات بھی نہیں ہے - اس لئے کہ خود ان کے بزرگ اور استاد غالب مغفور بھی نو دس سال کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے - عارف نے جو سرمایۂ شعری چھوڑا ہے اسے دیکھتے ہوئے بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ کم عمری ہی سے مشق سخن شروع کر دی تھی بلکہ وہ ایک پرگو شاعر بھی تھے - لالہ سری رام مرحوم مولف خمخانہ جاوید کے خیال میں عارف کے غیر مطبوعہ کلیات میں بیس ہزار سے کم اشعار نہ ہوں گے - اکثر غزلیں ساٹھ ساٹھ شعر کی ہیں - اس وقت تک عارف کے کلام کا جو پتہ چل سکا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک نسخہ جو پہلے لوہارو کے کتب خانہ میں تھا اب رضا لائبریری رام پور میں ہے - دوسرا نسخہ لالہ سری رام کے پاس تھا اور اب ہندو یونیورسٹی بنارس میں منتقل ہو گیا ہے - یہ دونوں نسخے قلمی ہیں - اور ان کے علاوہ تیسرا قلمی نسخہ کتب خانہ نواب سالار جنگ (حیدرآباد) میں بھی ہے - جس میں ایک ہزار ایک اشعار ہیں - اور آخر میں یہ عبارت درج ہے - ''متفرقات قصائد و غزلیات عارف تمام شد،، اس نسخہ کی کتابت صاف اور واضح ہے اور گو اسے بہت زیادہ خوش خط نہیں کہا جا سکتا پھر بھی گوارا ہے - اس کے کاتب نے ہر جگہ قدیم انداز تحریر اختیار کیا ہے - جس سے اس کی قدامت کا پتہ چلتا ہے - مثال کے طور پر یائے معروف ویائے مجہول کے درمیان اکثر مقامات پر کوئی فرق نہیں ہے - ''ملتی،، کو ''ملتے،، لکھا گیا ہے اور ''پہلے،، کو ''پہلی ،، لکھنے میں کوئی پس و پیش نہیں کیا گیا - پرانے رواج کے مطابق الفاظ کے حروف کو زیادہ تر ملا کر لکھا ہے - یعنی ''رکھوں کیوں کر،، کو ''رکھونکیونکر،، لکھ دیا ہے - ایک جگہ ''بوالہوسوں،، کے بجائے ''بلہوسوں،، لکھ ڈالا ہے - املا کی بے شمار غلطیاں ہیں - ''طرہ،، کو ''ترہ،، لکھا ہے - ''سفاک،، کو ''صفاک،، اور ''سحر،، کو ''صحر،، !

اس نسخہ میں قصیدے ہیں، غزلیں ہیں، مخمس ہیں، مسدس ہیں، قطعے ہیں، رباعیاں ہیں، متفرق اشعار ہیں - غرض کہ سبھی کچھ ہے اور اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے - کہ اس میں ابتدائے مشق کا کلام بھی ہے اور اس زمانے کے اشعار بھی جب کہ عارف کے سخن میں پختگی پیدا ہو چکی تھی -

عارف شاہ نصیر کو اپنا کلام دکھاتے تھے - لیکن جب وہ دکن چلے گئے تو انہوں نے غالب سے رجوع کیا - اور اس طرح رہرو کو وہ رہنما مل گیا جو نہ صرف یہ کہ منزل آشنا تھا بلکہ نئے راستے بنانے پر بھی قادر تھا - غالب اور عارف کا تعلق صرف استاد شاگرد کا سادہ تعلق نہ تھا بلکہ اسے خاندانی قرابت کے رشتے نے اپنی گرھوں سے اور بھی استوار کر دیا تھا - اس لئے عارف کی شاعری کے متعلق سب سے زیادہ مستند رائے خود غالب ہی کی ہو سکتی ہے - اور یہ رائے پوری جامعیت کے ساتھ غالب کے اس قطعہ سے ظاہر ہوتی ہے جو عارف کے لئے کہا ہے اور یوں شروع ہوتا ہے -

آں پسندیدہ خوئے عارف نام
کہ رخش شمع دودمان من است

اس قطعہ میں یہ اشعار غور طلب ہیں -

بہ یقین داں کہ غیر من نہ بود گر نظیر تو در گماں من است
جاوداں باش اے کہ در گیتی سخنت عمر جاوداں من است
اے کہ میراث خوار من باشی اندر اردو کہ آں زباں من است
از معانی ز مبدا فیاض باد آں تو ہرچہ آں من است

غالب پنج آہنگ میں نواب مصطفٰے خاں کے نام ایک خط میں کسی مشاعرے کی روداد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"از یاران بندہ مرزا زین العابدین خاں عارف، جواھر سنگھ جوھر در زمین طرح دو غزل خواندہ نقش نغز گوئی بکرسی نشاندند -"

اس سلسلے میں غالب کے اس فارسی قطعہ کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے جو انہوں نے کسی باغ کی تعریف میں لکھا ہے اور جس کے لئے تشبیہات کی تلاش کرتے ہوئے اپنا اور عارف کا ذکر ایک ساتھ کیا ہے -

صباحش چون دل عارف منزہ
نسیمش چون دم غالب معنبر

غالب کی بدنام خود پرستی کی روشنی میں ان حقائق و واقعات کو سامنے رکھا جائے تو یہ یقین پختہ تو ہو جاتا ہے کہ غالب عارف سے صرف محبت ہی نہیں کرتے تھے بلکہ ان کی شخصیت و صلاحیت کے متعلق ایک نہایت ہی بلند رائے بھی رکھتے تھے -

یہ بات مسلمہ ہے کہ عارف نے ابتدا میں شاہ نصیر سے اصلاح لی اور چونکہ اس زمانے میں شاہ نصیر کا رنگ عام طور پر مقبول تھا اس لئے عارف اس سے متاثر بھی ہوئے اور اسی تاثر کے تحت ہمیں ان کے کلام میں ایسے اشعار ملتے ہیں -

(۱) کیوں نہ وہ ناک چڑھاویں مرے پاس آنے سے
ہر رگ و پے سے میرے بوئے وفا آتی ہے
(۲) کچھ پاؤں زمیں پر ہے تو کچھ عرش پر ان کا
عالم کو وہ کس دن تہہ و بالا نہیں کرتے
(۳) اے فلک تودۂ ہائے غم بھجوا
کچھ بھی ہے، فکر میرے کھانے کی
(۴) جنگ تھی عشق و خرد میں کام اپنا ہو گیا
ہے ہماری وہ مثل گھن پس گیا آٹے کے ساتھ

لیکن غائر نظر ڈالی جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عارف نے شاہ نصیر سے جو تاثر حاصل کیا وہ محض وقتی اور عارضی تھا - صرف یہی نہیں بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے - گویا جس وقت عارف شاہ نصیر کی تقلید کر رہے تھے اس وقت بھی ان کا ''آئیڈیل،، غالب ہی کا کلام تھا - اسی زمانے

کی غزلوں میں ھمیں ایسے متضاد اشعار ملتے ھیں جن کا مزاج مختلف ھے، انداز بیان مختلف ھے، لہجہ مختلف ھے اور طریقہ فکر مختلف ھے - مثال کے طور پر ایک غزل میں وہ کہتے ھیں -

کھا گیا ھوں میں غم کروڑوں من
نہ ھوا لیک امتلا مجھ کو

صاف معلوم ھوتا ھے کہ یہ طرز فکر اور پیرایہ بیان شاہ نصیر کی صحبت و تربیت کا نتیجہ ھے اور اس شعر کو پڑھکر ذھن بے ساختہ ''عسل کی مکھی،، کے معرکے کی طرف منتقل ھو جاتا ھے - لیکن حیرت ھوتی ھے جب ھم یہ شعر پڑھتے ھیں -

اتنے بیگانہ مت رھو مجھ سے
طعنہ دیتے ھیں آشنا مجھ کو

عارف کے اس دور کا کلام اگر پوری توجہ سے پڑھا جائے تو یہ احساس ھوتا ھے - گویا ان کی شاعری ایک کشمکش کی منزل سے گزر رھی ھے - ایمان انھیں روک رھا ھے اور کفر انھیں کھینچ رھا ھے - وہ شاہ نصیر اور غالب کے ساتھ چل رھے ھیں - یہاں تک کہ ایک مرحلہ ایسا آتا ھے جب شاہ نصیر ھانپ کر پیچھے رہ جاتے ھیں اور عارف غالب کے قدم بہ قدم آگے نکل جاتے ھیں -

عارف نے شاہ نصیر کے بعد غالب سے اصلاح لی - لیکن اس کی نوعیت اور قدرو قیمت سمجھنے کے لئے عہد غالب کے انداز اصلاح کی نسبت مالک رام صاحب کی اس جچی تلی رائے کو فراموش نہ کرنا چاھیے جو انھوں نے اپنی نئی کتاب ''تلامذۂ غالب،، میں ظاھر کی ھے - مالک رام صاحب لکھتے ھیں -

''غالب کے شاگردوں میں بہت کم اپنے استاد کے رنگ میں کہنے والے ھیں - اس کا سبب یہی ھے کہ غالب اس نکتے کو خوب سمجھتے تھے کہ چھرے مہرے کی طرح ھر شخص

اپنا خاص مزاج اور مذاق بھی قدرت کی طرف سے لے
کر آتا ھے ۔ ان میں سے کسی کو بھی بدلنے کی کوشش کرنا
اسے مسخ کر دینے کے مترادف ھے ۔ صحیح طریقہ یہ ھے
کہ کلام کے ظاھری در و بست اور فنی و لغوی اسقام کی
اصلاح کی جائے اور اس کے طرز سخن کو جوں
کا توں قائم رہنے دیا جائے ۔،،

خود غالب اپنے طریقہ اصلاح کی نسبت قاضی عبدالجمیل کے نام ایک
خط میں لکھتے ھیں :

''فقیر کا قاعدہ یہ ھے کہ اگر کلام میں اغلاط و اسقام دیکھتا
ھوں تو رفع کر دیتا ھوں اور اگر سقم سے خالی پاتا ھوں
تو تصرف نہیں کرتا ،،

یہ استاد کا انداز فکر اور طرز عمل ھے ۔ لیکن اگر کوئی شاگرد
اپنی فطرت کے تقاضوں سے مجبور ھو کر استاد کی ھمنوائی کے لئے بیتاب
ھو جائے تو ظاھر ھے کہ اسے استاد بھی نہیں روک سکتا ۔ بلکہ فطری
طور پر اسے بے اندازہ مسرت ھوگی ۔ یہاں پہنچ کر ھم پھر مالک رام صاحب
کے ان الفاظ میں بڑا وزن پاتے ھیں ''جب نصیر دکن کو سدھارے تو عارف
نے غالب سے استفادہ شروع کیا ۔ رنگ سخن بھی بدل دیا اور پہلا دیوان
''مطلع مہر سعادت،، جو شاہ نصیر کے رنگ میں تھا نظری کر دیا ۔ اب وہ
شاعری میں غالب کی پیروی کرنے لگے اور دوسرا دیوان مرتب کیا ۔ انہیں
خوبیوں کے باعث مرزا ان پر بہت فخر کرتے تھے ۔،،

فخر کا اس سے بہتر محل اور کیا ھو سکتا تھا کہ ایک قریبی رشتہ دار
جسے غالب بہت ھی عزیز رکھتے تھے اور جس کی ذھانت و طباعی مسلمہ
تھی ۔ ان کے اس رنگ کو جس کی ناقدری کا رونا وہ تمام عمر روتے رھے اور
ان کا وہ انداز کلام اختیار کرے جس کی کس مپرسی نے انھیں

گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

کہنے پر مجبور کر دیا تھا ۔

غالب اردو شاعری میں ایک منارۂ نور کی حیثیت رکھتے ھیں ۔ اور ان کی انفرادیت کو کوئی دوسرا شاعر آج تک بھی نہیں پہنچ سکا۔ لیکن جب ھم کامل غیر جانبداری اور صداقت پسندی کے ساتھ عارف کے کلام کا مطالعہ کرتے ھیں تو ایسا معلوم ھوتا ھے کہ اس چھوٹی سی شمع نے بھی کہیں کہیں اور کبھی کبھی اس منارہ نور سے ٹکر لینی چاھی ھے ۔ اور اگر ''شکست و فتح،، کے فیصلے کو نصیبوں پر چھوڑ دیا جائے تب بھی ''مقابلہ،، کی خوبی سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔

اس دعوے کو ثابت کرنے کے لئے کہ آخر زمانے میں عارف اپنے استاد محترم کے نقش قدم پر چلنے لگے تھے اور انداز فکر واسلوب بیان میں غالب کی پیروی کو انھوں نے اپنا شعار بنا لیا تھا کسی طویل بحث کی ضرورت نہیں ۔ یہاں غالب اور عارف کے متحد المعنی اور مشترک المعنی اشعار درج کئے جاتے ھیں ۔ جن کے تقابلی مطالعہ سے اندازہ ھوگا کہ شاگرد نے کس سلیقہ کے ساتھ استاد کے قدم بہ قدم چلنے کی کوشش کی ھے اور فطری ذوق کی یکسانیت نے کن نازک مقامات پر دونوں کو ایک ھی صف میں کھڑا کر دیا ھے ۔

یوسف اس کو کہیں اور کچھ نہ کہے خیر ھوئی
گر بگڑ جاتے تو میں لائق تعزیر بھی تھا (غالب)

ھمیں نہ تھی یہ خبر اس قدر نہ ھو برھم
تجھے نہ آج سے کہویں گے یوسف ثانی (عارف)

ھو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ
یارب اپنے خط کو ھم پہونچائیں کیا (غالب)

اوروں کو ھو تو ھو ھمیں مرنے سے ڈر نہیں
خط لے کے ھم ھی جاتے ھیں گر نامہ بر نہیں (عارف)

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ھے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ھے (غالب)

وہ شرم ہے کہ ان کو کہ ہے آئینہ سے نفرت
خود دیکھنا اپنا بھی گوارا نہیں کرتے (عارف)

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا (غالب)

اے فلک خانہ خرابی کی ہے پروا کس کو
دشت میں رہتے ہیں مدت ہوئی گھر چھوڑ دیا (عارف)

سنبھلنے دے ارے او نا امیدی کیا قیامت ہے
کہ دامان خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے (غالب)

اس ضعف کا برا ہو کہ ناکام رہ گئے
آج اس کا اپنے ہاتھ سے داماں نکل گیا (عارف)

کیوں رد قدح کرے ہے زاہد
مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے (غالب)

پی کر تو دیکھ پہلے کہ یہ کیا ہے محتسب (عارف)
مت توڑ شیشۂ مئے گلنار بے سبب

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے (غالب)

اب تلک آئینہ شاید آپ نے دیکھا نہیں
آپ جو کہتے ہیں ہم رکھتے نہیں اپنا جواب (عارف)

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی (غالب)

میں تو مر جاتا وہیں غیرت سے کوہ طور پر
اس طرح سے صاف گر ملتا مجھے موسا جوب (عارف)

ترے سرو قامت سے اک قدم آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں (غالب)

آنے دو بھلا روز قیامت کو بھی اک دن
ناپیں گے تیرے قامت رعنا کے برابر (عارف)

عارف کے اس قلمی دیوان میں جو سالار جنگ لائبریری کی زینت ہے اور جس کا تذکرہ کیا جا چکا ہے اس میں ایک فارسی غزل بھی ہے اور حسن اتفاق سے ہمیں اس زمین میں غالب کی بھی ایک غزل ملتی ہے - یہاں ان دونوں غزلوں کے اشعار کا مطالعہ دلچسپی اور لطف سے خالی نہ ہوگا

غالب کا مطلع -

لرزہ دارد خطر ازهیبت ویرانۂ ما
سیل را پائے بہ سنگ آمدہ در خانۂ ما

عارف کہتے ہیں -

خون بدل نیست شراب است بہ پیمانۂ ما
سینۂ ماست ز اندوہ تو میخانۂ ما

جہاں تک شان و شکوہ کا تعلق ہے غالب کے مطلع کا جواب نہیں لیکن شاعری کا وہ حسن جسے ''تاثیر،، کہتے ہیں عارف کے مطلع میں نسبتاً زیادہ پایا جاتا ہے -

''پیمانہ،، کے قافیہ میں دونوں کے شعر غور طلب ہیں -

غالب -

مے ہا اندازہ حرام آمدہ ساقی بر خیز
شیشہ خود بہ شکن بر سر پیمانۂ ما

عارف -

بادہ برمانہ حرام است کہ از شورش بخت
نشہ زائل شود از بادہ بہ پیمانۂ ما

شراب کے حرام نہ ہونے کا دعوی دونوں نے کیا ہے - لیکن غالب کے شعر میں تکلف اور تصنع ہے - اس کے مقابلہ میں عارف نے اپنے لئے شراب حلال ہونے کے سلسلے میں ''شورش بخت،، کا جو حوالہ دیا ہے اس میں کوئی بناوٹ نہیں - اس بحث سے قطع نظر عارف نے ''حلت،،

کی وجہ بھی بتا دی ہے جو بڑی حد تک معقول ہے اور غالب نے محض فتوا صادر کر دیا ہے - ایک ہم قافیہ شعر اور ہے -

غالب —

دم تیغت تنگ و گردن ما باریک است
آفریں بر توؤ بر ہمت مردانۂ ما

عارف نے اس قافیہ میں مقطع کہا ہے -

صبح کردیم شب تار جدائی عارف
در غم دوست بہ بین ہمت مردانۂ ما

ہمت مردانہ دونوں کے یہاں بنیادی اہمیت رکھتی ہے - لیکن غالب نے اسے تیغ محبوب کی تنک دمی اور اپنی گردن کی باریکی میں الجھا کر شعر کو پیچیدہ کر دیا - عارف کے یہاں چونکہ بیان واقعہ ہے اور بات دل سے نکلی ہے اس لئے اس میں اثر ہے ، کیف ہے اور چونکا دینے والی کیفیت ہے -

''افسانہ،، کے قافیہ میں بھی دونوں نے طبع آزمائی کی ہے-

غالب—

خوش فرد میرود افسون رقیبت در دل
پنبۂ گوش تو گردد مگر افسانۂ ما

عارف—

آخر اے بخت عدو ایں ہمہ بیداری چیست
نرسید است بہ گوش تو گر افسانۂ ما

دونوں شعروں کی فضا تقریباً یکساں ہے اور دونوں میں رقیب یا عدو کی شخصیت 'وجہ نزاع، نظر آتی ہے- فرق یہ ہے کہ غالب صرف شکایت کرتے رہ گئے ہیں - اس سے زیادہ اگر شعر میں کچھ ہے تو وہ محض لفظی صناعی ہے - ''افسون رقیب،، ہے اور ''پنبۂ گوش،، ہے - لیکن عارف نے خود بخت عدو کی بیداری کا سبب بیان کیا ہے اور ضمنی طور پر اپنی سوئی ہوئی قسمت کا ذکر ایسے انداز میں کر دیا ہے جو خاصا موثر ہے - غالب

کے شعر میں قطعیت ہے یعنی بات ختم ہو جاتی ہے ۔ عارف کے یہاں گنجائش ہے اور ایسے اشارے ہیں جن سے بات بڑھتی اور پھیلتی ہے ۔

عارف کی اس غزل کے باقی اشعار بھی اس لحاظ سے اہمیت رکھتے ہیں کہ ان میں غالب ہی کا انداز ہے انہیں کا لہجہ ہے اور انہیں کا مخصوص اسلوب فکر ہے ۔

صبح پیراہن ہر شمع بگردد خورشید
تا برو سرمہ ز خاک پر پروانۂ ما
رشتہ از برہمن و دانہ ز شیخ آوردم
تا شد آراستہ این سبحۂ صد دانۂ ما
از قدوم تو بہ خود بالم و خود منفعلم
کہ دلت تنگ شد از تنگیٔ کا شانۂ ما

عارف کا فارسی کلام کم ہے ۔ لیکن جتنا کچھ بھی ہے اس پر غالب کی چھاپ ہے فکر کے لحاظ سے بھی اور اظہار کے اعتبار سے بھی ، اس کے علاوہ جس طرح غالب اردو اشعار میں بے موقع فارسی الفاظ ٹھونس دینے کے سلسلے میں بدنام ہیں عارف کے کلام میں بھی اکثر مقامات پر بھی انداز پایا جاتا ہے اور اس قسم کے مصرعے ملتے ہیں۔

ع ۔ نہ تھا سر گوئیا اعدا کے تن پر
ع ۔ کرے دریوزہ گوہر جس سے نیساں

اردو شاعری کی بدقسمتی یہ بھی ہے کہ غالب نے اپنے ماحول کے خلاف جو بغاوت کی تھی اس کا سلسلہ ان کے بعد جاری نہ رہا ۔ اور انہوں نے شعر کو بلند کرنے کے لئے جو تحریک چلائی تھی ۔ بعد کے زمانہ میں اس کے علمبردار پیدا نہ ہوئے ۔ کیا عجب ہے کہ اگر عارف کو ۳۰ سال کی عمر میں موت نہ آتی اور غالب کا یہ ''میراث خوار،، اور زندہ رہ کر فکر شعر میں مصروف رہتا تو اس کے کلام کے تسلسل سے غالب کی قائم کردہ روایت آگے بڑھتی اور اردو شاعری کو زیادہ توانائی ملتی ۔

میکش اکبر آبادی

مرزا غالب ایک صُوفی کی حیثیت سے

(اپنے چند غیر مطبوعہ خطوط کی روشنی میں)

''علم تصوف سے جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ '' برائے شعر گفتن خوب است '' ان کو (مرزا غالب کو) خاص مناسبت تھی اور حقائق و معارف کی کتابیں اور رسالے کثرت سے ان کے مطالعے سے گزرے تھے۔ اور سچ پوچھئے تو ان ہی متصوفانہ خیالات نے مرزا کو نہ صرف اپنے ہمعصروں میں بلکہ بارھویں اور تیرھویں صدی کے تمام شعراء میں ممتاز بنا دیا تھا۔''
(یادگار غالب صفحہ ۹۵
مطبوعہ مطبع فیض عام، علی گڑھ)

''انھوں نے تمام عبادات اور فرائض و واجبات میں سے صرف دو چیزیں لے لی تھیں ایک توحید وجودی اور دوسرے نبی اور اہلبیت نبی کی محبت۔''
(یادگار غالب ص ۶۷)

''لیکن اس میں شک نہیں کہ میں موحد ہوں۔ ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں۔

لا الہ الا اللہ لا موجود الا اللہ لا موثر فی الوجود الا اللہ!
(یادگار غالب ص ۴۸-۴۹)

ان اقتباسات سے ثابت ہے کہ مرزا غالب کا صوفی ہونا کوئی نئی دریافت نہیں ہے۔ وہ عقیدے کے اعتبار سے صوفی تھے۔ ان کا تصوف کی کتابوں کا مطالعہ بہت عمیق تھا اور یہ کہ وہ خالی اوقات میں مسئلہ وحدۃ الوجود پر غور بھی کیا کرتے تھے۔

اس غورو فکر کو تصوف میں بڑی اھمیت حاصل ھے اور مجاھدہ و اعمال پر اسے بہ مراتب فوقیت دی گئی ھے۔ الطبقات و الکبری میں علامہ عبدالوھاب شعرانی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کے ایک خاص صحابی حضرت ابو درداؓ رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ھے۔ ''وکان رضی اللہ عنہ یقول تفکر ساعتہ خیر من قیام اربعین لیلتہ ،، وہ (ابودردا رضی اللہ عنہ) کہا کرتے تھے ایک ساعت کا تفکر چالیس راتوں کے قیام (عبادت و نماز) سے بہتر ھے۔

(طبقات ص ۲۱ - جلد اول)

تصوف ایک مسلک اور عقیدہ بھی ھے ایک مستقل علم اور فلسفہ بھی ھے اور ایک مخصوص حال اور وجدان بھی۔ کسی ایک ذات میں ان تینوں باتوں کا جمع ھو جانا ایک بڑی اھم بات ھے۔ مرزا غالب کا مسلک اور عقیدہ ان کے اشعار اور مختلف تحریروں سے معلوم ھو چکا ھے - لیکن اس فلسفے کے عالم کی حیثیت سے اور صاحب حال وجدان کی حیثیت سے ھم ان سے واقف نہیں ھیں - یہ واقفیت ان چند غیر مطبوعہ خطوط سے حاصل ھوئی ھے جو مرزا غالب اور حضرت جی خدانما غمگین رحمتہ اللہ علیہ کے مابین لکھے گئے اور جو حضرت غمگین کے ایک مرید خاص حضرت ھدایت النبی صاحب قادری گوالیاری نے ایک رسالے کی شکل میں مرتب کر لئے ھیں - یہ خطوط حضرت غمگین(۱) کے سجادہ نشین عالی جناب کپتان سردار سید غنی محمد شاہ حضرت جی کی ملکیت ھیں اور ان کے صاحبزادے حضرت سید رضا محمد حضرت جی کی نوازش خاص کے سبب سے میں ان سے استفادہ کر سکا ھوں۔

---

(۱) حضرت غمگین رح کا حال مختلف کتابوں میں ھے اور اتنا معروف ھے کہ اس موقع پر اس کی تفصیل غیر ضروری معلوم ھوئی - حضرت کا سنہ پیدائش ۱۱۶۷ ھ مطابق ۱۷۵۳ء اور وفات ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۱ء) ھے جب کہ مرزا غالب کا سال پیدائش ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) اور سال وفات ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۹ء ھے۔

یہ سب خط تعداد میں ۱۲ ھیں - جن میں سے نو مرزا غالب کے اور باقی حضرت غمگینؔ رحمتہ اللہ علیہ کے ھیں - مرزا غالب نے حضرت صاحب کو قبلۂ حاجات اور پیرمرشد کے القاب سے مخاطب کیا ھے اور حضرت صاحب نے مرزا صاحب کو مشفق کے لقب سے یاد فرمایا ھے ان خطوط میں سے اکثر حقائق اور مسائل تصوف کے اعتبار سے بہت اھم ھیں اور اس علم سے دل چسپی رکھنے والوں کے لئے ایک نعمت الٰہی اور لطیفۂ غیبی - لیکن انداز بیان اور فلسفیانہ اصطلاحات اور خود مسائل کے دقیق ہونے کی وجہ سے عام دل چسپی کی چیز نہیں البتہ مرزا غالب سے دل چسپی رکھنے والوں کے لئے چند انکشافات بہت اھم ھیں -

(۱) یہ کہ مرزا غالب اپنے صوفیانہ عقائد کے علاوہ عملاً بھی صوفی تھے اور شغل بیرنگی ان کا معمول تھا - یہ شغل صوفیوں میں منتہی حضرات کا شغل سمجھا جاتا ھے - اس کے علاوہ وہ فنا و بے خودی کی کیفیت سے بھی سر فراز تھے - اور یہ حال ان پر اکثر حاوی ہو جاتا تھا - اس حال کے صوفیوں کی تمام مکاتیب فکر میں بڑی قدر و قیمت ھے اور اسلامی اور غیر اسلامی صوفیوں کی ایک اھم منزل ھے -

(۲) مرزا غالب کی واقفیت فلسفہ ' ما بعد الطبیعات اور مسائل تصوف سے غیر معمولی تھی - یہ قابلیت ان کے خطوں سے بھی معلوم ہوتی ھے اور خود حضرت غمگین نے بھی اس کا اعتراف فرمایا ھے - ایک خط میں حضرت نے لکھا ھے کہ جو واقفیت آپ کو ھے وہ اس دور کے علماۂ ظاہر کو نہیں ھے -

(۳) مرزا صاحب اپنے شغل مے نوشی کو اپنے بزرگوں اور قابل احترام شخصیتوں سے بھی پوشیدہ نہیں رکھتے تھے - لیکن اپنے کمالات باطن کو اپنے احباب پر بھی ظاہر نہ کرتے تھے - در حقیقت یہ ایک بڑی نادر اور اخلاقی اعتبار سے بہت اھم خوبی ھے جس سے عموماً بڑے بڑے صاحبان باطن اور علماۂ متقی بھی محروم ھیں -

اصل مسائل کی تفصیل کے لئے پورے خطوط کا مطالعہ ضروری ھے-

پھر بھی اس مضمون سے خطوط کے مضامین اور مسائل کا بہت کچھ اندازہ ہو جائے گا ۔

حضرت غمگین اور مرزا کے ان خطوط میں خاص زیر بحث مسئلہ وحدۃ الوجود اور فنا کا ھے ۔ بے خودی یا فنا در اصل وحدۃ الوجود ھی کا ایک ذیلی یاتبعی مسئلہ ھے ۔ یہ دونوں نظریے اسلامی اور غیر اسلامی تصوف میں مشترک ھیں ۔ وحدۃ الوجود کو ان سادہ الفاظ میں بھی بیان کیا جا سکتا ھے کہ برھمایا خدا کے سوا کوئی موجود نہیں ھے۔ لیکن ارباب وحدۃ الوجود کے مختلف مکاتیب خیال ھیں ۔ ان کے فرق کو سمجھے بغیر اس مسئلے کو اچھی طرح نہیں سمجھا جا سکتا ۔ اس مسئلے کا انداز بیان اور طرز استدلال ابتدائی عہد کے اسلامی صوفیوں کا سا تھا جو قرآن وحدیث اور اس دور کی دوسری اھم تصانیف کا ھے ۔ یہ سادہ انداز بیان سنائی ، عطار اور شیخ شہاب الدین سہروردی کے زمانے تک ملتا ھے۔ اس انداز بیان کے علاوہ دوسرا انداز جو یونانی فلسفے کے اثر سے پیدا ھوا وہ شیخ محی الدین ابن عربی کا ھے ۔ شیخ اکبر محی الدین عربی شیخ شہاب الدین سہروردی کے ھم عصر ھیں ۔ وہ اپنے نظریات کا ماخذ اصل قرآن وحدیث کو ھی قرار دیتے ھیں ۔ مگر ان کے استدلال کا انداز صاف اور سادہ نہیں ھے بلکہ اس میں نو فلا طونی نظریات اور فلسفے کی اصطلاحات شامل ھو گئی ھیں ۔ ابن عربی کے بعد کی تصانیف میں منطق اور فلسفے کی اصطلاحات اور زیادہ شامل ھوتی گئیں اور جن دلیلوں سے متاخرین فلاسفہ اپنے نظریات ثابت کرتے تھے ان دلیلوں سے ھی صوفیہ نے ان کے مسلک کی تردید اور اپنے مسلک کی تائید کی ۔ مرزا غالب اور حضرت غمگین کے زمانے میں بھی یہ طرز مقبول تھی اور یہ خطوط اس طرز کا کامیاب نمونہ ھیں ۔ مولانا فضل حق خیر آبادی جو اپنے زمانے میں علوم معقول کے امام سمجھے جاتے تھے وحدۃ الوجود کے بڑے زبردست حامی تھے ۔ اس پر ان کی ایک معرکتہ الارا تصنیف بھی ھے جس کا نام ''فیض الموجودنی اثبات وحدۃ الوجود،، ھے ۔ مجھے مولانا کے بھتیجے مولانااولاد حسین صاحب خیرآبادی فرماتے تھے کو مولانا کے اثر سے ھمارے خاندان کی لونڈیاں تک وحدۃ الوجود کو حق

سمجھتی تھیں - اس کے علاوہ حسن اتفاق سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دھلوی بھی جو علوم منقول (تفسیر، حدیث وغیرہ) کے امام تھے اس مسئلے کی حقانیت کے قائل تھے اور اس وجہ سے علماء ظاھر بھی اس سے متاثر تھے - غالب اور مولانا فضل حق میں بہت زیادہ ارتباط تھا - اس لئے قیاس یہ ھے کہ علاوہ اور وجوہ کے مولانا کی صحبت بھی ان پر اثر انداز ہوئی ہوگی- لیکن یہ سب باتیں صرف علمی اعتبار سے مرزا غالب کو متاثر کر سکی تھیں اور ان کے عقیدے کے قیام میں مدد دے سکتی تھیں - مگر دیکھنا یہ ھے کہ مرزا غالب کو صوفیوں کے اشغال کے طریقے اور ان کی مشق و مزاولت کے سلیقے کیسے معلوم ہوئے -

اس بارے میں مولانا محمد حسین آزاد کی یہ اطلاع رہنمائی کر سکتی ھے کہ مرزا غالب کو مولانا فخر الدین دھلوی کے خاندان میں بیعت تھی آب حیات میں آزاد نے یہ صراحت نہیں کی ھے کہ وہ کس سے بیعت تھے - لیکن مولانا حالی نے 'یاد گار غالب' میں کئی جگہ یہ ذکر کیا ھے کہ مرزا صاحب حضرت میاں کالے صاحب کے مکان میں کئی سال رھے اور حضرت کے ذریعے سے مرزا غالب کی رسائی قلعہ معلی تک ہوئی - حضرت میاں کالے صاحب حضرت مولانا فخر الدین دھلوی کے پوتے اور جانشین تھے اور خود بہادر شاہ بھی حضرت سے بیعت تھے - اس لئے گمان غالب یہ ھے کہ مرزا غالب کو صوفیانہ تعلیمات حضرت میاں کالے صاحب ھی سے پہونچی ہونگی -

اس تمہید کے بعد اصل خطوط میں سے کچھ مخصوص موضوعات و مضامین کی طرف اشارات پر اکتفا کی جاتی ھے جس سے ان خطوط سے اجمالی تعارف بھی ہو جائے گا اور کوئی خاص قابل ذکر بات رہ بھی نہ جائے گی - اصل خط فارسی میں ھیں ان کی عبارت نقل کرنے سے قصداً گریز کیا گیا ھے - کیونکہ وہ خط حضرت جی کے خاندان کی ملکیت ھیں -

پہلا خط مرزا غالب کا ھے - یہ خط حضرت جی کے دو خطوں اور ایک غزل کی رسید میں ھے - مرزا صاحب کے جواب سے معلوم ہوتا ھے کہ حضرت جی نے مرزا صاحب سے استمزاج کیا ھے کہ میں رباعیات کے دیوان

کے دیباچے میں آپ کا ذکر کر دوں اور یہ بھی تحریر کیا ہے کہ جب دیوان رباعیات آپ تک پہنچے تو اسے غیر کی نظر سے پوشیدہ رکھئے گا ۔

مرزا غالب نے اس کا شکریہ ادا کیا ہے کہ آپ نے یہ رباعیاں میرے لئے لکھیں اور لکھا ہے کہ دیباچے میں میرا ذکر نہ صرف میرے لئے بلکہ میرے باپ دادا کے لئے باعث نازو فخر ہے ۔ دیوان رباعیات کے اخفا میں تعمیل ارشاد کی جائے گی ۔ مگر حضور نے لکھا ہے کہ غیر کی نظر سے پوشیدہ رکھنا تو یہاں غیر کون ہے ۔ یہ ایک لطیفہ کے بطور عرض کیا گیا ہے ۔ ورنہ بات یہ ہے کہ ان حقائق و معارف کے سمجھنے والے کتنے ہیں اور جو سمجھنے والے ہیں وہ غیر نہیں ہیں ۔

یہ خط دس تاریخ ذی الحجہ کو لکھا گیا سنہ درج نہیں ہے ۔

اس خط کے جواب میں حضرت جی نے تحریر فرمایا ہے کہ لفظ غیر پر جو اعترض آپ نے کیا ہے میں اس سے خوش ہوا ۔ اس جودت طبع اور سخن رندانہ کے ساتھ خدا ملاقات جسمانی بھی کرامت فرمائے ۔ غیر تو ایک بے معنی لفظ ہے ۔ اس کے معنی بھی عین ہی کے ہیں کیونکہ عین اور غیر تو دونوں حق کے نام جیسے ہادی اور عضل ۔ الفاظ سے حقیقت نہیں بدلتی لیکن اگر میں اور تو ، یہ اور وہ کے الفاظ عبارت سے نکال دئے جائیں تو عبارت کے معنی ہی سمجھ میں نہ آئیں گے ۔

اس کے بعد حضرت جی نے ابن عربی، جنبیدوشبلی کے اقوال اور احادیث کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ اسرار و رموز کو ان حضرات نے بھی پوشیدہ رکھنے کی تاکید کی ہے ۔ حالانکہ یہ لوگ تمام عالم کو عین حق سمجھتے تھے ۔ اس عالم میں ہم خود ہی اپنے غیر ہیں ۔ یہ باتیں باریک ہیں ۔ اور بغیر اس مقام پر پہنچے ہوئے سمجھ میں نہیں آتی ہیں ۔ رسول خدا کے زمانے سے آج تک تمام صوفی ان باتوں کو پوشیدہ رکھتے آئے ہیں ۔ آپ بھی میرے کہنے پر عمل کریں جب تک مجھ سے آپ نہ ملیں گے ان باتوں کا سمجھنا مشکل ہے ۔

روئی سے ہی تمام کپڑے بنے ہوئے ہیں اور کپڑا روئی کی ہی ایک شکل ہے لیکن کوئی چادر اور عمامے کو روئی نہیں کہتا - اس پر عین اور غیر کو قیاس کر لیجئے - رباعی

اس ایک وجود میں یہ کیا کیا ہے سیر
زاہد ہے حرم ہے اور غمگین ہے دیر
اسماء و صفات ہیں یہ فہمائش کے
کہنے سے عین ہو نہ کہنے سے غیر

گو چرخ چہار میں کی تجھ کو سیر
اس کا تو غیر اور تیرا ہے وہ غیر
یہ شر خودی نہ جائے جب تک تجھ سے
حاصل عینیت غمگین ہے خیر

اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ اگر آپ اسے تکبر نہ سمجھیں اور اس میں اپنا فائدہ سمجھیں تو بات یہ ہے کہ میرا غیر آپ کے عین سے اچھا ہے - رباعی

وہ شخص لطیف اور وہ فہم ہے پاک
شائستہ ہو اسپ عقل جس کا چالاک
غمگین جو رخش بے محابا ہو تیز
انسان کو شرط اس سے ہے خوف و باک

مرزا غالب نے اس خط کے جواب میں لکھا ہے وہ افسوس اور معذرت پر مبنی ہے اور خط کا ایک حصہ اسی معذرت پر صرف کیا ہے کہ میں نے عین اور غیر کے متلعق جو کچھ لکھا وہ گستاخی تھی ، حق بات یہی ہے جو حضرت نے لکھی ہے۔ میرا مقصد صرف بذلہ سنجی تھا کوئی ادعایا سرکشی نہ تھی ، خیال یہ کیا تھا کہ بات ذوق آفرین ہوگی مگر خوبی تقدیر کہ اس نے مجھے پریشانی میں ڈال دیا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ خط کے علاوہ حضرت جی نے کوئی اور خط بھی مرزا صاحب کو لکھا تھا جس میں اظہار ناراضی تھا اور دیوان رباعیات کے نہ بھیجنے کے قصد کا اظہار تھا ۔ اس

سے مرزا غالب کو بہت تکلیف پہونچی اور انہوں نے اپنی تکلیف کے اظہار کے ساتھ ھی اپنی نازک مزاجی کی طرف بھی اشارہ کیا اور لکھا کہ

''میرے رنج و غم کا سبب یہ ھے کہ آپ کا پہلا خط ارشاد و ھدایت لیکن دوسرا خط عتاب آمیز ھے جس کا تحمل میں اپنی ناتوانی کی وجہ سے نہیں کر سکتا ھوں ۔،، پھر یہ شعر لکھا ھے ۔

ما تنک ظرفاں حریف این قدر سختی نہ ایم
دانۂ اشکیم ما را گردش چشم آسیا ست

پھر لکھا ھے کہ رباعیات کے نہ بھیجنے کی شہرت میرے لئے دور باش کے ھم معنی ھے جو میرے دل کو خون کئے دیتی ھے۔ حالانکہ مجھے آپ کے وعدے سے بے اندازہ مسرت تھی اور میں منتظر تھا کہ رباعیات مجھے کب موصول ھوں ۔

اس سلسلے میں مرزا غالب لکھتے ھیں کہ آپ نے اس خط میں لکھا ھے کہ میں نے سنا ھے کہ عقل کی رسائی اور ذھن کی تیزی میں آپ تفضل حسین خاں کے ھم پایہ ھیں ۔ اس بارے میں میری گزارش یہ ھے کہ تفضل حسین خاں ایک شخص تھے جو انواع علوم کے عالم تھے ۔ طب، نجوم، ھئیت اور ھندسہ خوب جانتے تھے اور ھر قسم کے علم میں بات کر سکتے تھے ۔ میں نے تو صرف ونحوبھی نہیں پڑھی اور منطق و معانی بھی نہیں جانتا ۔ ایک نا تمام فارسی کی واقفیت سے میں ان کے مرتبے تک کیسے پہنچ سکتا ھوں ۔ اس موقع پر مجھے اپنی ایک غزل کا مطلع اور حسن مطلع یاد آ گیا :

دولت بہ غلط نہ بود از سعی پشیماں شو
کافر نہ توانی شد ناچار مسلماں شو
زین ھرزہ روان گشتن قلزم نہ توان گشتن
جوئے بہ خیاباں رو سیلے بہ بیاباں شو

اس کے بعد مرزا صاحب نے پھر تصوف کے اس خاص مسئلے کا تذکرہ

کیا ہے جو ان کا محبوب ترین نظریہ ہے ۔ انکسار کے بعد فرماتے ہیں کہ میں اتنا جانتا ہوں کہ مجھے بیرنگی کی طرف مائل کر دیا اور تھوڑی سی بے خودی عنایت کر دی ہے ۔ وجود کی تقسیم پر جیسا کہ اہل ظاہر کا اعتقاد ہے میں یقین نہیں رکھتا ۔ کیونکہ وجود ایک ہے اور ہرگز تقسیم قبول نہیں کر سکتا ، نہ اس میں تغیر تبدل واقع ہو سکتا ہے اور وجود کے مقابلے میں عدم کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے ۔ وجود اور ہستی کے علاوہ جو کچھ ہے وہ کچھ بھی نہیں ہے اور حق کے سوا جو کچھ ہے وہ باطل ہے :

ماهماں عین خودیم اما خود از وهم دوئی

درمیان ما و غالب ما و غالب حائل است

ہر قسم کے ذکر و فکر اور ذوق میں سے میرے دل کو محی الدین ابن عربی کے ایک فقرے نے اپنی طرف کھینچ لیا ہے کہ ''الحق محسوس و الخلق معقول،، (یعنی خلق کا وجود ہماری عقل و فہم کے سوا کہیں نہیں ہے اور جو کچھ بھی محسوس ہوتا ہے وہ حق کے سوا کچھ نہیں) میرا ایمان یہی ہے باقی سب وہم ہے اور اس عالم میں جو کچھ ہے از قسم نبوت و ولایت حشرو نشر ، عذاب و ثواب سب درست ہے اور ان سب پر میرا ایمان ہے ۔ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ آپ کی توجہ باطنی سے مجھے بے ارادہ اس وقت حضرت امام حسین علیہ السلام کا قول مبارک یاد آگیا ' ماشمت الا عیان رائحتہ الوجود، یعنی اعیان ثابتہ نے وجود کی بو بھی نہیں سونگھی ۔ اس موقع پر مرزا غالب نے اپنے یہ شعر لکھے ہیں ۔

چون پردۂ شب یار مصور بہ خیال است

این کار گہ وہم ز پیدائی اشیاء

اندیشہ دو صد گل کدہ گل بردہ بہ دامن

اما ہمہ از نقش و نگار پر عنقا

آئینہ بہ پیش نظر و جلوہ فراواں

دل پر ہوس و صا ب خلوت کدہ تنہا

پھر لکھتے ھیں کہ مرشد کے حضور میں ان حالات کا عرض کرنا ایسا ھے جیسے کوئی ایک گھڑا پانی کا دریا کے لئے لائے یا ایک پھول کی پنکھڑی باغ کی نذر کرے - لیکن مقصد صرف اپنے عقیدے کا اظہار ھے تاکہ معلوم ھو جائے کہ یہ عقیدہ رکھنے والا کسی چیز کا منکر نہیں ھے اور سب کو ایک کیفیت کے ساتھ قبول کرتا ھے - کفر کو بھی اوز اسلام کو بھی، عین کو بھی اور غیر کو بھی - یہ سب تصور کی حیثیت سے موجود ھیں لیکن وہ تصور نہیں جو ھم کرتے ھیں - بلکہ وہ تصور جو اس کیفیت خاص کو حاصل ھے اس موقع پر بہت ھی مناسب ھے کہ اسے سمندر اور موج اور آفتاب اور روشنی سے تشبیھہ دی جائے -

اس کے بعد مرزا غالب نے جس بات کا ذکر کیا ھے وہ بوجوہ اھم ھے اور اس سے ھمیں مرزا صاحب کے متعلق ایک عجیب اور جدید انکشاف ھوتا ھے - وہ حضرت غمگین رحمتہ اللہ علیہ کو لکھتے ھیں کہ

''سید امانت علی صاحب جو حضور کے تربیت یافتہ ھیں اکثر مجھے نوازتے رھتے ھیں اور جب خلوت میسر آتی ھے تو ان سے راز کی باتیں ھوتی ھیں - ابھی دو تین روز ھوئے کہ بیرنگی کا ذکر آ گیا - چونکہ میں آج کل بیرنگی (۱) کے نظارے میں مبتلا ھوں اس لئے میں نے اس بارے میں مبالغہ کیا - اور کہا کہ اس سے بلند کوئی اور مقام نہیں ھے - میر امانت علی صاحب نے کہا کہ اس مقام کا چھوڑنا بھی ایک مقام ھے - میں نے کہا یہ صحیح ھے لیکن کہنے کی بات نہیں ھے - بلکہ یہ ایک ایسا مقام ھے جو استغراق کی زیادتی کے بعد خود ھی حاصل ھو جاتا ھے اور اس کا حاصل کرنا

---

(۱) شغل بیرنگی صوفیوں کا ایک خاص شغل ھے جو آنکھیں کھول کر آسمان یا خلا میں نظر جما کر کیا جاتا ھے اور اس کا نتیجہ بے خودی اور ربودگی کی شکل میں نمودار ھوتا ھے جسے فنا بھی کہتے ھیں اور جس کا حصول تمام سلاسل تصوف میں بہت اھم سمجھا جاتا ھے -

مشاہدۂ بے رنگی پر توجہ کرنا ہے نہ کہ اس سے قطع نظر
کر لی جائے ———،،

پھر حضرت سے مرزا صاحب عرض کرتے ہیں کہ خدا کے لئے مجھ پر ایسی توجہ فرمائیں کہ میرا یہ شغل ترقی کر جائے تا کہ رفتہ رفتہ میں بالکل مستہلک اور مستغرق ہو جاؤں اور رنگ اور بے رنگی دونوں سے چھوٹ کر عدم محض ہو جاؤں ۔

اس خط پر صرف تاریخ دن اور وقت ہے، سنہ نہیں ہے۔ یہ خط ۲۲ محرم ہفتے کے دن چاشت کے وقت لکھا گیا ہے ۔

مرزا صاحب کے اس خط کے جواب میں حضرت شاہ غمگین نے مرزا صاحب کے عقیدے کی تصدیق و تحسین فرمائی ہے اور فرمایا ہے کہ

"مجھے خوشی ہوئی ۔ مجھے آپ سے دلی محبت ہے اور میرا دل خود بخود آپ کی طرف کھنچتا ہے ۔ میں آپ سے کیسے نا خوش ہو سکتا ہوں ۔ میں نے جو کچھ لکھا تھا محبت سے لکھا تھا ۔ آپ مجھ سے خدا کے واسطے محبت رکھتے ہیں نہ آپ کو مجھ سے کوئی دنیاوی غرض ہے نہ دینی——

اس کے بعد حضرت نے مرزا کے شغل پر تبصرہ فرمایا ہے ۔ اور حیرت مزموم اور حیرت محمود کا فرق بتایا ہے اور اپنے سلوک واشغال و واردات بیان کئے ہیں ۔ اپنے پیر اور اپنے سفر کا حال بیان فرمایا ہے ۔ اس خط سے حضرت غمگین کے مجاہدہ و ریاضت اور مقام کا اندازہ ہوتا ہے اور اس کے ساتھ یہ خط دوسرے سالکین راہ کی رہنمائی بھی کرتا ہے ۔ غالباً اسی خیال سے حضرت مرزا صاحب کو تفصیل سے اپنے حالات لکھے ہیں ۔ اس خط میں جو رباعیاں حضرت نے لکھی ہیں وہ ارباب ذوق کی خدمت میں پیش کرنا نامناسب نہ ہوگا ۔

غمگین ہوتا اگر تجھے علم یقیں
بے عین یقیں نہ ہوتی دل کو تسکیں
پھر حق یقیں کے ذوق اور شوق میں یار
ہوتا بس حق حق ترا ملت و دیں

ایک عمر رہی ہے میری اللہ کی جنگ
دیتا رہا میں شکست سو سو فرسنگ
غمگین مغلوب اب ہوا ہوں ایسا
نہ فوج رہی نہ میں نہ وہ نام و ننگ

عقل کہے جو اسے نہیں وہ عاقل
وجدانی جو سمجھے وہ نہین ہے واصل
کہتے نہ رسول ما عرفنا غمگین
جز عجز نہ ہوتی معرفت گر حاصل

تو قول علی میں اور مت لا شبہات
غمگین ہے یہی عرفت ربی کی بات
ہے فسخ عزائم اس لئے فرمایا
آتی ہی نہیں ہے علم میں کنہ ذات

ہو جس میں کہ یافت ہے وہ حیرت محمود
مذموم ہے ہو شہود جس میں نہ کشود
ہر چند کہ اس کی دید غمگین ہے محال
ممکن نہیں پر سوائے اس کے شہود

اس کے بعد حضرت جی نے لکھا ہے کہ ایک تازہ مضمون کی رباعی کہی ہے جو داد کی غرض سے آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں :

کر ظن نہ اس شراب رمانی پر مت کبر کر اپنی زھد پیشانی پر
گر کفر دوئی نہیں تجھے اے زاھد قشقهٔ کبود ہے کیوں پیشانی پر

مرزا غالب نے اس خط کے جواب میں حضرت کی اس آخری رباعی کی بہت داد دی ہے اور لکھا ہے کہ اس رباعی کے مضمون کی تازگی نے مجھے بے خود کر دیا ۔ واللہ کہ کسی سخن ور کا ذھن اس نکتے تک نہ پھونچا اور کسی نے زاھد کی پیشانی کے داغ کو قشقهٔ کبود سے تشبیہہ

نہیں دی ۔ اس کے بعد ایک رباعی کے متعلق لکھا ہے کہ شاید میر حیدر علی سے رباعی کی نقل میں سہو ہو گیا ہے ۔ کیونکہ پہلے بیت میں قافیے کے بعد 'کو' آیا ہے اور دوسرے بیت میں 'کو' نہیں ہے ۔ یہ بات قاعدہ شعر کی رو سے جائز نہیں ہے ۔ رباعی یہ ہے :

چل راہ بریدہ پائے لنگی چھوڑ
رکھ جاں کو فراخ دل کی تنگی کو چھوڑ
رنگوں میں نہ قید رہ مشائخ کی طرح
غمگین آزاد ہے تو بے رنگی چھوڑ

مرزا غالب نے حضرت کے اس فقرے کو بہت محسوس کیا ہے کہ نہ آپ کو مجھ سے غرض دینی وابستہ ہے نہ دنیاوی ۔ لکھتے ہیں کہ

آپ کے اس فقرے نے میرے دل کو بہت افسردہ اور ملول کر دیا اور میں اس بات پر مجبور ہو گیا کہ بات کو تفصیل سے عرض کروں ۔ قبلہ و کعبہ راستی میرا آئین اور محبت میرا دین ہے ۔ میں سچ کو ایمان اور جھوٹ کو کفر سمجھتا ہوں ۔ خدا گواہ ہے کہ مجھے جو ارادت اور محبت آپ سے ہے ۔ وہ شرح و بیان میں نہیں آ سکتی ——— عنایت اور عتاب دونوں التفات کا نتیجہ ہیں ۔ رہا اغراض دنیاوی ودینی کے بارے میں تو الحمداللہ کہ میرا دل ان دونوں چیزوں سے پاک ہے ۔ میں محبت کے سوا نہ دنیا سے واقف ہوں نہ دین سے ۔ میں ہیچ اور نادان ہونے کے باوجود اتنا جانتا ہوں کہ وجود ایک ہے اور ہرگز منقسم نہیں ہو سکتا ۔ اگر میں دنیا اور دین کو مان لوں تو شرک فی الوجود میں گرفتار ہو جاؤں گا، جو شرکت کی بدترین قسم ہے ۔ میرے نزدیک دین بھی دنیا کی طرح ایک نقش موہوم ہے اور وہم سے دل لگانا نہیں چاہئے ۔ دنیا کے

طلبگاروں کو دنیا اور دین کے طلبگاروں کو دین مبارک۔
هم هیں اور 'سواد الوجه فی الدارین، (۱) جس کا مطلب
هے نیستی محض ۔ اس بارے میں یه قول حق هے که اعیان
نے وجود کی بو بھی نہیں سونگھی (الاعیان ماشمت رائحته
الوجود) یہاں وجود کا مطلب اس هستی موهوم سے هے یعنی
اس هستی موهوم کا ظهور اور نمائش اور یه نمائش محض
وهم اور باطل هے اورسب کچھ محض اعتبار هے اس کی حقیقت
نہیں هے ۔ اعیان ثابته سے لے کر حشر تک جو کچھ نمائش
اور ظهور هے سب باطل هے۔ وجود میں کوئی تغیر نہیں
هوا وہ اسی ایک حالت پر هے،،

اس کے بعد مرزا صاحب نے تفصیل سے اعیان ثابته پر اظهار خیال
کیا هے اور جو بات اوپر بیان کی گئی هے اس کی تشریح کی هے ۔ اس کے بعد
بے رنگی کا ذکر اس طرح کرتے هیں اور حضرت جی نے جو ایراد کیا تھا اس
کا جواب دیتے هیں ۔

حضرت اس غلام نے اپنی نظر خلا میں نہیں ٹھہرائی هے بلکه دل
کو بے رنگی سے باندھ لیا هے اور اعیان ثابته کی بحث
میں جو ذکر کیا گیا هے یہی میرا منظور نظر هے ۔ میری
کوشش یه هے که میں اپنی اصل نیستی کی طرف لوٹ
جاؤں ۔ نه میں فکر جانتا هوں نه شغل ع دانی همه اوست
ورنه دانی همه اوست، تحریر میں تقریر کی سی بات نہیں
آ سکتی میں اس دن کا آرزومند هوں که شرف قدمبوسی حاصل
کروں اور آپ کی زباں سے آپ کے ارشاد سنوں ۔ آپ نے فرمایا

---

(۱) صوفیه ایک حدیث بیان کرتے هیں اَلفقر سوادالوجه فی الدارین،
فقر دنیاودین کی روسیاهی هے اور اس کا مطلب وهی بیان کرتے هیں جو
مرزا غالب نے بیان کیا هے یعنی نیستی محض
از سوادالوجه فی الدارین اگرداری خبر چشم بکشا و جمال کفر و فقر مانگر

ہے کہ تمہارے تصوف کی طرف سے مجھے پورا اطمینان ہو
گیا تو جناب واقعہ یہ ہے کہ میں تو ایک بے علم اور
جاہل سپاہی زادہ ہوں ۔ میرے باپ دادا صحرا نشین ترک
تھے ۔ میں دو ایک مصرعے موزوں کر لیتا ہوں اور ایک
دو لطیفے ہر فن کے کہہ لیتا ہوں ۔ تصوف سے میرا کیا
تعلق اور درویشی سے مجھے کیا نسبت ۔ میرا حال اس سے
زیادہ نہیں ہے کہ وحدت وجود اور اشیا (موجودات) کا معلوم
ہونا میرے خمیر میں ڈال دیا گیا ہے اور 'حق محسوس ہے
اور خلق معقول، میرا عقیدہ بنا دیا گیا ہے میں اتنا جانتا
ہوں کہ صرف ایک موجود ہے اور اس کے سوا کچھ موجود نہیں
ہے اس کے سوا میری ہمت، کوشش و ریاضت اور دولت و مال
صرف ایک دو شراب کے پیمانے پر منحصر ہے جو رات کو پی
لیتا ہوں اور مست ہو کر سو جاتا ہوں نہ دین سے واقف
ہوں اور نہ دنیا سے ۔ اللہ بس ماسوی ہوس ۔ حاضر ہونے
اور سفر کرنے میں گرمی اور بے سامانی مانع نہیں ہے
ایک خرقہ تن پر ڈال لوں اور روانہ ہو جاؤں ۔ مگر میرا
مقدمہ جو ولایت گیا ہوا ہے اسے دو سال ہو گئے ۔ مجھے
امید ہے کہ امروز فردا یا ہفتے اور مہینے دو مہینے بعد
ولایت سے حکم آ جائے گا اور اس وقت میں گوالیار روانہ
ہو جاؤں گا ۔''

اس خط پر ۱۸- ربیع الاول روز شنبہ ہنگام نیمروز ۱۲۵۵ ھ درج
ہے ۔

اس خط کے جواب میں حضرت جی نے جو خط مرزا غالب کو لکھا ہے
اس میں وضاحت اور فراخ دلی سے اس کا اعتراف فرمایا ہے کہ

''رباعی میں قافیے کی غلطی سہو کاتب کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ میری
بے حواسی اور پریشان خیالی اس کا سبب ہے ۔ یہ ایسی غلطی
ہے جو کوئی نادان بھی نہ کرے گا حالانکہ تقریباً بیس

دفعه میں نے اس رباعی کو پڑھا لیکن اس عیب کی طرف خیال ہی نہ گیا اگر آپ اس کی اصلاح نہ کرتے تو یہ رباعی دیوان میں اسی غلطی کے ساتھ درج ہو جاتی ـــــ

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ

''اسی سبب سے میں نے بارہا آپ کو لکھا ہے کہ چونکہ اللہ تعالی نے آپ کو فن سخنوری میں یکتائے زمانہ کیا ہے لہذا آپ میرے دیوان کو اول سے آخر تک اصلاح کی نظر سے دیکھ لیں لیکن آپ تساہل سے کام لیتے ہیں ۔ اگر آپ مجھ سے محبت رکھتے ہیں تو میری اس عرض کو ضرور قبول کر لیں ۔ یہاں میرے ہم نشینوں کو اتنی جرأت نہیں ہے کہ اغلاط پر مجھے مطلع کریں،، ۔

اس کے بعد مرزا غالب کی حقائق فہمی کا ان الفاظ میں اعتراف فرماتے ہیں ۔

''آپ کو علم تصوف میں جو دستگاہ ہے جس کا اظہار آپ کے خطوں سے ہوا وہ علمائے ظاہر کو بھی نہیں ہے ـــــــ،،

اس کے بعد اعیان ثابتہ کی بحث کے متعلق فرماتے ہیں کہ

''اس قول میں (اعیان نے وجود کی بو بھی نہیں سونگھی) وجود سے مراد وھمی وجود نہیں ہے بلکہ اعیان تو عین ذات ہیں ۔ آپ نے جو تشبیہہ اس سلسلے میں آفتاب کی شعاعوں کی دی ہے وہ مجھے صحیح معلوم نہیں ہوتی ۔ آفتاب میں شعاعوں کا احساس تو نقصان بصارت کا سبب ہے ورنہ جو لوگ کہ آفتاب کا مشاهده کرتے ہیں ان کو شعاعیں نظر نہیں آتیں چنانچہ میں نے بھی ابتدا میں دو سال تک یہ کام کیا ہے (۱)،،

---

(۱) اسے شغل آفتابی کہتے ہیں ۔ صبح کو طلوع آفتاب کے وقت آفتاب پر نظر جماتے ہیں اور اس کے ساتھ کچھ تصور بھی کیا جاتا ہے ۔

اس کے بعد تنزلات کا بالاجمال بیان فرما کر فرماتے ھیں کہ :

یہ قول (اعیان نے وجود کی بو بھی نہیں سونگھی) حضرت امام حسین علیہ السلام کی طرف کسی نے بھی منسوب نہیں کیا ھے اگر آپ نے کسی معتبر کتاب میں یہ قول حضرت امام کی طرف منسوب دیکھا ھو تو مجھے بھی مطلع فرمائیں (۱) - آئندہ سے مسائل تصوف کو ملاقات پر موقوف رکھئے - مجھے آپ کا آزادانہ رویہ بہت پسند ھے اور اس لئے میں آپ کی ملاقات کا خواھش مند ھوں - اگر ایسا شاھباز ھاتھ آ جائے تو پھر سوائے عنقا کے شکار کے کسی طرف توجہ نہ کرے گا - شاہ جہان آباد (دھلی) میں ھزاروں آدمی ھیں لیکن مجھے ان سے کیا تعلق - وہ لوگ تو لانبی داڑھی کتری ھوئی مونچھیں، تسبیح اور ڈھیلے ڈھالے جبے چاھتے ھیں اور یہ چیزیں یہاں کہاں - میں آپ کے طریقے سے بہت خوش ھوں - خدا تعالی آپ کی بیرنگی میں ترقی دے- جب مجھ سے ملاقات ھوگی تو میں اس کی تائید کروں گا - یہ طریق میرا پسندیدہ ھے

ازدروں شو آشنا و از بروں بیگانہ وش
ایں چنیں زیبا روش کم می بود اندر جہاں

دیوان رباعیات بھی تیار ھو جائے تو وقت ملاقات آپ کو دوں گا -

اس خط پر بھی ۱۲۵۵ ھجری درج ھے - مرزا غالب نے اس خط کا جو جواب لکھا ھے وہ کلیات نثر غالب میں درج ھے اور سوائے اظہار عقیدت

---

(۱) معلوم نہیں مرزا غالب کے ذھن میں یہ کس طرح جاگزیں ھو گیا کہ الاعیان ماشمت رائحتہ الوجود حضرت امام حسین علیہ اسلام کا قول ھے - در اصل یہ قول شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کا ھے- حضرت امام کے زمانے میں اعیان وغیرہ کی اصطلاحین عرب میں نہیں پھونچی تھیں -

کے کوئی خاص بات اس میں نہیں ھے ۔ اس کے بعد پھر مرزا غالب کا خط ھے جو اس مجموعے میں مرزا غالب کا پانچواں خط ھے ۔ کوئی بات قابل ذکر اس میں بھی نہیں ھے سوائے اس کے کہ مرزا صاحب نے اس بات کو قبول کر لیا ھے کہ مسائل وحدت و کثرت آئندہ خطوط میں بیان نہ کئے جائیں گے اور ملاقات پر موقوف رکھے جائیں گے ۔

اس کے بعد مرزا غالب کا چھٹا خط ھے۔ یہ خط مرزا غالب نے اسی انداز سے شروع کیا ھے کہ عبارت کا رخ مسائل تصوف کی طرف پھر گیا ھے ۔ فرماتے ھیں ''میں کافر ھوں اگر کبھی میں نے غیر سے شکرو شکوہ کیا ھو ۔ کسی نے (۱) کیا خوب کہا ھے

دریا به وجود خویش موجے دارد
خس پندارد که این کشاکش با اوست

اس خط میں بھی وحدت وجود کا ذکر اور فنا و عدم محض ھو جانے کی تمنا ھے ۔ اس خط پر ۳۰ ربیع الثانی پیر ۱۲۵۳ھ لکھا ھے غالباً سنہ کی نقل میں غلطی ھوئی ھے ۔

مرزا غالب کا ساتواں خط ۲۷ شعبان ۱۲۵۵ھ منگل کا لکھا ھوا ھے ۔ اور حضرت صاحب کی رباعیات کی ستائش و ثنا پر مشتمل ھے ۔

آٹھواں خط بھی حضرت صاحب کے نام ھے اس میں حضرت کے دیوان کی تعریف اور اس کے پہونچنے کی رسید اور شکریہ ھے ۔ اس خط میں وحدۃ الوجود کا ذکر اور اپنا نظریہ اور حال مختصراً بیان کرکے دعا و توجہ کی خواھش کی ھے ۔

---

(۱) جہاں تک مجھے یاد ھے یہ رباعی سحابی کی ھے ۔ اس کا پہلا بیت یہ ھے

عالم به خروش لا اله الا هو ست
غافل به گماں که دشمن است او یا دوست

نویں خط میں مرزا غالب نے لکھا ہے کہ احباب نے دلی میں طرح دی تھی - اس میں میں نے دس شعر کہے ہیں جو بنظر اصلاح حاضر کر رہا ہوں - غزل کا مطلع یہ ہے

در وصل دلازاری اغیار نہ دانم
دانند کہ من دیدہ ز دیدار نہ دانم

اس خط پر تحریر تاریخ ۱۸ - رجب ۱۲۵۵ھ درج ہے -

مرزا جعفر حسین

مرزا غالب کا فارسی کلام

تقریباً سو سال کے اندر جتنا مطالعہ غالب کا کیا گیا ہے، کتابیں، مضامین، رسائل، تحقیقاتی مقالے اور عقیدت مندانہ خراج تحسین یا مخالفانہ نقد و تبصرہ سے بھرے ہوئے دفتر تیار کئے گئے ہیں اتنا کسی اور کے بارے میں نہیں لکھا گیا اور نہ کوئی دوسرا شاعر یا ادیب اتنا بڑا مرکز توجہہ بن سکا ۔ اس کی وجہ بقول پروفیسر احتشام حسین یہ ہے کہ '' لوگ غالب کو اپنے آئینہ میں اور غالب کے کلام کو آئینہ بنا کر اس میں اپنی شخصیت کو دیکھنا چاہتے ہیں ۔،،

لیکن جو کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جا رہا ہے اس کا بیشتر حصہ مرزا کے بے حد مختصر اردو دیوان سے متعلق ہے جس کو وہ خود،، بیرنگ من ست،، کہہ کر سبک کر چکے تھے ۔ ان کو اگر اپنے کلام پر ناز تھا تو فارسی کلام پر جس کا اچھا خاصا ضخیم کلیات ہمارے پاس موجود ہے مگر ہم نے اس پر آج تک اتنی توجہ نہیں کی جس کا وہ مستحق ہے ۔ مرزا کی اس کلام کے متعلق جو اپنی رائے ہے وہ ان دو شعروں سے واضح ہو جاتی ہے ۔

فارسی بین تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است

فارسی بین تابدانی کاندر اقلیم خیال
مانی و ارژنگم و آن نسخۂ ارتنگ من ست

مرزا کے اس قول سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اپنے فارسی دیوان کو ارتنگ کا مرتبہ دے کر اقلیم خیال میں اپنے کو مانی وارژنگ کا ہم پلہ قرار دیتے تھے ۔ ان کا فارسی کلام ان کے اس قول کو صحیح ثابت کرنے کے لئے کافی ہے ۔

یہ سچ ہے کہ مرزا کی مادری زبان فارسی نہیں تھی - ان کا ماحول ایرانی نہیں تھا طبیعتاً بھی وہ کنار آب رکنا باد و گل گشت مصلے، کے شیدائی نہیں تھے - شیراز و اصفہان اور سمرقند و بخارا کی یادیں اگر ان کے دل میں موجزن ہوتی تھیں تو صرف اس لئے کہ ہندوستان کے بہشت میں ان کے لئے آدم کا وجود عنقا تھا وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ

سخن نیست در لطف این قطعہ غالب
بہشتے بود ہند کہ آدم ندارد

اپنے معاصرین میں ان کو انسانیت اور انسانی ہمدردی کا اتنا فقدان محسوس ہوتا تھا کہ وہ یک لخت آدمیوں کی صورت سے ڈرنے لگے تھے اور آدمیوں سے دور رہنا چاہتے تھے - اس خیال کا اظہار انھوں نے متعدد بار اور طرح طرح سے کیا ہے اس مقام پر صرف ایک اردو اور ایک فارسی شعر پیش کر دینا کافی ہوگا -

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد
ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں

مرا ز روز قیامت غمے کہ ہست این ست
کہ روئے مردم دنیا دوبارہ باید دید

مردم گزیدگی سے تکلیف کا اظہار غالباً ان دو طریقوں سے بہتر کیا ہی نہیں جا سکتا - لیکن اپنے بھائی بندوں کے ہاتھوں جو تکلیفیں اٹھائی تھیں ان کے احساس کے باوجود مرزا کے دل میں ہندوستان کے شہروں، ہندوستان کے میوؤں اور ہندوستان کے پانی سے وہ محبت تھی کہ وہ ''کنار آب رکنا باد،، کو سوچ ہی نہیں سکتے تھے - آم سے ان کو عشق تھا اور اس ہندوستانی پھل کو وہ جنت کے میوؤں پر ترجیح دیتے تھے - کہتے ہیں -

ہمہ گر میوۂ فردوس بخوانت باشد
غالب آن انبہ' بنگالہ فراموش مباد

ہندوستان کے پانی میں دریائے سون سے ان کا گہرا تعلق تھا ۔ متعدد مقامات پر دریائے سون کا ذکر آیا ہے ۔ اور اس کے پانی کی تعریف کی ہے ۔ انھوں نے ہر مقام پر لفظ سوھن استعمال کیا ہے۔ مگر سمجھنے والا بھی سمجھنے پر مجبور ہے کہ ان کی مراد دریائے سون ھی ہوگی۔ کہتے ھیں ۔

مرحبا سوھن و جاں بخشی آبش غالب
خندہ بر مگر ھئی خضر و سکندر دارم

ہندوستان کے شہروں کا جب وہ ذکر کرتے ھیں تو ان کے انداز کلام ھی سے ان کے دل کی گہرائیوں کا پتہ چل جاتا ہے ۔ ایک فارسی قطعہ میں 'محرم سرائے سرور' سے مکالمہ ھوتا ہے ۔ یہ 'محرم سرائے سرور' صرف مرزا کی روح ہے ۔ اس مکالمہ میں مختلف شہروں کے بارے میں سوالات ھیں اور ان کے جوابات ۔ ان جوابات ھی کو دیکھ کر مرزا کے جزبات کا صحیح پتہ چل جاتا ہے ۔ فرماتے ھیں :

گفتم اکنوں بگو کہ دھلی چیست گفت جان ست واین جہانش تن
گفتمش چیست این بنارس گفت شاھدے ھست محو گل چیدن
گفتمش چون بود عظیم آباد گفت رنگیں تر از فضائے چمن
گفتمش سلسبیل خوش باشد گفت خوش تر نہ باشداز سوھن
حال کلکتہ باز جستم گفت باید تعلیم ھشتمش گفتن

ان اشعار کا مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ مرزا ہندوستان کے ماحول اور یہاں کے روایات میں اتنا ڈوب چکے تھے کہ ان کو بیرونی ماحول اور کیفیات سے متاثر ہونے کی ضرورت ھی باقی نہ تھی ۔ اس لئے ان کے فارسی کلام کے محاسن اور زیادہ توجہ کے مستحق ھیں ۔ اسی سلسلہ میں یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ فارسی شعراء میں مرزا جن اساتذہ سے متاثر ہوئے وہ وھی شعراٗ تھے جو ہندوستان میں آکے بس گئے تھے جنھوں نے ہندوستان ھی کو اپنا گھر بنا لیا تھا جیسے نظیری ، ظہوری عرفی اور بیدل ۔

ان اساتذہ سے لگاؤ اور ایرانی ماحول سے فطری دوری کا یہ اثر ضرور ہوا کہ مرزا کے یہاں حافظ و خیام کی سرمستی و چاشنی، سعدی کی سادگی، فردوسی کی ایسی رفعت خیالی، قاآنی کا شکوہ الفاظ، انوری کا لب و لہجہ اور دوسرے خالص ایرانی شاعروں کے وہ خصوصیات جو ایرانی ماحول و وراثت سے متعلق ہیں بہت کم ملتے ہیں لیکن پھر بھی مرزا ہی کا یہ دم خم تھا کہ انہوں نے ان خصوصیات کو بھی حاصل کرکے چھوڑا اور پھر ان لسانی اور وجدانی خصوصیات میں تفکرو تعقل کی گہرائیوں، حسن و عشق کی معاملہ فہمیوں ، تصوف کی محو کر دینے والی منزلوں، انسانی کردار کی بلندیوں اور انسانی جزبات کی صحیح ترجمانی کے معیار کو شامل کرکے اپنے فارسی کلام میں وہ چار چاند لگا دیئے جس کی مثال کسی دوسرے شاعر کے یہاں ملنا بہت مشکل ہے -

مرزا نے اپنے ابتدائی مشق سخن میں بیدل کی تقلید کرنا چاہی تھی - چنانچہ ان کے اردو دیوان میں بہت سے ایسے شعر ملیں گے جو بیدل کے رنگ میں کہے تھے - فارسی میں بھی اس کے بہت سے نمونے موجود ہیں - مثال کے طور پر مرزا اور بیدل کی ایک ہم غزل کے کچھ شعر پیش کئے جاتے ہیں :

هر طرف نظر کردیم هم بخود سفر کردیم (بیدل)
اے محیط حیرانی این چه بیکرانیهاست

در کشاکش ضعفم نگسلد روان ازتن
(غالب) اینکه من نمی‌میرم هم ز ناتوانیها ست

ما ز سیر این گلشن عشوۂ طرب خوردیم (بیدل)
ورنه چشم واکردن عبرت امتحانیهاست

از خمیدن پشتم روے بر قفا باشد
(غالب) تا چها دریں پیری حسرت جوانیهاست

ساز ما شکست دل یار ازیں نوا غافل (بیدل)
به که پیش خود نالیم ناله بیزبانیهاست

کشتهٔ دل خویشتم کز ستمگران یکسر
دید دلفریبیہا گفت مہربا نیہاست

باعدو عتابستے و ز منش حجابستے
او چه دلربا ئیہا ے چه جانستانیہاست
(غالب)

ان اشعار کا موازنہ ثابت کر دے گا کہ بیدل کی تقلید کرنے کے باوجود مرزا کی انفرادیت ثابت ہے اور ان کا وہ طرز جو آگے پڑھکر خود انہیں کا انداز سخن کہلایا اور بن گیا اس کلام میں بھی موجود ہے ۔ ورنہ دلفریبیوں کو مہربانی کہنے، نہ مر جانے کا سبب ناتوانی کو قرار دے دینے اور پیری میں حسرت جوانی کا نمونہ پیش کرنے کی ترجمانی نہ ہوتی- یہی وہ مقامات ہیں جہاں مرزا غالب آپ اپنی مثال ہیں اور کوئی دوسرا ان کا ہم پلہ یا مد مقابل نظر نہیں آتا ۔

مرزا کی فطری صلاحیتوں میں ان کے مطالعے اور دقیقہ سنجی نے بھی اضافہ کر دیا تھا ۔ مرزا نے اگر بیدل کی تقلید کی تو اسی ایک زاویهٔ نگاہ کے وہ پابند نہیں رہے ۔ انھوں نے ہر اس شاعر کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا جس کو وہ اساتذہ کی صف میں جگہ دینے کے لئے تیار تھے اور ہر ایسے استاد سے کچھ نہ کچھ اکتساب کی جدوجہد بھی کی تھی ۔ چنانچہ اپنے فارسی کلیات کی تقریظ میں وہ خود لکھتے ہیں :

''شیخ علی حزیں بخندهٔ زیر لبی بیراهه روئی مرا در نظرم جلوه گرساخت ۔ و ز ہر نگاه طالب آملی و برق چشم عرفی شیرازی مادهٔ آن ہرزه جنبش ہائے ناروا در پائے ره پیمائے من بسوخت ۔ ظہوری بسرگرمی گیرائی نفس حرزے ببازوے و توشه بر کرم بست و نظیری لا ابالی خرام بہنجار خاصه خودم بچالشں آورد ۔ اکنوں به یمن فره پرورش آموختگی این گروه فرشته شکوه کلک رقاص من بخرامش نزروست و برامش موسیقار بجلوه طاؤس ست و به پرواز عنقا ۔،،

متذکرہ بالا بیان کا دقیق مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ مرزا کی نگاہ میں شیخ علی حزیں اور طالب آملی کے مقابلہ میں ظہوری اور نظیری کا پلہ بھاری تھا اور عرفی کا مقام ان دونوں کی منزلوں کے درمیان میں - اس وضاحت کا ثبوت خود مرزا کے اشعار سے بھی مل جاتا ہے -

عرفی کے بارے میں کہتے ہیں :

کیفیت عرفی طلب از طینت غالب جام دگراں بادۂ شیراز ندارد
قافیہ غالب چو نیست پرس ز عرفی گرمن فرہنگ بودمے چہ غمستے

گشتہ ام غالب طرف بامشرب عرفی کہ گفت
روے دریا سلسبیل و قعر دریا آتش ست

ان اشعار سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مرزا اپنی 'طینت، میں کیفیت عرفی کا اکتساب اور الفاظ کی بہتات میں عرفی سے فیض حاصل کر کے مشرب عرفی کے ہم نوا بننا چاہتے تھے اور اس ہم نوائی کو حاصل کرنے کے بعد بھی ان کا کلام یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ ہر جگہ اپنے مخصوص ذوق فکر اور طرز ادا کو برقرار رکھتے ہوئے عرفی سے ٹکر لیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں کچھ شعر عرفی اور غالب کے دونوں کی علحدہ علحدہ طنیت اور بلند خیالی کے ثبوت میں پیش کئے جاتے ہیں - :

صبحدم چون در دمد دل صور شیون زاے من
آسماں صحن قیامت گردد از غوغاے من
(عرفی)

زان نمی ترسم کہ گردد قعر دوزخ جاے من
واے گر باشد ہمیں امروز من فرداے من
(غالب)

اقبال کرم میگزد ارباب ہمم را
ہمت نخورد نیشتر لاؤ نعم را
(عرفی)

آوارهٔ غربت نتواں دید صنم را
خواهم که دگر بتکده سازند حرم را
(غالب)

یہ دونوں مطلع قصائد کے ہیں ۔ عرفی اور غالب کی ایک ہم طرح غزل کا موازنہ بھی اس مقام پر دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس لئے کہ دونوں کا مخصوص طرز ادا اور دونوں کے سوچنے اور اظہار خیال کے رجحانات اسی ایک غزل سے واضح ہو جائیں گے :

جنگ آتش آشتی آتش مدارا آتش ست
خوش سروکارے ازاں بد خو مرا با آتش ست
بادہ خواهی باش تا از غم بروں آرم که من
انچه درجام و سبو دارم مهیا آتش ست
آب حیواں می کنم در جام و آتش میخورم
بادہ باشاهد ہے ناب ست و تنها آتش ست
هم سمندر باش و هم ماهی که درجیحون عشق
روے دریا سلسبیل و قعر دریا آتش ست
با که گویم سرایں معنی که نور حسن دوست
با دماغ من گل و با چشم موسا آتش ست
(عرفی)

سینه بکشودیم و خلقے دید کا ینجا آتش ست
بعد ازیں گویند آتش را که گویا آتش ست
انتظار جلوهٔ ساقی کبابم می کنند
مے به ساغر آب حیواں و به مینا آتش ست
بے تکلف در بلا بودن به از بیم بلاست
قعر دریا سلسبیل و روئے دریا آتش ست
گریهٔ دارم که تا تحت الثری آب ست وبس
نالهٔ دارم که تا اوج ثریا آتش ست
پاک خور امروز و ز نهار از پے فردا منه
در شریعت باده امروز آب و فردا آتش ست
(غالب)

عرفی سے اکتساب فیض اور پھر اس فیض میں جدت آفرینی مرزا کا
طرۂ امتیاز تھا جو اوپر کی دونوں غزلوں سے ظاہر ہوتا ہے - یہی حالت
اور دوسری غزلوں کی بھی ہے جو مرزا نے عرفی کی طرحوں میں کہی ہیں -
عرفی کے علاوہ مرزا نے نظیری اور ظہوری سے بھی برابر کی ٹکر لی ہے -
ہو سکتا ہے کہ ہر مقام پر مرزا کا پلہ بھاری نظر نہ آئے لیکن جہاں تک
بلندی فکر، جزبات نگاری، حقیقت کی بے نقابی اور ایک اعلا کردار پیش کرنے
کا تعلق ہے اس میں مرزا کا مرتبہ کسی طرح بھی ان شعراً سے کم نہیں
ہے - اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ مرزا نے ان دونوں اساتذہ کے کلام
کا بخوبی مطالعہ کیا تھا اور ان دونوں شعرا کے کردار کو بھی اچھی
طرح سمجھا اور پرکھا تھا - ظہوری کی طبیعت مرزا کی طرح دقیقہ سنج
تھی - دونوں کے یہاں ندرت خیال کے اعلی نمونے ملتے ہیں- انسانی
کردار کا معیار دونوں کی نظر میں یکساں طور پر بلند تھا اور خواہشات و
جذبات کی ترجمانی میں دونوں ہم آہنگ تھے - یہی وجہ ہے کہ مرزا
نے ہر مقام پر ظہوری کا احترام ملحوظ رکھا اور بڑے بلند الفاظ میں ان کو
یاد کیا ہے - مثال کے طور پر یہ اشعار پیش کئے جاتے ہیں -

غالب از جوش دم ما تربتش گلپوش باد
پردۂ ساز ظہوری را گل افشاں کردہ ایم

غالب از اوراق ما نقش ظہوری دمید
سرمۂ حیرت کشیم دیدہ بدیدن دھیم

غالب از من شیوۂ نطق ظہوری زندہ گشت
از نوا جان در تن ساز بیانش کردہ ایم

زلہ بردار ظہوری باش غالب بحث چیست
در سخن درویشی باید نہ دکان دارئیے

بہ نظم و نثر مولانا ظہوری زندہ ام غالب
رگ جان کردہ ام شیرازہ اوراق کتابش را

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ مرزا کا طرز ادا اور ان کی ندرت خیال
جس طرح آپ اپنی مثال ہے وہی حالت ان کی انفرادیت کی بھی ہے

جو ظہوری کو قابل احترام سمجھنے کے بعد بھی ان کی تاسی میں جھلک رہی ہے - مثال کے طور پر لیجئے - ظہوری نے ''آستانش را،، اور ''پاسبانش را،، کی ردیف اور قوافی میں غزل کہی ہے - مرزا نے اپنی طبع ازمائی کے لئے قافیہ بدل کے راہ نکالی - دونوں کی ہم بحر غزلوں کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں -

شب از مژگان تر رفتم غبار آستانش را
پشیما نم که کارے یاد دادم پاسبانش را
فگندی بیستونے کاش، پیش سخت جان خود
که دیدی باوجود ناتوانیہا توانش را
بجاہ عشق با سرمایۂ دارم سر سودا
که صد جان ست قیمت یک نگاہ رائگانش را
ببستاں چوں روم برمسند تعلیم ننشینم
که بلبل بگزراند پیش من درس فغانش را

(ظہوری)

سپردم دوزخ و آں داغہاے سینہ تابش را
مرا بے بود در رہ تشنۂ برق عتابش را
ندانم تا چہ برق فتنہ خواہد ریخت برہوشم
تصور کردہ ام بگسستن بند نقابش را
سوار توسن نازست و برخاکم گزر دارد
ببال اے آرزو چندانکہ دریابی رکابش را
خیالش صید دام پیچ و تاب شوق بود اما
من از مستی غلط کردم بشوخی اضطرابش را

(غالب)

اس طرح مرزا نے یہ بھی ستم ظریفی کی ہے کہ بعض مقامات پر بحر بدل کے اور کہیں ردیف میں فرق کرکے ظہوری سے ٹکر لی ہے اور

اپنی انفرادیت کو پوری طرح ظاہر کر دیا ہے - مثال میں دو غزلوں کے کے چند شعر پیش ہیں - پہلی غزل میں صرف ردیف کا فرق ہے :

ازدم تیغ نگاہ تن بہ تپیدن دھم
سرمہٴ حیرت کشم دیدہ بہ دیدن دھم
از روش جلوۂ آہ براہ افگنم
و ز خلش غمزۂ خون بچکیدن دھم
توبہٴ پرھیز را کردہ شکستن درست
محضر ناموس را زیب دریدن دھم
آمدہ نزدیک لب حرف کسے دورنسیت
کہ بن ہرموئے را گوش شنیدن دھم
(ظہوری)

سوخت جگرتا کجا رنج چکیدن دھیم
رنگ شوائے خون گرم تا بپریدن دھیم
جلوہ غلط کردہ اند رخ بکشا تاز مہر
ذرۂ وپروانہ رامشردۂ دیدن دھیم
شیوۂ تسلیم ما بودہ تواضع طلب
درخم محراب تیغ تن بخمیدن دھیم
خیر کہ راز دروں در جگر نے دمیم
نالہ‌ٴخود را زخویش داد شنیدن دھیم
(غالب)

دوسری غزل میں بحر کا فرق ہے - مگر اس فرق کے باوجود مرزا کو ظہوری کی تاسی کا احساس تھا اس لئے مقطع میں اس کو یاد کر لیا -

''زلہ بردار ظہوری باش غالب بحث چسیت
در سخن درویشی باید نہ دکان دارئیے''

اب دونوں کی غزلیں ملاحظہ ہوں :

عزتم شد عزتے از خواریے
گشت آسان بود گر دشوارئیے
مژدہ از من بخت خواب آلودہ را
بستہ ام افسانہ بیداریئے
در زمین سینہ کشتم تخم داغ
دارد ابردیدہ اخگر کاریئے
از برائے صبر نافرمان خویش
می نویسم نامہٴ بیزاریئے

کافرم گر از تو باور با شدم غمخوارئیے
آزمند التفاتم کردہ ذوق خوارئیے
ازکنار دجلہ آتش خانہ چنداں دور نیست
کشتی ما برشکستن زودرستان یاریئے
شاد باش اے غم زبیم مرگ ایمن ساختی
گشت صرف زندگانی بود گر دشواریئے
برق از قہرت کباب بیمحابا سوزیئے
مرگ از لطفت ہلاک درد مند آزاریئے

آرزوے یار ئی دارم ز یار	باخرد گفتم چه باشد مرگ بعد از زندگی
کاش می آمد ز من اعیاریئے	گفت ہے خواب گرانے از پس بیدارئے
بیعلاجم درخوشامد ہاے غیر	اے دل از مطلب گزشتم دستگاہت راچہ شد
عشق دارد نیز دنیا داریئے	شیونے شورے فغانے اضطرابے زاریئے
(ظہوری)	(غالب)

ظہوری کے مقابلے میں نظیری کی ہم طرح غزلیں مرزا کے کلام میں زیادہ تعداد میں ملتی ہیں ۔ اس کی غالباً وجہ یہ ہے کہ مرزا اگر ایک طرف ظہوری کے تعمق فکر اور ندرت خیال سے متاثر تھے تو دوسری طرف نظیری کے لطافت بیان اور حسن ادا کے بہت زیادہ دلدادہ تھے ۔ نظیری نے حسن و عشق کے معاملات جس لطیف پیرایہ میں بیان کئے ہیں اس کی مثال دوسری جگہ کم ملتی ہے ۔ مرزا نے اس باب میں نظیری کی تاسی کرنے کی بے حد کوشش کی ہے ۔ بعض مقامات پر وہ نظیری کے ہم پلہ بھی نظر آتے ہیں ۔ لیکن ان کی یہ جدو جہد بسا اوقات اس لئے ناکام رہی کہ ان کی دقیقہ سنج اور مشکل پسند طبیعت نظیری کے لطافت اور اسلوب سخن کو قبول نہ کر سکی ۔ اس کا احساس خود مرزا کو بھی تھا اور وہ کہہ اٹھتے تھے کہ

''جواب خواجہ نظیری نوشتہ ام غالب خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم،، :

اس شعر کا دوسرا مصرع بھی نظیری کا ہے ۔ اس مقام پر مرزا غالب اور خواجہ نظیری کی بعض ہم طرح غزلوں کا موازنہ ان دونوں اساتذہ کے علحدہ علحدہ رجحانات الگ الگ اسلوب سخن اور بالخصوص مرزا کی انفرادیت کو ثابت کرنے کے لئے کار آمد ہوگا ۔ ایسی تین غزلوں کے کچھ اشعار درج کئے جاتے ہیں :

کجا بودی کہ امشب سوختی آزردہ جانے را (نظیری)
بقدر روز محشر طول دادی ہر زمانے را

بہ پایان محبت یادمی آرم نمانے را
کہ دل عہد وفا نا بستہ دام دلستانے را (غالب)

سوائے کن زمن امروز تا غوغا به شهر افتد (نظیری)
که اعجاز فلانے کرد گویا بے زبانے را

فسونے کو که بر حال غریبے دل بدردآرد
(غالب) بد اندیشے باندوه عزیزان شاد مانے را

کتاب هفت ملت گربخواند آدمی عامیست (نظیری)
نخواند تا ز جزو آشنائی داستانے را

ندارم تاب ضبط راز ومی ترسم زرسوائی
(غالب) مگر جویم ز بهر همزبانی بیزبانے را

بهر جنسے که می گیرند اخلاص و وفا خوب ست (نظیری)
پس ازعمرے گزر افتاد برما کاروانے را

بیا در گلشن بختم که درهر گوشه بنمایئم
(غالب) زجوش لاله و گل‌درحنا پائے خزانے را

دلاسیلاب خوں را از شگاف سینه بیروں کن (نظیری)
که امشب سوده ام بردیده خاک آستانے را

کمال درد دل اصل ست درترکیب انسانی
(غالب) بخون آغشته اند اندر بن هر موئے جانے را

نمی دانم نظیری کیست چوں می آمدم زاں کو (نظیری)
بحال مرگ دیدم بر سره ناتوانے را

به شهراز دوست بعد از روزگارے یافتم غالب
(غالب) زعنوان خطے کزراه دور آمد نشانے را

ظاهر هے که نظیری کی غزل بہت بلند هے ۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ یه بات بھی ملحوظ رکھنے کی هے که نظیری کی یه غزل اس کی بہترین غزلوں میں هے اور حسن و عشق کی معامله بندی جو نظیری کا طرۂ امتیاز هے اس غزل میں معراج کمال پر ملتا هے ۔ اس کے مقابله میں مرزا کی غزل

صرف ندرت خیال اور دقیقہ سنجی کی بہترین مثال کے طور پر پیش کی گئی ہے ۔ اب دوسری غزل ملاحظہ ہو :

کس نہ نمود جرعهٔ کز جگرم گزک نخواست (نظیری)
بے نمکی نہ گفت کس کزسخنم نمک نخواست

هر چه فلک نخواست ست هیچکس از فلک نخواست
(غالب) ظرف فقیه می نجست بادۂ ما گزک نخواست

رنگ رخ سخن نشان میدهداز عیار مرد (نظیری)
صاحب فهم خورده بین ناسره را محک نخواست

جاه ز علم بیخبر علم زجاه بے نیاز
(غالب) هم محک تو زر ندید هم زر من محک نخواست

گفت و شیند دوستاں مایهٔ عین می شود (۱) (نظیری)
آنکه شمرده زد نفس همدمئی ملک نخواست

زاهد و ورزش سجود آه ز دعوئی وجود
(غالب) تا نه زد اهرمن رهش بدرقهٔ ملک نخواست

من همه عجزو همکناں میل نزاع می کنند (نظیری)
هر که حریر باف شد عاقل از وخسک نخواست

بحث و جدل بجائے ماں میکده جوئے کاندران
(غالب) کس نفس از جمل نه زد کس سخن از فدک نخواست

عالم ویک مسیح دم دیر مغاں ویک صنم (نظیری)
هر چه نخواست رائےمن اختر نه فلک نخواست

گشته در انتظار پوردیدهٔ پیر ره سفید
(غالب) در ره شوق همرهی دیده ز مردمک نخواست

مصرع نظم بیغلط صفحه نثرے فقط (نظیری)
نسخهٔ نظم و نثر من نقطه سهو وشک نخواست

رند هزار شیوه را طاعت حق گراں نبود
(غالب) لیک صنم به سجده در ناصیه مشترک نخواست

---

(۱) ف — عیش فی بود

ان غزلوں کا موازنہ مرزا ھی کو خیال ، اسلوب سخن اور طرز ادا میں نظیری سے بہت بلند بتاتا ھے ۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ھے کہ جہاں بھی مضمون آفرینی، دقیقہ سنجی اور ندرت خیال کی منزل آ جائے مرزا بڑے سے بڑے استادان فن کے دوش بدوش کھڑے ہو جانے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے ۔ آئیے اب ایک اور ہم طرح غزل کا موازنہ کر لیا جائے :

ما حال خویش بے سروبے پانوشته ایم
روز فراق راشب یلدا نوشته ایم
قاصد بهوش باش که بر یک جواب تلخ
عرض هزار گونه تمنا نوشته ایم
روئے نکو معالجهٔ عمر کو ته است
این نسخه از علاج مسیحا نوشته ایم
هر گه که کرده ایم روان کشتی امید
طوفان باد و شور به دریا نوشته ایم
تحقیق حال ما ز نگه می توان نمود
حرفے زحال خویش بسیما نوشته ایم

(نظیری)

تافصلے از حقیقت اشیا نوشته ایم
آفاق را مرادف عنقا نوشته ایم
عنوان را ز نامه اندوه ساده بود
سطر شکست رنگ بسیما نوشته ایم
درهیچ نسخه معنی لفظ امید نسیت
فرهنگ نامه هائے تمنا نوشته ایم
آغشته ایم هر سر خارے بخون دل
قانون باغبانیٔ صحرا نوشته ایم
کویت زنقش جبهه مایک قلم پرست
لختے سپاس همدمی پا نوشته ایم

(غالب)

ان اشعار سے بھی یہی پتہ چلتا ھے کہ مرزا کا پلہ اگر اونچا نہیں تو نظیری سے ہلکا بھی نہیں ھے ۔ ایک مختصر مضمون میں اتنی گنجائش کہاں کہ اساتذہ کے کلام کا دل کھول کے موازنہ کیا جا سکے ۔ تاہم ارباب ذوق کی تسلئی جستجو کے لئے اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ مرزا اور نظیری کے موازنہ کے لئے ''مکتبہا، مشربہا ''بلا خفتست کجا خفتست، ''عربسیت بے ادبیست ۔،، ''کام ندارد انجام ندارد۔،، ''بیشتر گیرد زود تر گیرد،، ''چا کش نگر پا کش نگر ''امتحاں بر خیز مغاں بر خیز،، باز کردن دراز کردن ،، سخن خواهد شدن برهمن خواهد شدن،، کے ردیف و قوافی والی اور اسی قبیل کی دوسری ہم طرح غزلوں کا مطالعہ ادبی شعور کی

تشنگی دور کرنے کے لئے کافی ہوگا اور اگر عرفی، ظہوری، نظیری، بیدل اور غالب کے ایسے باکمال اساتذہ کو ایک ہی صف میں دیکھنا مقصود ہو تو باتش ست مدار آتش ست''خرد مندست بندست،، ''بسمل افتاد ست، قاتل افتادست،، ''وضو کنند، سبو کنند،، تاب شستہ ایم، آب شستہ ایم،، کے ردیف و قوافی والی معرکتہ آلارا غزلیات میں تلاش کر لیجئے - ایسے موازنہ کے بعد مرزا کے اصلی خدو خال واضح ہو جائیں گے اور ہم یہ کہنے میں بجا طور سے فخر حاصل کر سکیں گے کہ ہم اپنے صرف ایک ہندوستانی شاعر کو بڑے بڑے ایرانی اساتذہ کے مقابلہ میں پیش کر سکتے ہیں جو ان سب کا فرداً فرداً اور اجتماعی طور سے بھی شاعری کے جملہ محاسن میں پوری طرح مد مقابل بن سکتا ہے -

آئیے اب ذرا مرزا غالب کی انفرادیت کا بھی جائزہ لیا جائے - مرزا کے سوچنے کا طریقہ اور اپنے مخصوص انداز بیان میں پیش کرنے کا سلیقہ بھی ان کی آپ مثال ہے- ان کےاردو اشعار زبان زدخلائق ہیں- لیکن فارسی میں بھی اچھے اشعار کی کمی نہیں ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ فارسی میں بہتات ہے - انھیں میں سے کچھ اشعار بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں - ان میں وہ اشعار جن کا رشک کے خاص موضوع سے تعلق ہے خاص توجہہ چاہتے ہیں- کیونکہ ''رشک،، مرزا کا خاص موضوع تھا - اردو میں بھی اس موضوع پر ان کے اشعار اپنا جواب نہیں رکھتے - فارسی میں زور قلم اور بھی زیادہ بڑھ گیا ہے -

جان غالب تاب گفتاری گماں داری هنوز
سخت بیدردے کہ می پرسی ز ما احوال ما

خارها از اثر گرمی رفتارم سوخت منتے بر قدم راه روالست مرا

سخن کوته مراهم دل به تقوی مائل است اما
ز لنگ زاهد افتادم بکافر ماجرائیها

چون به قاصد بسپرم پیغام را رشک نگزارد که گویم نام را

وداع و وصل جداگانه لذتے دارد هزار بار برو صد هزار بار بیا

خرسندی غالب نبود زیں همه گفتن یکبار بفرمائے که اے هیچکس ما

چناں گرم است بزم از جلوهٔ ساقی که پنداری
گداز جوهر نظاره در جام ست مینا را

بخلوت مژده نزدیکیٔ یارست پهلو را
فریب امتحان پاکبازی داده ام او را
چو بنشیند به محفل بگزرانم دردل تنگش
کم رنجد غیر از و چوں بے سبب درهم کشد او را

باده اگر بود حرام بزله خلاف شرع نیست دل‌نه تهی به خوب‌ما طعنه مزن‌بزشت‌ما

فرصت از کف مده و وقت غنیمت پندار نیست گر صبح بهاری شب ماهے دریاب

از هر بن موچشمهٔ خوں باز کشادم آرائش بستر ز شفق می کنم امشب

برتنک مایگیم رحم که یک عمر گناه هم بتاراج سبکدستی بخشودن رفت

آمد و از ره غرور بوسه بخلوتم نداد رفت و درانجمن زغیر فرد نوا گری گرفت

جاده شناس کوئے خصم بودم و دوست‌راه جوے
منکر ذوق همرهی خرده برهبری گرفت

نظر فروز اداها به دشمن ارزانی به من سپار اگر داغ سینه تابے هست

رشک آیدم بروشنیٔ دیدہ ھائے خلق دانستہ ام کہ از اثر گرد راہ کیست

بامن بخواب نازو من از رشک بدگماں تا عرصہ خیال عدو جلوہ گاہ کیست

تلخ ست تلخ رشک تمنائے خویشتن شادم کہ دل ز وصل تو نومید بودہ است

بے پردہ شو ز غصہ و الزام دہ مرا
گفتم کہ گل خوش ست بہ گلشن دریں چہ بحث

ھائے این پنجہ کہ باجیب کشا کش دارد
بود با دامن پاکت چہ قدرھا گستاخ

شباب و زھد چہ ناقدردانی ھستیت بلا بجان جوانان پارسا ریزد

می رمی ازمن و خلقے بگمانیست زتو بیمحابا شو وبنشیں کہ گماں برخیزد

چہ عیش از وعدہ چوں باور زعنوانم نمی آید
بنوعے گفت می آیم کہ می دانم نمی آید

خیزو در ماتم ماسرمہ فرو شوی زچشم وقت مشاطگی حسن خدا داد آمد

پیمانہ براں رند حرام ست کہ غالب در بیخودی اندازۂ گفتار نداند

ھست تفاوت بسے ھم زرطلب تابنیذ لذت دیگر دھد بوسہ چو دشنام شد

مے بہ زھاد مکن عرض کہ ایں جوھر ناب
پیش ایں قوم بۂ شورابۂ زمزم نرسد

بوسم لب دلدار گزیدن نتوانم نرم ست دلم حوصلۂ کام ندارد

اندران روز که پرسش رود از هر چه گزشت
کاش باما سخن از حسرت ما نیز کنند

بخشمم نا سزا می گوید و از لطف گفتارش
گمان دارم که حرف دل نشینے بعد ازیں گوید

بدیں قدر که بے ترکنی و من بمکم تراز باده نوشیں چه مایه کم گردد

نخوت نگر که می خلد اندر دلش ز رشک
حرفے که در پرستش معبود می رود

زرشکست اینکه درعشق آرزوے مردنم باشد
تو جان عالمے حیفست گر جان درتنم باشد

کمم دردے زرشکست اینکه غمخواری نمیخواهم
که ترسم یابد او راهر که از حالم خبر گیرد

بیروں میاز خانه به هنگام نیمروز رشک آمدم که سایه بپا بوس می رود

چو ره بقصد نشان بر کماں بجنباند تپد ز رشک دلم تانشاں بجنباند

خارها در ره سودا زدگاں خواهد ریخت ورنه درکوه و بیا باں بچه کارست بهار

جاں می دهم از رشک به شمیشرچه حاجت
سر پنجه بدامن زن و دامن به کمربر

از ذوق میاں تو شدن سر بسر آغوش بیمهرفن ماست بزنار میا موز

رحمے ازمعشوق هرجا در کتابے بنگری
برکنار آن ورق جا نها فدایش می نویس

نیست معبودش حریف تاب ناز آوردنش

پیش آتش دیده ام روزے نیاز آوردنش

تا خود از بهر نثار کیست می میرم زرشک

خضر و چندیں کوشش و عمر دراز آوردنش

سعی در مرگ رقیباں گراں جاں کردی

می شناسم که چه از ناز و ادا گشت تلف

رنگ و بو بود ترا برگ و نوا بود مرا

رنگ و بو گشت کهن برگ و نوا گشت تلف

ریزم از وصف رخت گل راشرردر پیرهن آتش رشکم بجان تو بهار افتاده ام

چه پرسی کزبست وقت قدح نوشی چه میخواهم

همیں بوسیدنی چوں مست تو گردی مکیدن هم

خوے سرکشم داری عجز رشک نپسدم سینهٔ من از گرمی تابهٔ سمندر کن

جنون رشک را نازم که چون قاصد رواں گرد

دوم بیخویش و گیرم نامه اندر راه ازوے

رشک نبود گر خدنگت جانب دشمن گرفت

دردم سا طور پنهان ست زخم کا رئیے

دلم میجوئی و از رشک می میرم که در مستی

چرا زاں گوشهٔ ابرو اشارت کامیابستے

جیسا کہ کہا گیا ہے کہ مرزا ایرانی نہ تھے، فارسی ان کی مادری زبان نہ تھی۔ انھیں شیراز و اصفہان جانے کا موقع نہیں ملا تھا، لیکن ان کا یہ دعوی بھی غلط نہیں تھا کہ مبداء فیاض نے انھیں فارسی کا ذوق ازل میں بخشا تھا کیونکہ اس کے بغیر زبان و بیان کی لطافتوں کی ان منزلوں سے گزرنا آسان نہ تھا جن سے غالب گزرنے میں کامیاب ہوئے۔ ذوق کے اختلاف اور انداز نظر کے فرق کی وجہ سے ان کا مقابلہ شاید خالص ایرانی غزل گویوں مثلاً سعدی، حافظ، خواجہ کرمانی، عراقی، جامی، وغیرہ سے نہ کیا جا سکے لیکن ہندوستان کے اہم ترین فارسی شعراً مثلاً خسرو، ظہوری، نظیری، عرفی، اور بیدل کے ساتھ ان کا نام نہ لینا نا ممکن ہے۔ یہی ان کی عظمت کی دلیل ہے۔